معمارانِ پاکستان

منشی عبدالرحمن خاں

شیخ اکیڈمی بل روڈ لاہور

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جمؔ و کے

معمارانِ پاکستان

جن کے فکری اور عملی کاوشوں سے
پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے

از

منشی عبدالرحمٰن خان

شائع کردہ

شیخ اکیڈمی۔ بل روڈ۔ لاہور

بار اوّل ———— نومبر ۱۹۷۶ء
طابع ———— محمد طارق
مطبع ———— رعنا آرٹ پریس لاہور
ناشر ———— شیخ اکیڈمی۔ ۶ مُبل روڈ۔ لاہور
قیمت ———— ۳۰ روپے

انتساب

پیکرِ خلوص و ایثار

جناب محمد منصور الزمان صاحب
صدر جمعیت دہلی۔ صدیقی برادری
(پاکستان) کراچی کے نام

منشی عبدالرحمٰن خان

رفتارِ تحاریک

ادوارِ محرّکین

بہ ترتیب سالِ پیدائش

تفصیل

(حصہ اوّل)

نظریۂ پاکستان کا ارتقاء

(حصہ دوم)

معمارانِ پاکستان

(١)

شاہ ولی اللّٰہ محدث دہلویؒ

(۲)
شاہ اسماعیل شہیدؒ

(۳)
سیّد احمد شہید بریلویؒ

(۷)

مولانا اشرف علی تھانویؒ

(۸)

مولانا ظفر علی خان

(۱۱)

قائدِ اعظم محمد علی جناح رح

(۱۲)
سر آغا خان

(۱۳)
ڈاکٹر علامہ اقبالؒ

(۱۴)
علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

(۱۵)

چوہدری رحمت علی

(۱۶)

نواب بہادر یار جنگ

جائزہ

(از جناب ڈاکٹر اسد اریب صاحب ۔ اوپن یونیورسٹی ۔ اسلام آباد)

کسی عہد کی تاریخ لکھنا، اور پوری دیانت داری کے ساتھ واقعات کا تجزیہ کرنا، بے بصیرت لوگوں کا منصب نہیں ۔ یہ عظیم الشان کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فکر و نظر کی وسعت کے حامل ہوں، اور جو بغیر تعصّب اور ترحّم کے افراد کی سیرت نگاری کا عمل سرانجام دے سکیں ۔

ہمارے قریب تر زمانے میں جو سیاسی، تہذیبی اور نظریاتی تبدیلیاں، برِعظیم میں رونما ہوئیں، برہمنی سامراج پر قائدِاعظم محمد علی جناح کے تدبّر کو جو فتح حاصل ہوئی ۔ جسکے نتیجے میں " پاکستان " اسلامیان ہند کی جدوجہد کا ثمر ثابت ہوا اور جو لاکھوں انسان، آزادی کی راہ میں قربان ہوئے ۔ یہ سب وہ واقعات تھے، جو ایک دم ظہور میں نہیں آئے، برسوں پہلے ان کی بنا قائم ہوئی ۔

تاریخ کے ان واقعات کو کسی خاص مقصد سے متعین کرنا اور سلسلۂ تاریخ کی ان تمام کڑیوں کو جوڑ کر کسی نصب العین کی نشان دہی کرنا، اِس دَور کے صاحبِ نظر، اور مختار قلم افراد کا سب سے اہم فریضہ تھا ۔ لیکن یہ جتنا اہم تھا، اتنا ہی مشکل بھی تھا ۔ "معمارانِ پاکستان" کے فاضل مورّخ نے، اس اہم فرض کو کسی قدر سرانجام دیا ہے، اس کتاب میں انہوں نے ایسے تمام افراد اور ایسی تمام تحریکوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جن افراد کی شعوری اور غیر شعوری کاوشوں سے پاکستان وجود میں آیا، اور جن تحریکوں نے تشکیل پاکستان کی راہ ہموار کی ۔ " معمارانِ پاکستان " کے سلسلۂ مضامین کی کئی قسطیں اخبار " نوائے وقت " لاہور میں بھی چھپ چکی ہیں، مَیں نہایت توجّہ اور جذبۂ طلب سے ان تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں ۔ اب میرے بزرگ دوست، مُنشی ملتان

منشی عبدالرحمٰن خان صاحب نے اپنا مسوّدہ از رہِ محبت میرے حوالے کیا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ تعمیرِ پاکستان کے اسباب و عِلَل کی یہ ایک نئی کہانی ہے، پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے جتنے فکری اور نظری پہلو اب تک مطالعے اور حوالے میں آئے تھے، ان تمام پہلوؤں سے بالکل مختلف پہلو، اس مسوّدہ مضامین سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی شخص کی کہی ہوئی تمام باتیں، حرف بہ حرف سچی نہیں ہوتیں۔ لکھنے والے کا مزاج، پس منظر اور مقاصد بھی بروئے کار آسکتے ہیں، میں یہاں مثالاً عرض کروں گا کہ فاضل مصنف نے، سلطان محمد غوری کی ہندوستان میں آمد، حکومت اور بادشاہت کو، قیامِ پاکستان کی بنا اوّل ثابت کر کے، اس کے شوق جہاں بانی کو تحریکِ ملی سے تعبیر کیا ہے، یہ امر اپنے مقام پر اختلافی ہے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا، یہ ضروری نہیں کہ مصنّف، ہمارے تجزیوں اور تبصروں کو اپنا تجزیہ و تبصرہ قرار دے۔ تاہم ایک بات یقینی ہے کہ مورّخ کو، تاریخ نویسی کا فرض غیر الحاقی طور پر ادا کرنا چاہیئے۔ [1]

ل [1] فاضل تبصرہ نگار کو اس معاملہ میں مغالطہ ہوا۔ "سلطان محمد غوری کی ہندوستان میں آمد، حکومت اور بادشاہت کو تحریکِ ملی سے تعبیر" نہیں کیا گیا۔ بلکہ تاریخی شواہد کی روشنی میں اسکی "تجویزِ تقسیمِ ہند" اسلئے پیش کی گئی ہے۔ کہ اس نے سب سے پہلے ۱۱۹۲ء میں ہندوؤں کے سامنے تقسیمِ ہند کی تجویز رکھی تھی۔ جو اس وقت انہوں نے نامنظور کر دی۔ لیکن وہی تجویز، قائدِ اعظم نے محض آئینی طریق سے ۱۹۴۷ء میں انگریزوں اور ہندوؤں سے منوالی۔ جس کے نتیجہ میں ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ اس تجویز تقسیمِ ہند کو اگر میں محض اسلئے نظرانداز کرتا کہ وہ جہانبانی کے ایک شوقین نے پیش کی ہے۔ تو یہ ایک بہت بڑی تاریخی بے انصافی ہوتی۔ کیونکہ یہ کوئی "غیر الحاقی" امر نہ تھا۔ بلکہ تحریک پاکستان کی بنیاد ہی تمام تر تقسیمِ ہند کے مطالبہ پر رکھی گئی تھی۔ (مؤلف)

پاکستان کی تشکیل، واقعی صدیوں پرانے سلسلۂ فکر کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلۂ فکر کو شاہانِ حکومت نے نہیں، صوفیار، اہل اللہ علمار اور مصلحین قومی نے آگے بڑھایا ہے۔ منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب، ہماری جدید تاریخ، اور تشکیل پاکستان کے شاہدِ عینی ہیں، ان کی باتیں سُنی سنائی سے زیادہ سرگذشتیں اور آپ بیتیاں ہیں۔ وہ علمائے ہند کے معتمد اور تحریک آزادی کی فوج کے سپاہی بھی ہیں، انہوں نے گذشتہ پچیس[۲۵] تیس[۳۰] برس سے، ملّی تقاضوں کی تکمیل میں نمایاں جدوجہد کی ہے۔ یہ مضامین منشی صاحب کے جستہ جستہ خیالات ہیں۔ منطقی طور پر انہیں تحریک پاکستان سے مربوط بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن میں اس کتاب کی ایک اور اہمیت محسوس کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ منشی صاحب نے ہماری تاریخ کی بعض شخصیتوں کے فکری رجحانات پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ ان میں سے بیشتر شخصیتوں کے جسمانی خط و خال کے ساتھ ساتھ ان کے خطوطِ فکر کو بھی اُبھارا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، ظفر علی خاں، مولانا الطاف حسین حالی، اور نواب بہادر یار جنگ کی قدآور شخصیتوں کے نئے روپ سامنے آئے ہیں۔

اس کتاب کے زیرِ بحث اکابر، یقیناً ہماری سیاسی علمی اور قومی تاریخ کے فعال کارکن رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہماری فکری رہنمائی کے ساتھ ساتھ، اپنے کردار کو عملاً بھی پیش کیا ہے۔ منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب کا خیال یہ ہے۔ کہ زیرِ بحث شخصیات کے سیاسی اور فکری تدبر نے تعمیر پاکستان کی راہ ہموار کی۔ اگر یہ افراد سامنے نہ آتے اور یہ تحریکیں جنم نہ لیتیں تو ہماری آزادی کا قافلہ اس تیزی کے ساتھ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکتا، مَیں نے منشی صاحب کے استدلال کو بغور دیکھا، ان کے نتائج پر بھی نظر کی۔ مَیں بایں صورت متفق بھی ہوا۔ لیکن اِن فکری مباحث میں، اکبر الہ آبادی کو نہ پاکر متردد بھی ہوا۔ میرے خیال میں اکبر حالی سے کہیں زیادہ ملّی شعور رکھتے تھے، اکبر کا اپنا ایک الگ سیاسی فلسفہ تھا۔ اسی سیاسی فلسفے کی سپر سے انہوں نے سرسید

کے تجدّد کا مقابلہ کیا، ان کی شاعری زندگی کے نئے تناظر میں، نظریہ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے حالی کو بھی متاثر کیا اور اقبال کو بھی، اکبر کی اس انفرادیت کو نظرانداز کر دینا، اور انہیں برِعظیم کے مسلمانوں کی فکری رہنمائی کرنے والے مدبّروں کی صف سے الگ رکھنا، منشی عبدالرحمٰن خان جیسے صاحبِ بصیرت افراد کا ارادی فعل نہیں ہو سکتا۔ یہ فقط سہو[1] ہے۔ اور اس سہو کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

"مجاہدین پاکستان" صرف مضامین ہی نہیں۔ تاریخ و تہذیب کا تسلسل بھی ہیں۔ اس تسلسل کو باقی رکھنا، قومی فریضہ ہے۔ اس فرض سے غفلت، نسلوں کو نسلوں سے منقطع کر دیتی ہے۔ تاریخ ایک ایسا ماضی ہے، جس کو حال سے علیحدہ کرنا، تاریخ کے ارتقاء کو روک دینا ہے۔ مجاہدینِ پاکستان واقعات کی تاریخ نہیں۔ افکار و نظریات کی تاریخ ہے۔ ایسی تاریخیں جو فکر و نظر کی اساس سے وابستہ ہوں، زندہ قوموں کا عزیز ترین سرمایہ ہوتی ہیں۔ احساساتِ قومی اور نظریاتِ ملّی کا تحفّظ کیئے بغیر کوئی قوم زیادہ دیر تک جی نہیں سکتی۔ پاکستان ایک واضح نصب العین کی بنا پر ظہور میں آیا تھا۔ اس نصب العین کی حفاظت صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب شعورِ قومی کا باضابطہ تحفّظ کیا جائے۔ تاریخ نصابِ تعلیم میں اختیاری مضمون کے طور پر داخل ہو کر اس فرض کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ یہ معاملہ جبر و اختیار کا نہیں۔ نئی نسل کو تاریخ و تہذیب سے روشناس کرانے کے لئے تعلیم و تدریس کے ان جدید فلسفوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ جن کے ذریعے وسیع تر مقاصد کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اور ذہن بنائے جاتے ہیں۔ اس

---

[1] اکبر اللہ آبادی کے ملّی شعور، سیاسی فلسفے، نظریہ حیات اور اسکی انفرادیت سے انکار نہیں۔ چونکہ وہ تحریکِ پاکستان کی صفِ اول کے محرکین اور مجاہدین میں نظر نہیں آئے۔ اسی لئے انکا ذکرِ خیر یہاں نہیں آسکا۔ انکا ذکر ان مجاہدین کے زمرہ میں آئیگا۔ جنہوں نے مغربی تہذیب کے خلاف جہاد کیا۔ (مؤلف)

وقت عالمی سیاست کی رفتار کچھ ناموافق اور ہماری مخالف ہے۔ ہمارے تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستان کے اسلامی تشخص کو قائم رکھیں اور اس تشخص کی تاریخ کو لکھیں اور یہی وہ حربہ ہے۔ جس سے مختلف قومیتوں، علاقائی تقاضوں اور نسلی عصبیت کے بتوں کو توڑا جاسکتا ہے۔ گویا پاکستان کے اسلامی تشخص کی تاریخ لکھنا بت شکنی کا فرض سرانجام دینا ہے۔ بلاشبہ یہ فرض، فرضِ کفایہ ہے۔ سب کے لئے اس کی ادائیگی ضروری نہیں۔ لیکن جن پر فرض ہے، انہیں ترک بھی لازم نہیں آتا۔ جو لوگ اپنے قلم کی طاقت، اپنے وسائل کی معرفت اور اپنے علم کی رسائی کو بے جواز ضائع کردیں، وہ غفلت شعاری کے مرتکب ہیں۔ اور قومی فرائض سے غفلت، آئینِ اخلاق کی رُو سے ناقابلِ معافی جرم ہے۔ منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب اپنے وسائل کی کمی، اپنی پیرانہ سالی اور ہمہ وقت مصروفیتوں کے باوجود اس عظیم قومی مقصد کی تکمیل میں ہمہ تن مشغول ہیں۔ منشی صاحب نے اپنی یافت، اپنے وقت اور اپنے وسائل کا ایک بڑا حصہ، علمی اور تہذیبی مقاصد کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ وہ اچھے انسانوں کی قحط سالی کے اس زمانے میں جب انبیا و رسل کی آمد کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ ولایتیں بھی "بظاہر" معدوم ہیں۔ قابلِ تقلید شخصیت ہیں۔ جن کا قلم کبھی قرار نہیں پکڑتا۔ (قلم کا قرار تو قلم کی موت ہے) ان کے قلم سے اب تک سینکڑوں تحریریں نکل چکی ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ برسوں سے اس خطّے میں تہذیب اور مذہب کی ترویج کر رہا ہے۔ منشی صاحب کی تحریروں کا مقصد، قومی نصب العین کا تحفظ اور اخلاقی تعلیمات کی ترویج کر رہا ہے۔ "معمارانِ پاکستان" بھی اُن کے اسی مصلحانہ رویّے کا مظہر ہے۔ نئی نسل کو جو تہذیب جدید اور اقتصادِ حاضر کی زولیدگی کا شکار ہے اور جس کے ذہن کو افکار کے تصادم سے مجروح کیا جا رہا ہے۔ ایسی کتابوں کی شدید ضرورت

ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ایسی کتابوں کو صرف تصنیف نہیں ہونا چاہیئے۔ انہیں ایک تحریک بھی بننا چاہیئے۔ اس اعتبار سے مُنشی صاحب کی ذات میری امید کا چراغ ہے۔ وہ جسم و جسمانیت کے لحاظ سے فرد ہی سہی۔ لیکن اپنے افکار کی رو سے ایک انجمنِ خیال ہیں۔ ایسی انجمن خیال، جو جمال الدین افغانی اور اقبالؔ کے تصورات سے ابھرتی ہے۔

ڈاکٹر اسد اریب۔
پیپلز اوپن یونیورسٹی۔ اسلام آباد۔
۶/۶/۷۶

تعمیرِ پاکستان

تاریخ ہند اس بات کی شاہد عدل ہے کہ ہندوستان ماضیٔ بعید میں کبھی متحد نہیں رہا ۔ یہ کئی راجدھانیوں اور حکمرانیوں میں بٹا ہوا تھا ۔ اس پر شروع سے غیر ملکی حکمران تھے ۔ یہ شمال سے آئے ۔ انہوں نے ہندوستان کے اصل باشندوں کو جنوب کی طرف بھگا دیا اور خود سرزمین ہند پر قابض ہو کر ہندو کہلائے ۔ انہوں نے اپنے جبر و تشدد سے ہندوستان کے اصل باشندوں کا نام و نشان تک مٹا دیا ۔ خود ہندوستان کے مالک بن بیٹھے اور انسانوں کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ۔

ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی باہر سے آئے ۔ مگر وہ سرزمین کے لئے فرشتۂ رحمت بن کر آئے ۔ انہوں نے آتے ہی ۔ محبت ۔ مروت ۔ مساوات اور عدل و انصاف کی بساط بچھائی ۔ جس سے متاثر ہو کر محرومِ انسانیت ہندو جوق در جوق دامنِ اسلام میں پناہ لینے لگے ۔ اور ہندوستان میں اسلام کا ڈنکا بجنے لگا ۔ جو ہندو برداشت نہ کر سکے ۔ کیونکہ :-

۱۔ ہندو بت پرست تھے اور مسلمان بُت شکن تھے ۔

۲۔ ہندو گائے کو اپنا معبود سمجھ کر اسکی پرستش کرتے تھے ۔ اور مسلمان اسے کاٹ کر کھا جاتے تھے ۔

۳۔ ہندو اچھوتوں کو دائرۂ انسانیت سے خارج سمجھتے تھے ۔ اور مسلمان انہیں دائرۂ اسلام میں آنے کے بعد سینے سے لگا لیتے تھے ۔

اسلئے ہندوستان میں ہندو مسلم مناقشات و فسادات اور محاربات ہوتے رہتے تھے ۔ جن کے انسداد یا روک تھام کے لئے سب سے پہلے سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوؤں کے سامنے ۱۱۹۲ء میں یہ تجویز رکھی کہ ہندوستان کو ہندو

ہندوستان اور مسلمان ہندوستان میں تقسیم کرلیا جائے۔ گو ہندوؤں نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ لیکن اس مردِ مجاہد کے منہ سے نکلی ہوئی یہ آواز رائیگاں نہ گئی۔ وہ فضائے ہند میں برابر گونجتی رہی۔ حالات بدلتے اور بگڑتے گئے۔ اور ہندو موقعہ بہ موقعہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرتے چلے گئے۔ ساڑھے پانچ سو سال بیت گئے۔ کسی نے اس آواز پر کان نہ دھرا۔ بالآخر ۱۷۵۷ء میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے روز افزوں استبداد و استحصال سے نجات دلانے اور خوابِ غفلت سے جگانے کی مہم شروع کی۔ ان کی حرکت سے کچھ ایسی برکت پیدا ہوئی کہ تقسیم ہند کی گاڑی چل نکلی۔ اس گاڑی کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں مسلم کشی کے واقعات اور ہندو اکثریت کی بربریت و سفاکیت نے ایندھن کا کام کیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، ہندوؤں اور سکھوں کی چیرہ دستیاں بڑھتی گئیں۔ تقسیم ہند کے منصوبہ کی ضرورت اور اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر دور میں احیاء اسلام کی تحریکیں نئے نئے روپ میں سامنے آتی رہیں اور اکابرین اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اس گاڑی کو آگے دھکیلتے رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:-

"۱۹۴۷ء میں قائدِ اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں جو اسلامی مملکت ظہور میں آئی۔ وہ محض کسی وقتی حادثے یا ہنگامی صورتِ حال کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ اس ڈیڑھ سو سالہ جدوجہد کا نقطۂ اختتام یا آخری منزل تھی جس نے مسلمانانِ ہند کی مساعیِ بازیافت کو بار آور کیا۔ بازیافت کی اس جدوجہد کی شکلیں بدلتی رہیں۔ لیکن یہ جدوجہد مسلسل جاری رہی۔ جس میں ۱۹۳۰ء تک علماءِ ہند نے مؤثر کردار ادا کیا۔"

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی تکمیل مسلم لیگ نے کی۔ لیکن اس میں جنود اللہ کی تحریک کے علاوہ تحریکِ خلافت۔ تحریکِ احرار اور

تحریک خاکسار کا بھی ان معنوں میں بڑا حصہ ہے کہ بازیافت کے مقصد عظیم کے لئے ان سب جماعتوں نے اپنے اپنے وقت میں بازیابی کی آرزو کو زندہ رکھا۔ اور اسکے لئے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں۔ اگر قربانی کی یہ روایت پہلے سے موجود نہ ہوتی تو تحریک پاکستان تک پہنچتے پہنچتے ولولے سرد ہو چکے ہوتے"۔ (خدام الدین ۷، مئی ۱۹۷۶ء)

ہندوستان کو دارالاسلام بنانے اور اس میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کیلئے سب سے پہلے علماء حق نے مختلف النوع تحریکیں چلائیں اور ۱۷۵۷ء سے ۱۹۳۰ء تک اپنے اپنے دَور کے تقاضوں کے تحت مصروف جدوجہد رہے۔ اور ناقابلِ برداشت آلام و مصائب کا شکار رہے۔ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے والی دوسری تحریکوں کا ۱۹۳۰ء سے آغاز ہوا اور ۱۹۴۷ء میں یہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔

نظریۂ پاکستان کے تقاضوں کے تحت ہر دور کے مشاہیر نے جتنی بھی تحریکیں چلائیں۔ ان کی نوعیت اگرچہ الگ الگ تھی۔ راہِ عمل جدا جدا تھی۔ مگر مقصود سب کا ایک تھا یعنی اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی برتری! ان اکابرین کے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہ تھا۔ ان کے پیشِ نظر کوئی ذاتی غرض نہ تھی۔ یہ بے نفس و بے غرض قائدین عصری تقاضوں کے تحت مسلمانوں میں فکرِ وعمل کی روح پھونکتے رہے۔ اسلامی شعور اور جذبۂ آزادی پیدا کرتے رہے۔ تب جاکر ان کی مساعی جمیلہ سے نظریۂ پاکستان پروان چڑھا اور پاکستان کا تاج محل تیار ہوا۔

معمارانِ پاکستان کی فہرست تو طویل ہے۔ مگر ہم نے صرف ان حضرات کو منتخب کیا ہے۔ جو اپنے فکر و عمل سے نظریہ پاکستان کا چہرہ آگے بڑھاتے رہے۔ شریعتِ حقہ، کی ترویج اور نظام اسلام کے قیام کیلئے لوگوں کے دلوں میں جذبۂ آزادی پیدا کرتے رہے۔ اپنی مساعی جمیلہ سے اس آگ کو سینہ بہ سینہ اور نسل بہ نسل سلگاتے اور

بھڑکاتے رہے۔ تعمیرِ پاکستان کیلئے بنیادیں کھودتے رہے اور زمین ہموار کرتے رہے۔ یہ حضرات نہ صاحبِ ریاست تھے۔ نہ صاحبِ وجاہت۔ انکے پاس نہ کوئی امارت تھی۔ نہ کوئی طاقت یہ نہ صاحبِ اقتدار تھے۔ نہ صاحب اختیار۔ انکا مقصدِ حیات صرف اتنا تھا کہ کسی طرح قوم کی گمشدہ عزت وعظمت واپس مل جائے۔ اور پھر سے ملک آزاد ہو جائے تاکہ اس میں اسلامی نظام رائج ہو سکے۔ یہ انہی حضرات کی مخلصانہ مساعی کا ثمر تھا کہ دنیا کے نقشہ پر، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ابھر آئی۔

اس کتاب کے پہلے حصہ میں ان حضرات کے نظریۂ پاکستان کے متعلق آراء وافکار "نظریۂ پاکستان کا ارتقاء" کے زیرِ عنوان پیش کئے گئے ہیں۔ تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس پر کب سے کام ہو رہا تھا۔ اس کے دوسرے حصہ میں۔ ان معمارانِ پاکستان کا وہ پاکیزہ۔ قابلِ رشک اور قابلِ تقلید کردار پیش کیا گیا ہے۔ جو "تعمیرِ پاکستان" میں ممد و معاون ثابت ہوا اور جسے پاکستان کی بقا کیلئے اپنانے کی اشد ضرورت ہے۔ اور جسے دیکھنے کیلئے ۲۹ سال سے آنکھیں ترس رہی ہیں۔

پاکستان پاکیزہ سیرت وکردار کی پیداوار ہے اور اسکے تحفظ وبقا کے لئے بھی اس کی نسبت سے ویسی ہی پاکیزہ سیرت وکردار کی ضرورت ہے۔ جس کا نمونہ معمارانِ پاکستان نے اپنی زندگیوں میں قوم کے سامنے پیش کیا۔

امید ہے یہ حقیر سی کوشش وکاوش اس سلسلہ میں ضرور ممد و معاون ثابت ہوگی۔ اور انشاء اللہ چراغ راہ کا کام دے گی۔

پھلیک۔ ملتان
۱۴۔ اگست ۱۹۷۶ء۔

احقر العباد
منشی عبدالرحمٰن خان

(حصہ اوّل)

نظریۂ پاکستان کا ارتقاء

آوازِ دوست

شہاب الدین غوری اور قائدِ اعظم کی نظریاتی اور سیاسی یگانگت

تاریخ میں قائدِ اعظم کا مقام متعین کرنے کے لئے ہم نے تاریخ پر نظر دوڑائی ۔ تو کتنی ہی فتوحات اور کتنے ہی فاتح یاد آئے ۔ ہم نے پہلی نظر میں تین واقعات کو منتخب کیا۔ محمود کا سومنات ۔ شہاب الدین کا تھانیسر اور ابدالی کا پانی پت ۔ سومنات سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے ۔ مگر وہ تاریخ کی رومانوی شرح ہو جائے گی ۔ جسے قائدِ اعظم کی حقیقت پسندی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے نظرانداز کر دیا ۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کا مسلم ہند پر خوشگوار اثر پڑا ۔ مگر وہ ناکافی تھا ۔ کیونکہ اس کا جیتنے والا کسی اور طرف نکل گیا ۔ شہاب الدین غوری کے مقصد اور حاصل سے ہم نے قائدِ اعظم کے نظریئے اور مملکت کا موازنہ کیا تو ان دونوں میں بڑی مناسبت اور یگانگت پائی ۔

برِعظیم کے مسلمانوں میں ملّت کے وجود کا احساس اور اسکے اظہار کے لئے ایک ریاست کی اساس رکھنا ۔ بارھویں صدی میں سلطان شہاب الدین غوری اور بیسویں صدی میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کے حصّہ میں آیا ۔ شہاب الدین غوری نے برِعظیم میں مسلمانوں کی جو حکومت قائم کی ۔ وہ خاندانوں اور علاقوں کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ساڑھے چھ سو سال قائم رہی ۔ انگریزوں کے آنے سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا ۔ نئی دنیا میں مسلم ہند کو ایک نئے شہاب الدین غوری کی تلاش تھی ۔ جو ایسی نئی فتوحات کرے ۔ جن کا اثر صدیوں تک محسوس ہو ۔ یہ کام قائدِ اعظم نے کیا ۔ تنِ تنہا اور صرف سات برس میں !

مختار مسعود

تخلیقی مراحل

عنداللہ یا عندالناس جب بھی کوئی ضرورت پیدا ہوئی۔ اسکے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی ہوئی۔ اسکی تعمیر و تکمیل کے مختلف مراحل طے کرنے پڑے اور مختلف ذرائع و وسائل استعمال میں لائے گئے۔ تب جاکر وہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ خود صاحب کن فیکون اور خالقِ ارض و سماء کا تخلیقِ کائنات کا منصوبہ کئی مراحل میں مکمل ہوا۔ دینِ اسلام کی تعلیم و تربیت کے لئے اسے کئی انبیاء بھیجنے پڑے۔ نزولِ قرآن کریم کے لئے جبرائیل علیہ السلام کو کئی چکر کاٹنے پڑے۔ تب مکمل و اکمل شکل میں قرآن کریم سامنے آیا۔ اسی طرح دنیا کی کوئی عمارت ایک دن میں تیار نہیں ہوتی۔ اسکی تعمیر کے لئے کئی معماروں اور مزدوروں کو اپنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ تب وہ پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اسی طرح قوموں کی تقدیر بھی ایک دن میں نہیں بدلا کرتی۔ اسکے بدلنے کے لئے بے غرض اور مخلص رہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسکے لئے عوام و خواص کے اذہان و افکار کی تطہیر اور تیاری کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تب جاکر انقلاب آتا ہے۔ بعینہٖ پاکستان کا تاج محل چند سالوں میں تیار نہیں ہوا۔ بلکہ اسکی تیاری اور تکمیل میں زائد از دو سو سال لگ گئے۔ تب جاکر پاکستان دنیا کے نقشہ میں ابھرا۔ جس کی تاریخ کے اوراق گواہی دے رہے ہیں۔

اساسِ پاکستان

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ تخلیقِ پاکستان کی اساس اسلام تھی علیحدہ قومیّت کا تصوّر وہ بنیادی پتھر تھا۔ جس پر برِعظیم پاک و ہند میں آزادی کی عمارت تعمیر کی گئی۔ انگریز کی سامراجیت اور ہندو کی مسلم دشمنی کے باعث مسلمانانِ ہند کو جن معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی موانعات سے پالا پڑا انہوں نے پاکستان کی ضرورت پیدا کی اور اسکا منشور ؎

پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔

قرار پایا۔ تب مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان، عوامی تحریک بنی اور معمارِ پاکستان حضرت قائدِ اعظم نے بارہا اس امر کی تصدیق کی کہ پاکستان کا مقصد صرف زمین کا ایک ٹکڑا حاصل

کرنا نہیں بلکہ اس میں کتاب وسنت کے مطابق نظامِ اسلام رائج کرکے اسے دنیا کی رہنمائی کے لئے ایک مثالی اسلامی ریاست بنانا ہے۔

لیکن جب ہم اپنے ماضی کی طرف جھانکتے ہیں اور تاریخ کا آئینہ دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جس نظریہ کو اور جس ضرورت کو اب پاکستان کا نام دیا گیا۔ وہ ضرورت بالکل انہی حالات میں اٹھارویں صدی میں نہ صرف پیدا ہوچکی تھی۔ بلکہ اسکے لئے جدوجہد بھی شروع ہوچکی تھی۔ اس امر سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا کہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ اور مسلمانوں کا محبوب دین، اسلام ہے۔ جسکے اوّلین داعی۔ مبلغ اور سیاسی سربراہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ تھے۔ انہی کی بدولت مسلمانانِ عالم میں اسلامی حکومت، مسلمانوں کی سیاسی قیادت وسربلندی اور مسلمانوں کی حاکمیت کا تصور ابھرا۔ اسلام کا بول بالا ہوا۔ دنیا نے اسلامی معاشرت۔ اسلامی اخلاق۔ اسلامی کردار اور اسلامی اقدار کے نمونے دیکھے اور عہدِ اسلام میں ہر طرح کا امن وامان پایا۔ اسکے بعد ہر دَور میں کم وبیش ہر مسلمان کی یہی آرزو اور یہی دعا رہی کہ پھر سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی حکمرانی ہو۔ اسلامی عدل وانصاف کے مظاہرے ہوں۔ ہر شخص امن وامان سے زندگی بسر کرسکے اور آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض ادا کرسکے اور یہی فی الحقیقت تحریک پاکستان کی غرض وغایت تھی۔

ہندو ذہنیت

یہ تصورات وجذبات دوسرے ممالک کے مقابلہ میں زیادہ تر متحدہ ہندوستان میں پائے گئے۔ جہاں صرف اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی بدولت اسلام پھیلا۔ چونکہ مسلمان سلاطین نے اپنے یک ہزار سالہ عہدِ حکومت میں تبلیغ دین یا ترویج دین کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اسلئے یہاں کے مسلمان اقلیت میں رہے اور اکثریت میں نہ آسکے۔ اس اقلیت کی حکمرانی میں جو امن وامان اور عیش وآرام ہندو اکثریت نے پایا۔ اسکا ہندو مورخین کو بھی اعتراف ہے۔ بایںہمہ

ہندو نے ہمیشہ مسلمان کو اجنبی سمجھا۔ جو اسکی آنکھ میں خار کی طرح کھٹکتا رہا۔ انتہائی خاطر و مدارات اور اعزازات و احسانات کے باوجود ہندوؤں کی عقربی ذہنیت نہ بدلی۔ اسے جب بھی موقعہ ملا۔ اس نے مسلمان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے اور اس سے عنانِ اقتدار چھیننے میں گریز نہ کیا۔ جس پر متحدہ ہندوستان کی تاریخ شاہد عدل ہے۔ ہندوؤں کے یہ ناپاک عزائم اور ناپاک ارادے ہر دَور میں تحریک پاکستان میں رنگ بھرتے رہے۔ اسکی ضرورت اہمیت اور افادیت کا احساس و شعور بڑھاتے رہے۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے زمین ہموار کرتے رہے۔ ان کی مسلم دشمنی نے ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ جب تک ہندوستان میں پھر سے اسلامی حکومت قائم نہ ہو۔ پاکستان اور ناپاکستان کو الگ الگ نہ کر دیا جائے۔ ہندوستان میں مسلمان زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکے گا۔

یہ تصوّر آج سے دو سَو سال قبل اس وقت ابھرا جب سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد، ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کے لئے مرہٹوں اور سکھوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ بقول مورّخ اسلام علامہ سیّد سلیمان ندوی ہر کس و ناکس کو اسبات کا یقین ہو گیا کہ :-

"اب مسلمانوں کا یہاں سے چل چلاؤ ہے اور عنقریب بادشاہت پر مرہٹوں کا قبضہ ہونے والا ہے"

اس خطرہ سے ہندوستان میں جن پاکستان گیر تحریکات نے جنم لیا اور جو پاکستان کو قریب سے قریب تر کرتی رہیں۔ ان کی مختصراً تفصیل درج ذیل ہے :-

(۱)

تجویز سلطان محمد غوری

سلطان محمد غوری نے ۱۱۹۱ء میں ترائن کی پہلی لڑائی میں پرتھوی راج کے ہاتھوں

شکست کھانے کے بعد قسم کھائی کہ جب تک وہ اس شکست کا بدلہ نہ لے گا۔ اپنی بیوی کا منہ نہ دیکھے گا اور نہ ہی لباس تبدیل کریگا۔ چنانچہ ایک سال کی تیاری کے بعد اس نے توکلاً علی اللہ ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا۔ جب وہ دوبارہ ترائن کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ تو ہندو راجوں نے سلطان محمد غوری کو لکھا کہ:۔

"ہم ہندو راجاؤں کے لشکر کی اہمیت تو تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے ساتھ جس قدر لشکر ہے۔ وہ تمہیں اور تمہاری فوج کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہے اور ابھی مختلف افواج کی آمد جاری ہے۔ جن کے قدموں سے زمین کا سینہ کانپ رہا ہے۔ اگر تمہیں جان عزیز ہے تو اپنے سپاہیوں کی غربت پر رحم کھاؤ اور واپس چلے جاؤ۔ ورنہ ہماری سپاہ میدانِ جنگ کو میدانِ حشر کا نمونہ بنا دے گی"۔ (فرشتہ)

ہندو راجاؤں کا یہ پیغام وصول کرنے کے بعد سلطان محمد غوری نے سوچا کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں ہندوؤں سے نبھا نہ ہو سکے گا۔ اسلئے اس نے آئے دن کے جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے ہندوؤں کو یہ جواب لکھا کہ ہم تمہارے ساتھ اس بات پر صلح کرتے ہیں کہ سرہند۔ پنجاب اور ملتان کے علاقے ہمیں دے دو اور باقی ہندوستان تم خود رکھو۔ اسکے لئے سلطان نے یہ الفاظ استعمال کئے:۔

"باشما صلح کنیم کہ سرہند و پنجاب و ملتان باما باشد و باقی ممالکِ ہندوستان از شما"۔ (تاریخ فرشتہ ص ۱۰۱)

اسطرح سلطان محمد غوری نے قیام پاکستان سے قریباً ساڑھے سات سو سال قبل تقسیم ہند کی تحریک کی۔ جسے ہندوؤں نے سلطان کی کمزوری پر محمول کر کے مسترد کر دیا۔ جس پر سلطان نے حملہ کر کے ہندوؤں کی سیاسی طاقت کو کچل کر رکھ دیا اور ان کی سطوتِ پارینہ پر ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

نظریۂ پاکستان بھی ایسے ہی حالات کی پیداوار تھا تاکہ یہاں پھر سے اسلامی حکومت

قائم کی جائے۔

(۲)

تحریک ولی اللّٰہی

اٹھارویں صدی میں حکومت ہند کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ مغربی۔ جنوبی علاقوں میں مرہٹوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ اب وہ بہار۔ اڑلیسہ اور بنگال کو تاراج کر رہے تھے۔ اور شمالی علاقہ پر تسلّط قائم کرنے کے لئے دہلی پر حملہ کر دیا تھا۔ نجیب الدولہ نے ان سے صلح کر لی۔ جس سے مرہٹوں کے حوصلے بڑھے اور ۱۷۵۸ء میں انہوں نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ملتان کا رُخ کیا۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کفار کی اس یلغار کو۔ کفر کے اس سیلاب کو دیکھ دیکھ کر بڑے بیقرار ہو رہے تھے۔ اس طوفان کو روکنے کے لئے آپ نے احمد شاہ ابدالی کو احیاء اسلام کی خاطر متعدد خطوط لکھے۔ جن کے ذریعہ انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو اس امر کا یقین دلایا کہ:-

"اگر قوم کفار اسی حال پر رہی اور مسلمان ضعیف ہوتے گئے تو اسلام کا نام بھی کہیں باقی نہ رہے گا"

اور اس واسطہ سے انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو یہاں بلوایا۔ یہ خطوط تاریخ پاکستان کے دیباچہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط سے متاثر ہو کر احمد شاہ کو کئی مرتبہ ہندوستان آنا پڑا اور انہی اغراض کے تحت آنا پڑا۔ جن کے تحت قائدِ اعظم نے پاکستان طلب کیا تھا۔ آخر کار ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی ایسی کمر توڑی کہ پھر انہیں شمالی ہند کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ اس تاریخی معرکہ میں احمد شاہ ابدالی اسی طرح اپنے سے سات گنا مرہٹوں سے نبرد آزما ہوا جس طرح ۱۹۶۵ء میں مجاہدین پاکستان نے اپنے سے چھ سات گنا زیادہ ہندوؤں اور سکھوں

کو پاکستان کی سرحد سے مار بھگایا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے اس فاتحانہ اقدام سے مسلمانوں کی جان میں جان آئی اور انہوں نے از راہِ شکر گزاری و احسان مندی ہندوستان کا تخت و تاج احمد شاہ ابدالی کو پیش کیا۔ احمد شاہ ابدالی کو اگر ہوسِ اقتدار ہوتی تو وہ تختِ دہلی کو رونق بخشتا لیکن اس نے اپنی جبلّی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ:-

"مدد کو آنا اور تخت پر قبضہ جمانا شرافت سے بعید ہے"۔ (تاریخ اقوامِ عالم صہ ۵۴۴)

اس لئے وہ ہندوستان کی سلطنت شاہ عالم کے سپرد کر کے واپس چلا گیا۔ اسطرح شاہ ولی اللہؒ نے ہندوستان کو مرہٹوں کے چنگل سے بچایا۔ جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کی مساعی جمیلہ نظریۂ پاکستان کی خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۳)

تحریکِ سلطان ٹیپو

سلطان ٹیپو، میسور کی دوسری جنگ کے دوران ۱۷۸۲ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ متحدہ ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمران تھا۔ جس نے عالم اسلام اور برِ عظیم پاک و ہند کا ایک متحدہ محاذ بنانے کی طرف توجہ دی۔ تاکہ اسے انگریزی سامراج کی دست برد سے بچایا جائے۔ جو برِ عظیم ہندو پاک میں بڑی تیزی سے اپنے قدم بڑھا اور جما رہے تھے۔ اسلام دشمنی کی وجہ سے اس ملک کا ہندو عنصر انگریزوں کی مدد کر رہا تھا۔ اس روشن دماغ اور بیدار مغز حکمران نے اس ابھرتی ہوئی سامراجی طاقت کے خلاف پہلے اندرونی حکمرانوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے اس اسلامی سلطنت کو انگریزی لٹیروں سے بچانے کے لئے ترکی۔ افغانستان اور ایران سے امداد حاصل کرنے کی خاطر ان کے حکمرانوں کو خطوط لکھے۔ مگر سامراجی طاقتوں نے پہلے سے ان اسلامی ممالک میں اپنی ریشہ دوانیوں سے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ وہ

سلطان ٹیپو کی کوئی مدد نہ کر سکے اور ایک اسلامی سلطنت بہت بڑے خطرہ میں گھر گئی۔ سلطان ٹیپو نے ان سے نا امید ہو کر فرانس سے امداد طلب کی۔ وہ آمادہ بھی ہو گیا۔ لیکن جنگِ نیل میں انگریزوں کے ہاتھوں فرانسیسی بحری بیڑہ تباہ ہو گیا۔ جسکی وجہ سے فرانس بھی سلطان ٹیپو کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ سلطان ٹیپو کا پاکستان کی طرف یہ دوسرا قدم تھا۔ جو سامراجی طاقت سے ایک اسلامی سلطنت کو بچانے کے لئے اٹھایا گیا۔ اگرچہ سلطان کو اس میں ناکامی ہوئی مگر مشن زندہ و تابندہ رہا۔ (۳ الف)

تحریکِ فرائضی

اسلام دشمنی کی وجہ سے ہندوؤں نے انگریزی حکومت کے ساتھ جو تعاون کر رکھا تھا۔ اسکی بدولت انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کیلئے ایسے ایسے قوانین جاری کر دیئے تھے۔ جنکی وجہ سے بنگال کا ہندو زمیندار مسلمان کسانوں پر اس حد تک مسلط ہو گیا تھا کہ وہ ان سے درگا پوجا کیلئے ٹیکس وصول کرنے لگ گیا تھا۔ انہیں ہر معاملہ میں ہندو معاشرت کی تقلید کیلئے مجبور کر دیا گیا تھا۔ اور ہر محاذ پر مسلمانوں کو نہ صرف انگریزوں کے سامنے بلکہ ہندوؤں کے سامنے بھی جھکنا پڑتا تھا۔ مسلمانوں کو ہندو زمینداروں اور نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں کو بہر حال خوش رکھنا پڑتا تھا۔ ورنہ یہ دونوں غیر مسلم مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے تھے۔ اس مجبوری کی وجہ سے مسلمانوں نے ہندوانہ رسم و رواج تک اپنا رکھے تھے۔

مسلمانوں کے اس دورِ انحطاط اور عہدِ غلامی میں ان کی نجات کیلئے بنگال کے قصبہ دولت پور ضلع فرید پور سے ایک اسم باسمی نوجوان شریعت اللہ اٹھا۔ اس نے ۱۸ سال کی عمر میں ——— حجازِ مقدس کا رُخ کیا۔ جہاں بیس برس رہ کر اسنے وہاں کے نامور علماء و مشائخ سے تعلیم دین کی تکمیل کی اور تبلیغ دین و احیاء اسلام کا جذبہ لے

روطن واپس لوٹا۔ سلطان ٹیپو کی شہادت کے ٹھیک تین سال بعد اس ممتاز عالم دین نے بنگال کے عام مسلمانوں میں اسلام کے احیار اور احکام شریعت کے نفاذ کی تحریک چلائی۔ جو فرائضی تحریک کے نام سے مشہور اور مسلمانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔

یہ متحدہ ہندوستان کی پہلی عوامی تحریک تھی۔ جسکی بنیاد صحیح معنوں میں لا الہ الا اللہ پر رکھی گئی اور مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں کے جبر واستبداد اور تشدد و استحصال سے بچانے کیلئے عملی قدم اٹھایا گیا۔ اسکے ذریعہ غیر مسلموں کی رسم ورواج کو بدعات و خرافات قرار دیکر مسلمانوں کو صحیح معنوں میں کتاب وسنت کا متبع بنایا گیا۔ عام مسلمانوں میں اس حد تک پاکی۔ طہارت اور تقویٰ پیدا کیا گیا کہ اس تحریک سے تعلق رکھنے والا ہر فرد پکا اور قابلِ اعتماد مسلمان بن گیا۔ مسلمانوں میں ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد ابھر آیا۔ وہ ان کے خلاف متحد اور منظم ہو گئے اور وہاں کا قریباً قریباً ہر مسلمان پابندِ صوم وصلوٰۃ ہو گیا۔ مسلمانوں نے تمام ہندوانہ رسوم ترک کر دیں۔ درگا پوجا ٹیکس ادا کرنا بند کر دیا۔ انگریزی عدالتوں کا بائیکاٹ کر کے اپنی متوازی عدالتیں قائم کر لیں: اور وہیں تمام مقدمات کا شرعی فیصلہ کرانے لگے۔ ملک کو دار الحرب قرار دیدیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اسے جب تک غیر مسلموں سے آزاد کر کر دار السلام یعنی پاکستان نہ بنا لیا جائے۔ اس وقت تک نماز جمعہ وعیدین درست نہ ہو گی۔ اور ہر مسلمان پر یہ لازم کر دیا گیا کہ جب وہ اپنے کسی بھائی کو کسی مصیبت میں گرفتار دیکھے تو اسکی فوراً مدد کرے۔

اس تحریک کے پیروکاروں نے چونکہ اسلامی اصول ونظریات اور احکام کتاب و سنت کی پوری پوری پابندی شروع کر دی تھی۔ اور انکو عمل کے دائرہ میں لانا اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ اسلئے اس تحریک کا نام فرائضی تحریک پڑ گیا۔ اس تحریک نے صحیح معنوں میں مسلمانوں کے اندر خود داری کا ایک نیا جذبہ واحساس پیدا کیا۔ انگریزوں

کی عملی حکومت کے قیام کے فوراً بعد ان کے خلاف مسلمانوں کے اندر ایسا جذبہ جہاد پیدا کیا۔ جسے وہاں دو سو سال برسرِ اقتدار رہنے کے باوجود انگریز نہ مٹا سکے۔ اگر آج یہ کہا جائے کہ تحریک پاکستان، کا بیج سب سے پہلے ملک میں فرائضی تحریک نے بو یا تو تاریخ اس کی تردید نہیں کر سکے گی۔ اسلام۔ اسلامی شریعت۔ مسلم تہذیب و تمدن کے احیاء کی یہی تحریک مختلف وقتوں میں اور مختلف رنگوں میں متحدہ ہندوستان میں کروٹ لیتی رہی۔ اور بالآخر یہ پاکستان کی شکل میں متشکل ہو کر سامنے آئی۔

مولانا شریعت اللہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند محسن الدین احمد عرف دُو دُو میاں مدتوں یہ تحریک چلاتے رہے۔ یہ "فرائضیوں" کے قائد تسلیم کئے گئے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو ایک منظم جماعت کی شکل دی۔ اسکی سرگرمیوں کی نگرانی کیلئے مختلف مقامات پر اپنے نائبین مقرر کئے۔ آپ کی قیادت میں مسلمانوں نے پہلی مرتبہ غیر مسلموں کو اپنے آپ سے برتر سمجھنے سے انکار کر دیا اور ہر طرف اسلامی اصول و نظریات اور شرعی احکام کی عملداری نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کے اسی جذبۂ اسلام اور جہاد سے ہندو اور انگریز سخت خائف ہوئے۔ انہوں نے ان کی متحدہ صفوں میں مختلف خفیہ ذرائع سے انتشار پیدا کرنا شروع کر دیا۔ بطل حریت، فرزندِ اسلام دُو دُو میاں کو جیل میں بند کر دیا۔ ۱۸۶۰ء میں آپ فوت ہوئے۔ اسکے باوجود یہ تحریک کچھ عرصہ وہاں چلتی رہی۔ جسکی وجہ سے انگریز سکون و اطمینان سے بنگال پر حکمرانی نہ کر سکے۔ اس تحریک کے اثرات تا قیام پاکستان کام کرتے رہے۔ اور اسی تحریک کے بنیادی پتھر لا الہ الا اللہ پر پاکستان کی عمارت تعمیر ہوئی۔ مگر قصرِ پاکستان کے قابضین نے اپنی مغرب زدگی کی وجہ سے بلطائف الحیل اس پر تحریک فرائضی کا رنگ نہ چڑھنے دیا۔ جو معمارانِ پاکستان کا مقصد وحید تھا۔

---

(۴)

تحریکِ مجاہدین

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی وفات پر ابھی پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید نے ہندوؤں اور سکھوں کی ستم رانیوں کو ختم کرنے کے لئے قریباً ۱۸۱۰ء میں تحریک مجاہدین کا آغاز کیا۔ اس تحریک کا آغاز بالکل انہی حالات میں ہوا۔ جسطرح ایک عورت کی فریاد پر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو وادیٔ سندھ میں اسکی دستگیری کے لئے بھیجا تھا۔ بعینہ اسی طرح جب سید احمد شہید کو پتہ چلا کہ سکھوں نے مسلمان افغان زادیوں کو جبراً اغوا کر کے کافر بنالیا ہے۔ اور انہیں جبراً اپنے پاس بطور بیویوں کے رکھا ہوا ہے۔ تو اس وقت سید صاحب نے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سکھوں نے لاہور اور دوسرے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنا رکھا تھا اور ان کے مظالم درجہ انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ہزاروں مسلمانوں کو انہوں نے بلا قصور شہید کیا۔ ہزاروں کو ذلیل کیا۔ مسجدوں میں اذانیں دینی ممنوع کردیں۔ ذبیحہ کی ممانعت کردی۔ جب سکھوں کے مظالم ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو اسوقت ان حضرات نے خالصۃً تحفظ دین کے لئے اسی طرح

جہاد کا اعلان کر دیا ۔ جسطرح غیر مسلموں کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ داغ دیا تھا ۔ مولانا غلام رسول مہر نے جماعتِ مجاہدین کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد لکھے ہیں :-

" سید صاحب نے سیاسی عظمت و برتری کو اپنا نصب العین نہ بنایا ۔ صرف احیاء اسلام پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی ۔ وہ دعویداران اسلام کو سچے مسلمان بنانا چاہتے تھے ۔ اور ان میں خدمت دین اور تکمیل مقاصد کے لئے اسلامیت کی سچی لو لگانے کے خواہاں تھے ۔"

سیّد صاحب نے اس غرض کے لئے نہ صرف مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور انہیں بیدار کر کے خدا کی راہ میں لڑنے پر آمادہ کیا ۔ بلکہ مختلف مسلمان حکمرانوں کو بھی امداد کے لئے دعوت بھیجی اور اس تحریک کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد انہیں لکھے :-

" جہاد قائم کرنا اور بغاوت و فساد کو مٹانا ، ہر زمانے اور ہر مقام میں خدا کا نہایت اہم حکم رہا ہے ۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کافروں اور سرکشوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے کہ سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھوں دینی شعائر اکھاڑے جا رہے ہیں اور شاہانِ اسلام کی حکومتوں میں ابتری پیدا کی جا رہی ہے اور یہ زبردست فتنہ ہند ۔ سندھ اور خراسان کے خطوں پر چھا گیا ہے ۔"

اس ضمن میں مولانا محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی میں سکھوں کے خلاف جہاد کی وجہ سیّد احمد شہید کے الفاظ میں یہ لکھی ہے :-

" کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے ۔ نہ انگریزوں کا نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے ۔ بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے ہیں اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں ۔"

تحریکِ پاکستان بھی تو ان ہی حالات کا نتیجہ تھی۔ جس غرض کے لئے یہ جنگ لڑی گئی۔ اسکا نمونہ بھی دنیا نے دیکھ لیا۔ یعنی حضرت سیّد احمد شہید اور ان کے رفیق سیّد اسماعیل شہید کو جس چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا۔ اس میں :۔

"انہوں نے ٹھیک اسی طرز کی حکومت قائم کی۔ جسکو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا گیا ہے۔ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات۔ وہی شوریٰ۔ وہی عدل و انصاف۔ وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا۔ وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی ممانعت اگرچہ قوی ہو۔ وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا۔ اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انہوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا۔ جو کبھی صدیق و فاروق نے کی تھی۔" (تجدید احیاء دین ص ۱۷۰، ۲)

'نتیجہ' کے لئے لحاظ سے تحریک مجاہدین صحیح معنوں میں تحریک پاکستان تھی بلکہ اس تحریک نے دنیا کے اس چھوٹے سے خطہ میں صحیح معنوں میں پاکستان قائم کر کے بھی دکھا دیا۔ جسکے نظاروں کے لئے آج بھی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ انجام کار اگرچہ یہ تحریک ناکام رہی۔ لیکن اس نے قیام پاکستان کے لئے راستہ تو صاف کر دیا۔ اسکا مثالی نقشہ قائم کر کے دنیا کو دکھلا دیا کہ پاکستان صحیح معنوں میں اسکو کہتے ہیں۔ یہ تحریک ناکامی کے باوجود ایسے اثرات چھوڑ گئی۔ جنہوں نے آنے والی تحاریک کیلئے نشان راہ کا کام کیا۔

(۵)

تحریک جنگِ آزادی

اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد، انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور جبر و استبداد نے عوام کو ایک مرتبہ پھر انگڑائی لینے پر مجبور کر دیا کہ اپنی قوتِ بازو سے ملک کو انگریزوں

کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔ اس جنگ کی بنیاد بھی جذبۂ دینداری تھا۔ کیونکہ ہندوؤں۔ مسلمانوں کو بالعموم اور فوجیوں۔ سپاہیوں کو بالخصوص یقین ہوگیا کہ انگریز اپنے طرزِ عمل سے ہمیں اپنے دین و مذہب سے ہٹا کر عیسائیت کا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ اس تحریک آزادی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر شانہ بشانہ میدانِ جنگ میں کود ے۔ فی الواقعہ یہ فساد فی الارض نہیں تھا بلکہ یہ بھی ایک قسم کا جہاد فی سبیل اللہ تھا جو اپنے ملک اور مذہب کی آزادی کے لیے لڑا گیا۔ چونکہ آزادی کی یہ جنگ ۱۸۵۷ء بلا کسی تنظیم یا ربط وضبط کے افراتفری کی حالت میں لڑی گئی اور صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے لوگ حدودِ اعتدال سے تجاوز کر گئے۔ اسلئے اسکے نتائج نہایت بھیانک نکلے۔

یہ تحریک آندھی کی طرح اٹھی۔ سیلاب کی طرح بڑھی۔ اسکا لاوا اس آتش فشاں کی طرح پھٹا۔ جس نے ہر فوجی۔ سپاہی۔ شہری۔ امیر۔ غریب۔ کسان۔ زمیندار۔ مزدور اور بچے بوڑھے غرض کہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر شخص انگریزوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینکنے کے لئے مضطرب تھا۔ ان کی غلامی کا جوا اتار دینا چاہتا تھا۔ انہوں نے ان کے بادشاہوں سے جو انسانیت سوز سلوک کیا تھا۔ اسکا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی سرزمین پر پھر سے اپنا راج دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر قدرت کو ابھی انہیں غلام رکھنا منظور تھا۔ اسلئے یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ لیکن دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کر گئی۔ ذہنوں کو سیاسی شعور بخش گئی اور حصولِ پاکستان کے لیے راہ ہموار کر گئی۔

(۶)

تحریکِ سرسیّد

ہندو بڑی بد باطن اور احسان فراموش قوم ہے۔ متحدہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ان کو جتنی آزادی اور مراعات بخشی تھیں۔ ان کی بدولت ایک ہندو ادیب فراق گورکھپوری

کے قول کے مطابق :-

"مسلمانوں کے راج میں ہندوؤں کو کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا کچھ چھن گیا ہے۔ مگر فرنگی راج میں یہ احساس باقاعدہ کام کر رہا تھا"

مگر ہندو کو اپنے خبثِ باطن کی وجہ سے اپنی کمینہ فطرت کی وجہ سے جب بھی موقعہ ملا۔ اس نے مسلمان کا گلہ کاٹنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ آزادیِ ہند کی تحریک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا ساتھ دینے کی یہ سزا ملی کہ انہوں نے انگریزوں کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور انہیں اس بات کا یقین دلا دیا کہ اس جنگِ آزادی کے محرک جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ تمام تر مسلمان تھے۔ ہندوؤں کی اس چغلی کھانے اور دشمن کو بھڑکانے کی غرض وغایت یہ تھی کہ مسلمان اسوقت بے جان ہے۔ اسکا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ وہ اپنا سرمایۂ حیات کھو چکا ہے۔ اسکا ہزار سالہ نشۂ اقتدار ٹوٹ چکا ہے۔ انگریز پر نشہ اقتدار اب زور کر رہا ہے۔ اس نشہ میں اسکا مسلمانوں کو کاٹ کر رکھ دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اسطرح سانپ بھی مرے گا۔ لاٹھی بھی بچے گی۔ چنانچہ ان کی یہ سیاست نہ صرف کامیاب رہی بلکہ بہت کامیاب رہی۔ جسکا صحیح اندازہ وہ حضرات لگا سکتے ہیں۔ جنہوں نے جنگِ پاکستان جیتنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں لاکھوں مسلمانوں کو کٹتے۔ لٹتے اور ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمت لٹتے دیکھا۔ ۱۸۵۷ء اسی ڈرامہ کی ریہرسل کا سال تھا۔ جس میں مسلمانوں کا جرم صرف مسلمان ہونا قرار دیا گیا۔ انگریز اسوقت اتنی بربریّت اور سفاکی پر اتر آیا تھا کہ اس نے دلی۔ لکھنؤ۔ میرٹھ ایسے شاندار شہروں کو ویرانوں میں بدلنے کے بعد مسلمان سے انتقام لینے کی سہل صورت یہ رکھی۔ کہ جو سامنے آتا۔ اس سے صرف ایک سوال کیا جاتا کہ تم کون ہو۔ اگر جواب یہ ملتا کہ مسلمان۔ تو بس وہیں اسے گولی مار دی جاتی۔ اس دوران جتنے مسلمانوں کو باقاعدہ برسرِعام پھانسیاں دی گئیں۔ ان کی تعداد انگریز مورخین نے ستائیس ہزار لکھی ہے۔ دوسرے شہروں میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہوا۔ وہ لاکھوں

تک پہنچ گیا۔ بڑے بڑے شہر ویران ہو گئے۔ مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کر کے ہندوؤں پر کھول دیئے گئے۔ جب بھی حکومت سے ضرورت کا کوئی اشتہار شائع ہوتا۔ اس پر جلی قوم سے یہ نوٹ لکھا ہوتا کہ:۔

"یہ ملازمتیں ہندوؤں کے سوا کسی کو نہ ملیں گی"

نصاب تعلیم بدل دینے کی وجہ سے سرکاری دفتروں میں کوئی مسلمان نہ ملتا۔ اسکے علاوہ سرسید احمد خاں کو متعدد خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ پہلا یہ کہ انگریز مشنری حکومت کے بل بوتے پر اور ملازمتوں کے چکمے کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنا رہے تھے۔ دوسرا یہ کہ یہ لوگ اسلام کو عقل کا دشمن۔ اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت کر رہے تھے۔ یہانتک کہ خود یو۔ پی کے گورنر نے یہاں تک لکھ ڈالا تھا کہ انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن، محمد کی تلوار اور محمد کا قرآن ہے۔ تیسرا سب بڑا خطرہ یہ تھا کہ عیسائی مشنریوں مفکروں اور مصنفوں کی کتابیں پڑھ پڑھکر مسلمان اسلام سے دور اور عیسائیت کے قریب ہو رہے تھے چوتھا یہ کہ ہندوؤں نے اردو کی بجائے ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر دفتروں میں رائج کرنے کی مہم شروع کر دی تھی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر سرسید احمد خان نے حالی۔ محسن الملک۔ وقار الملک۔ شبلی۔ عثمان فارقلیط اور نذیر احمد وغیرہ کی اعانت سے یہ منصوبہ بنایا کہ:۔

۱۔ فارسی کی جگہ ایک نئی زبان رائج کی جائے۔ نیا لٹریچر پیدا کیا جائے۔ جو شاندار ماضی اور موجودہ بدحالی کا قوم کے سامنے نقشہ کھینچے۔

۲۔ ایک ایسی نثر تیار کی جائے۔ جو روزمرہ کا کام چلانے میں ممد و معاون ہو۔

۳۔ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دلائی جائے۔ تاکہ یہ سرکاری ملازمتوں کے حقدار بن سکیں۔

جب ہندوؤں کی بدمعاشیوں کی بدولت یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آئی تو اس وقت سرسید احمد خاں پکار اٹھے کہ "اب ہندو مسلم دونوں کا ایک جگہ رہنا ناممکن ہے۔ زمانے

کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں میں عناد بڑھے گا۔ جو زندہ رہے گا، دیکھے گا"

(۷)

تحریک مولانا شررؔ

متحدہ ہندوستان کے نامور دانشور مولانا عبدالحلیم شررؔ اگرچہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے حامی نہ تھے۔ مگر حکومت انگریزی کی خیر خواہی کا دم بھرتے تھے اور مسلمانوں کو کانگرس سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ یکم اگست ۱۸۹۰ء کو انہوں نے "مہذب" نامی ایک اعلیٰ پایہ کا ایک ہفت روزہ شائع کرنا شروع کیا۔ یہ دو قومی نظریہ کا حامی تھا۔ فرقہ وارانہ چپقلش اسوقت بھی جاری تھیں۔ ہندو اس وقت بھی مسلمانوں کی عبادت میں مخل ہونے سے باز نہیں آتے تھے۔ اگر ان کو موقعہ ملتا تو مسلمانوں کا معاشی مقاطعہ تک کر گزرتے۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ اپنے اخبار کے ذریعہ آریہ سماج سبھا کو ایسی حرکات سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ مگر ان کی اپیلوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر پھر ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ ہندوؤں کی آئے دن کی امن سوز سرگرمیوں سے تنگ آ کر انہوں نے اپنے اخبار مورخہ ۲۳۔ اگست ۱۸۹۰ء میں تقسیم ہند کی کھلے لفظوں میں تجویز داغ دی اور لکھا:-

"ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آ گیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے نہیں پوری ہو تیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان۔ باہم تقسیم کر لیں اور اپنی اپنی آبادی علیحدہ کر لیں"

اسی شمارے میں انہوں نے کانگرس کے مسلم کش رویہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ کانگرس کے:-

"بعض ریزولیوشن ایسے ہیں۔ جو مسلمانوں کے قومی اغراض کے سخت مخالف ہیں۔ اور اس وجہ سے مسلمانوں کو اُس سے اختلاف ہے"۔

یکم ستمبر ۱۸۹۰ء کے پرچہ میں ہندوؤں کی مسلسل تنگ نظری اور اسلام دشمنی پر تبصرہ کرتے ہوئے "ہندو مسلمان" کے عنوان سے آپ نے جو اداریہ لکھا۔ اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ:-

"ہندوستان کی پولٹیکل قوت کا دار و مدار ان دونوں مذکورہ قوموں کے اتفاق پر ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اسوقت تک متواتر کوششیں کی گئیں کہ دونوں فریقوں میں ایک مضبوط اور ضروری نیشنلٹی پیدا ہو۔ لیکن تجربہ روز بروز بتاتا جاتا ہے کہ وہ سب کوششیں خاک میں مل گئیں اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا"۔

(صحافت، پاک و ہند میں صہ ۲-۱۷۲)

۱۱۹۲ء میں سلطان محمد غوری نے جو سب سے پہلے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تھی۔ اس کی سر سید کے بعد ۱۸۹۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر نے اس وقت تائید مزید کی۔ جبکہ ابھی پاکستان کی لڑنے والی مسلم لیگ معرض وجود میں ہی نہ آئی تھی۔

(۸)

تحریکِ ریشمی رومال

انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کا جال بچھانے کے بعد "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کی۔ جسکے نتیجہ کے طور پر ۱۹۱۰ء میں یکے بعد دیگرے کانپور میں مسجد اور کلکتہ میں سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے واقعات رونما ہوئے۔ دوسری طرف جنگِ طرابلس اور بلقان نے عالم اسلام کے حالات دگرگوں کر دیئے۔ جنہوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ (اسیر مالٹا) کو سخت بے چین و بے قرار کر دیا۔ ماضی

کی تحریکوں کی ناکامی کا داغ دھونے کے لئے آپ نے کافی غور و خوض کے بعد اسلحہ کی مدد سے تحریک جہادِ حریت چلانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ آپ کا بھی یہی خیال تھا کہ اگر متحدہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ تو اسکی بدولت ممالکِ اسلامیہ اور افریقہ میں بھی انگریزوں کا تسلط ختم ہو جائے گا۔ اس غرض کے لئے آپ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو اعتماد میں لیا۔ ان کی معرفت ڈاکٹر انصاری۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی حمایت حاصل کی۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کو چارسدہ چھوڑ کر آزاد علاقہ یعنی یاغستان میں اس تحریک کا مرکز قائم کرنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ وہاں اسلحہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہاں اسلحہ اور جان پر کھیل جانے والے مجاہدین کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ انگریز کے سامنے جھکنے کی بجائے اپنا سر کٹانا پسند کرتے تھے۔ جب بھی انگریزوں نے ان کی آزاد سرزمین پر قدم رکھا۔ انہوں نے ان کی پلٹنوں کی پلٹنیں ختم کر دیں یا انہیں جان بچا کر بھاگ جانے اور اپنی چھاؤنیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

اس تحریک کا ۱۹۱۰ء کے قریب آغاز ہوا۔ یہ تحریک سیاسی لیڈروں کی چلائی ہوئی نہ تھی۔ نہ ہی اسوقت تک سیاسی شعور اس حد تک بیدار ہوا تھا بلکہ:۔

"اس تحریک کے بانی وہ بزرگ تھے۔ جن کو نہ اقتدار کی ہوس تھی۔ نہ عظمت و جاہ کا شوق تھا۔ یہ اللہ والے جن کی جولانگاہ مدرسہ و خانقاہ تھی یا مسجد، جن کے ساتھی شکستہ حال مُلّا اور مولوی تھے۔ یا عربی پڑھنے والے بے سہارا، تہی دست، وظیفہ خوار طلباء۔ ان کے سربراہ مولانا محمود الحسن، جن کو کسی پولیٹیکل تکنیک یا سیاسی داؤ پیچ نے نہیں، بلکہ زہد و تقویٰ۔ پاکیزگیٔ باطن، ترکِ دنیا۔ درویشانہ خصلتوں اور فقیرانہ عجز و نیاز نے آپ کو علمائے ہند کا سرتاج اور مشائخ طریقت کے مرشدِ اعظم اور قطب الاقطاب بنایا تھا۔ ان کے وہ قدم جو دار التفسیر یا دار الحدیث کی طرف اٹھتے تھے تو فرشتے ان کے نیچے پَر بچھاتے تھے۔ اسی کے قدم "انقلاب" کے پُر دَر پُر خطر میدان کی طرف اٹھے اور اتنی چستی سے اٹھے کہ قائدینِ سیاست ابھی بیدار بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ مسافت

کا بڑا حصّہ طے کر چکے تھے۔ (تحریک شیخ الہند ص ۲۵)

اس تحریک کے سلسلہ میں مولانا محمود الحسن حجاز مقدس پہنچے۔ وہاں کے گورنر غالب پاشا سے تعارفی خط حاصل کر کے ترکی کے وزیر جنگ غازی انور پاشا اور سویز و سینا کے کمانڈر جمال پاشا سے ملے۔ انہیں اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اس شرط پر امداد دینے کا وعدہ کیا کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادیٔ کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت شیخ الہند کو تین زبانوں میں ضروری ہدایات تحریر کر دیں اور آپ کو یاغستان یعنی آزاد علاقے میں واپس جانے کی بجائے ترکی قلمرو میں بیٹھ کر تحریک چلانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ یاغستان سے اس تحریک کے کارکنان کو انتہائی خفیہ ذرائع سے زرد ریشمی رومالوں پر ہدایات لکھ کر بھیجی جاتی تھیں۔ جن کے یہاں سے فوٹو گراف کر ہر مرکز اور ہر شاخ کو بھیجدیئے جاتے تھے۔ اس وجہ سے یہ تحریک ریشمی رومال کی تحریک مشہور ہو گئی۔ جہاد آزادی کی یہ تحریک اس وقت چلائی گئی جبکہ ابھی انڈین نیشنل کانگرس نے مکمل آزادی تو درکنار "ہوم رول" اور ڈومنین سٹیٹس کا بھی نام تک نہ لیا تھا اور انگریزی حکومت یہاں کے سروں اور خان بہادروں پر تکیہ کئے بیٹھی تھی۔ اس تحریک کے جاری ہونے والے خطوط اس نوعیت کے ہوتے تھے:-

"ایشیا۔ یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کے لئے کود پڑے ہیں۔

اسلئے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو۔ اس پر حملہ کرو۔ دشمن کو مرنے پر مجبور کر کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جدوجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو۔ ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو"۔

ان کے طریق کار میں مشہور چھاؤنیوں کے میگزین اڑانا اور پھر وہاں حملہ کر دینا شامل تھا۔ اس تحریک کا سراغ لگانے۔ اسکے خطوط اور فوٹو حاصل کرنے اور اسے ناکام بنانے کے لئے حکومت انگریزی نے امیر حبیب اللہ خان والیٔ افغانستان سے بھی مدد لی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں

بڑی تگ و دو کے بعد ریشمی خطوط کا انکشاف ہوا اور اس سازشی منصوبہ کا حکومت کو پتہ چلا۔ جسکا مقصد شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرنا اور دوسری طرف متحدہ ہندوستان میں شورش کر کے برطانوی راج کو ختم کرنا تھا۔ اس تحریک میں صرف مسلمان ہی نہیں رانا مہندر پرتاب اور امریکن غدر پارٹی کے ارکان بھی شامل تھے۔ چونکہ اس سازش کا بروقت پتہ چل گیا۔ اسلئے فوج نے ۱۵ر فروری ۱۹۱۵ء کو فیروزپور چھاؤنی پر ہونے والہ حملہ ناکام بنا دیا۔ مولانا محمود الحسن کو بمعہ اپنے ہمراہیوں کے انگریزوں کے ایجنٹ شریف حسین نے خود جدہ پہنچ کر گرفتار کرایا۔ جنھیں حکومت برطانیہ کے حکم سے مالٹا میں قید رکھا گیا۔ وہاں قریباً ساڑھے تین سال قید رکھنے بعد ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی میں لاکر رہا کیا گیا۔ اس تحریک کا تمام خفیہ پولیس کا ریکارڈ جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھا۔ اب چھاپ دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی یہ پہلی تحریک تھی۔ جس میں غیر ملکی حکمرانوں نے بھی موافق اور مخالف حصّہ لیا۔

آپ نے ہندوستان پہنچنے کے بعد ترک موالات کا فتویٰ دے دیا۔ جس سے حکومت ہند اور پریشان ہوگئی۔ انگریزوں کے خلاف تنفر کی خلیج وسیع ہوگئی اور سیاسی فضا بہت حد تک سازگار ہوگئی۔ آپ کے ترک موالات کے فتویٰ کی پانچ سو علماء نے تائید کی۔ جس کی بناء پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مولانا محمد علی جوہر نے بنیاد رکھی۔ اس طرح نظریہ پاکستان کو مزید تقویت ملی۔

(۹)

تحریک کامریڈ

مولانا محمد علی جوہر بھی کانگرسی لیڈر اور صدر رہنے کے باوجود۔ گاندھی کو جیب میں رکھنے کے باوجود، جواہر لعل نہرو کو اپنا محبوب ترین سیکرٹری بنانے کے باوجود، متحدہ ہندوستان کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے دل و دماغ کے قریب رہ کر یہ اندازہ کر لیا تھا

کہ یہ خود غرض، بنیا اور یہودی ذہنیت کی قوم ہے۔ اس سے مسلمانوں کا نبھا نہ ہو سکے گا۔
ان کے مشہور عالم اخبار "کامریڈ" مورخہ ۱۴۔ جنوری ۱۹۱۱ء کا اداریہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:۔

"اس نعرے میں ہمارا کوئی اعتقاد نہیں کہ ہندوستان متحد ہے۔ ہندوستان کے مسائل قریباً بین الاقوامی مسائل ہیں۔ لیکن باہمی خیر سگالی سے ایک متحدہ قومیت پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم حب وطن کا وہ جوش وخروش تو پیدا نہ کر سکیں گے جو جاپان کے چار کروڑ باشندوں کی ایک متحدہ قوم میں پیدا ہے۔ لیکن کنیڈا کے انداز کا ایک اتحاد ناممکن نہیں۔"

اگلے سال ۶، فروری ۱۹۱۲ء کے اداریہ میں مولانا محمد علی جوہر نے دو قومی نظریہ پھر کامریڈ کے اداریہ میں یوں پیش کیا:۔

"آج متحدہ ہندوستان کا کوئی وجود نہیں۔ ہمیں اسے وجود میں لانا ہے اور اس کی اولین شرط یہ ہے کہ اس امر کو تسلیم کر لیا جائے کہ اسکا کوئی وجود نہیں۔"

کفر و اسلام کی دوستی تو کبھی ممکن نہیں رہی۔ اسلئے ہندوؤں نے کبھی یہ نظریہ قبول ہی نہ کیا۔ بلکہ مولانا محمد علی جوہر کے محبوب سیکرٹری جواہر لعل نہرو نے بعد میں مسلم قوم کے وجود کو ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہندوستان میں ما بہ النزاع امر صرف انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان ہے۔

ہفتہ وار انگریزی کامریڈ کا مزاحیہ کالم "گپ" کبھی مولانا محمد علی جوہر خود لکھتے تھے اور کبھی ان نظریات کے مطابق راجہ ولایت حسین اور کبھی ولایت علی بمبوق لکھتے تھے۔ ۱۰، مئی ۱۹۱۳ء کے پرچہ میں مسٹر بمبوق نے مندرجہ ذیل حقیقت آفرین خیالات کا اظہار کیا:۔

"سوال:۔ آپ ہندو مسلم مسئلے کو کیسے حل کریں گے؟

جواب :- ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر دینا چاہیئے ۔ شمالی ہند مسلمانوں کے حصّہ میں آجائے اور باقی ہندوستان ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے ۔"

یہ تقسیم ہند کی چوتھی تجویز تھی ۔ جو سلطان محمد غوری سر سید مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد مولانا محمد علی جوہر کے اخبار نے پیش کی اور جس سے نظریہ پاکستان کی براہِ راست تائید ہوئی ۔

(۱۰)

تحریکِ حزب اللہ

یہ تحریک مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں احیاءِ اسلام کے لئے شروع کی ۔ اس کے ۷۰۰ ، ۱ ۔ اراکین متحدہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مصروف عمل تھے جو مذہب کی خاطر ملّت کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار تھے اور انہیں اپنی جان تک قربان کرنے میں کوئی دریغ نہ تھا ۔ ان کا کام اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لئے مستقلاً دورے کرنا اپنی تمام دنیاوی امیدوں ۔ آرزوؤں اور رشتوں سے ناطہ توڑ کر اپنی زندگی ، خدا اور اپنے فرشتوں کو گواہ بنا کر اپنے مذہب اور عقیدہ کی خدمت کے لئے وقف کرنا تھا ۔ ان کا کام مسلمانوں کے مذہبی عقائد کی اصلاح کرنا ۔ عقیدہ و عمل کے لحاظ سے انہیں سچا مسلمان بنانا اور خدا کی راہ میں اسلام کی سربلندی کے لئے جہاد کرنا تھا ۔ درسِ قرآن کا ہر جگہ اہتمام کرنا اور مسلمانوں کو ذہنی طور پر جہاد کے لئے تیار کرنا تھا ۔ اس تحریک کی نمائندگی معروف اخبار الہلال کر رہا تھا ۔

حکومت برطانیہ نے قرآنی بنیادوں پر چلائی جانے والی اس تحریک کو حکومت کے لئے سنگین خطرہ محسوس کیا ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو باغی صحافی قرار دیکر اس تحریک کے آرگن الہلال کو پریس ایکٹ کے تحت کارروائی کر کے بند کر دیا ۔ اس تحریک کا ایک نمائندہ عبدالرزاق ہندوستان سے مصر پہنچا ۔ کچھ عرصہ وہ قسطنطنیہ میں بھی رہا اور انجمن آزادیِ ہند کے رکن کی

حیثیت سے ترکی کا اخبار "جہانِ اسلام" اسکے مقالے بھی چھاپتا رہا۔ مصری پولیس نے اس پر شبہ کیا کہ وہ مصر میں مقیم ہندوستانی افواج پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ الہلال کی بندش اور پہلی جنگ عظیم کے آغاز کی وجہ سے یہ تحریک ناکام رہی اور اسکی جگہ انجمن خدامِ کعبہ نے لے لی۔

(۱۱)

تحریکِ خلافت

انیسویں صدی کے اوائل میں لیبیا پر اٹلی کے قبضہ۔ طرابلس پر اسکے حملہ مراکش پر فرانس کے انتداب۔ بلقان پر حملے سے مسلمانوں کے جذبات سخت مجروح ہوئے۔ مقاماتِ مقدسہ مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور بیت المقدس کو استعماری طاقتوں سے بچانے کے لئے مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری نے انجمن خدامِ کعبہ کی بنیاد رکھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کر کے ترکی سیادت کو عملاً ختم کر دیا گیا۔ ایک معاہدہ کے ذریعہ ترکی کے مقبوضہ علاقے سمرنا۔ تھریس اور اناطولیہ وغیرہ اس سے چھین لئے گئے۔ جس سے مسلمانانِ ہند کے جذبات اتنے مشتعل ہوئے کہ تاریخ اسکی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جسکے نتیجہ کے طور پر مذکورہ بالا معاہدہ سیورے کی اشاعت کے بعد انجمن خدام کعبہ کو آل انڈیا خلافت کمیٹی کا جامہ پہنا دیا گیا۔ اسکا پہلا اجلاس دہلی میں مولوی فضل حق کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ جس میں برطانوی مال کا بائیکاٹ۔ جشنِ فتح میں عدم شمولیت کا فیصلہ ہوا۔ جلیانوالہ باغ کے حادثہ نے ایک مرتبہ پھر ہندو مسلمانوں کو متحد کر دیا۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ مکارِ اعظم مسٹر گاندھی مولانا محمد علی جوہر کی جیب میں گھس کر ہندوؤں کے مفاد کی نگرانی کرتے رہے۔ جس جوش و خروش سے یہ تحریک چلی۔ اسکا صحیح اندازہ تحریکِ پاکستان کے جوش و خروش سے ہی لگ سکتا ہے۔ ورنہ اتنا جوش و خروش متحدہ ہندوستان کی کسی تحریک کے دوران دیکھنے میں نہ آیا اور نہ اتنی قربانیاں کسی اور تحریک میں دی گئیں۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس

تحریک نے :-

" برِعظیم ہندو پاک میں برطانوی سلطنت کی جڑوں کو ہلانے میں وہ کردار ادا کیا۔ جو اس سے پہلے کسی تحریک نے نہیں کیا " (برِعظیم ہندو پاک کی ملتِ اسلامیہ ص ۲۵۴)

خلافت کی تحریک اور اسکی تعلیم و تربیت نے مسلمانوں میں جو اسلامی جوش اور جذبہ پیدا کیا۔ وہ پاکستان کی تحریک کو کامیابی کی سرحد تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

(۱۲)

تحریک حضرت تھانویؒ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ان علماء حق میں سے تھے۔ جن کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندو اور انگریز دونوں ناگ ہیں۔ آپ کانگرس کی تحاریک کے زمانہ میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ :-

" جتنے کافر ہیں۔ سب اسلام کے دشمن ہیں۔ کوئی گورا ہو یا کالا۔ دونوں ہی سانپ ہیں۔ بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ اگر گورے سانپ کو گھر سے نکال دیا جائے تو کالا تو ڈسنے کو موجود ہے۔ جسکا ڈسا ہوا زندہ ہی مشکل ہوتا ہے " (الافاضات الیومیہ جلد ششم)

انہوں نے اس بات کا بھی بارہا اعلان کیا کہ کانگرس انگریز کو نکالنے میں مخلص نہیں بلکہ وہ انگریز کو ہندوستان میں رکھنا چاہتی ہے تاکہ ان کے زیرِ سایہ ہندو حکومت کر سکے۔ حسن اتفاق سے ماہ جون ۱۹۲۸ء کو کانگرسی لیڈر مولانا حسین احمد مدنی اور خلافتی لیڈر مولانا عبدالماجد دریا بادی دونوں حضرت تھانوی کو تھانہ بھون ملنے گئے۔ اس سلسلے میں وہاں جو گفتگو ہوئی۔ اس میں حضرت تھانوی نے پاکستان کا نقشہ پیش کر دیا۔ آپ نے فرمایا :-

" جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات

وغیرہ کا اجراء احکامِ شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال قائم ہو۔ نظامِ زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوئیں۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا:-

"پاکستان کا تخیل، خالص حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔" (نقوش و تاثرات صد ۲۳)

اس موضوع پر آپ نے کتابیں بھی لکھیں۔ مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور قائدِ اعظم کی دینی تربیت کے لئے خطوط لکھے۔ وفد بھیجے۔ جنکی تفصیل "تعمیر پاکستان اور علماء ربانی اور" سیرتِ اشرف" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(۱۳)

تحریک علامہ اقبالؒ

مسلم لیگ دسمبر ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے موقع پر نواب وقار الملک نے اس جماعت کے بنانے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہندو آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو:-

"اس وقت اپنی قوم پر وہ قوم حکمران ہو گی جو تعداد میں ہم سے چار گنا زیادہ ہے۔ اب صاحبو! ہم میں سے ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہمارا مذہب، ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو سب خطرہ میں ہو گی۔"

دن گذرتے گئے اور یہ خطرہ بڑھتا گیا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے ۲۹، دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا

مسلم لیگ الٰہ آباد کے سالانہ اجلاس کا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے علامہ اقبال نے یہ تجویز پیش کی کہ:۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد و سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔۔۔۔ مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے۔ بالکل حق بجانب ہے۔۔۔ میں صرف اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں"۔ (حرف اقبال)

اسی مطالبہ کی بنا پر نظریۂ پاکستان کو علامہ اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے۔

(۱۴)

تحریک چوہدری رحمت علی

۱۷۵۶ء سے لیکر ۱۹۳۰ء تک یا امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے لیکر علامہ اقبال تک احیاء اسلام یا اسلامی حکومت کے قیام یا ہندوستان کی تقسیم کے سلسلہ میں جتنی بھی آوازیں اٹھتی رہیں۔ ان میں مطلوبہ اسلامی حکومت کا کوئی بھی نام تجویز نہ کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ لفظ پاکستان کے خالق چوہدری رحمت علی نے ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی بزم شبلی کے ایک اجلاس میں جب ایک اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس میں بھی لفظِ پاکستان موجود نہ تھا۔ آپ نے صرف اتنا کہا تھا کہ:۔

"ہندوستان کا شمالی علاقہ مسلمان ہے۔ ہم اسے مسلمان علاقہ برقرار رکھیں گے۔ یہی نہیں، ہم اسے ایک مسلمان ریاست بنائیں گے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب اس علاقہ کے مسلمان اپنے آپ کو بقیہ ہندوستان سے منقطع کر لیں۔ یہ ایک ضروری شرط ہے۔ ہم جتنی جلدی انڈین ازم سے علیحدہ ہو جائیں، اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہتر ہے"۔

بزم شبلی چونکہ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ اور عیسائی طالبعلموں کی مشترکہ تنظیم تھی۔ اسلئے انہوں نے چوہدری رحمت علی سے ایسی تقریر کرنے کے بارے میں جواب طلبی کی تو انہوں نے جرأتِ ایمانی سے کام لیتے ہوئے اعلان کیا کہ :۔

"میرا یقین اور ایمان ہے کہ ملّتِ اسلامیہ علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ جسکے لئے مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کرے اگر تمہیں میرا مؤقف پسند نہ ہو تو تم اپنی راہ چلو۔ میں اپنی ڈگر پر چلوں گا۔ انجام کار دیکھیں گے کہ کون ایک ترقی پذیر ملک و ملّت کا قیام عمل میں لاتا ہے"۔

یہ کہہ کر آپ بزم شبلی سے علیحدہ ہو گئے۔

۱۹۱۵ء کے بعد، ۱۹۱۷ء میں خیری برادران نے، ۱۹۲۰ء میں آگرہ کے وکیل نادر علی نے۔ ۱۹۲۲ء میں سردار گل محمد خان نے، ۱۹۲۴ء میں مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۷ء میں لالہ لاجپت رائے نے، ۱۹۲۹ء میں آقائے مرتضٰی احمد خان نے، ۱۹۳۰ء میں سر ذوالفقار علی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ۱۹۳۸ء میں سر عبداللہ ہارون نے، تقسیم ہند کا جو تصوّر پیش کیا۔ انہوں نے اس مسلم وطن کا کوئی نام تجویز نہ کیا تھا۔ اسکے لئے زیادہ سے زیادہ مسلم انڈیا کا لفظ سامنے آیا تھا۔

چوہدری رحمت علی جو دو قومی نظریئے کے قائل اور اسلام کی بنیاد پر الگ مملکت کے خواہاں تھے۔ انہوں نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر ۱۹۳۳ء میں ایک انگریزی پمفلٹ بعنوان NOW OR NEVER (اب یا پھر کبھی نہیں) شائع کیا اور اسکے ذریعہ بتایا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ ان کی تاریخ، روایات، تہذیب، ثقافت، قوانین غرض کہ ہر چیز الگ ہے اسلئے مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ شمال مغربی ہند میں، پنجاب۔ سندھ سرحد۔ بلوچستان اور کشمیر پر مشتمل ایک الگ مملکت بنا لیں۔ جسکا نام انہوں نے پہلی دفعہ

"پاکستان"

تجویز کیا۔ یعنی "پ" سے پنجاب، "الف" سے افغانیہ سرحدی علاقہ، "ک" سے کشمیر، "س" سے سندھ اور "ستان" سے بلوچستان۔ اسی طرح بنگال کے لئے بانگِ اسلام اور حیدر آباد دکن کے لئے عثمانستان نام تجویز کیا گیا۔ اسطرح ۱۹۳۳ء کے بعد پہلی دفعہ لفظ پاکستان ڈکشنریوں اور لغاتوں میں داخل ہوا۔ اپنی موزونیت اور جامعیت کی بناء پر اسی طرح بہت جلد زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔ جسطرح پروفیسر اصغر سودائی کے ترانہ کا یہ شعر ؎

پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

پاکستان کا بنیادی پتھر بنا۔

(۱۵)

تحریکِ قائدِ اعظمؒ

نظریۂ پاکستان کا تصوّر دو سو سال کی مسافت طے کرنے کے بعد لاہور پہنچا اور ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو معمارِ پاکستان حضرت قائدِ اعظمؒ نے، اقبال پارک لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے، اس نظریہ کی اہمیت بتلائی۔ اور پہلی مرتبہ بنگال۔ پنجاب۔ صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان پر مشتمل پاکستان بنانے کی تجویز پیش کی۔ جسکی بنیاد پر دوسرے روز یعنی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو شیرِ بنگال مولوی فضل حق وزیرِ اعظم بنگال نے باضابطہ طور پر قرارداد پاکستان پیش کی۔ جسکی چوہدری خلیق الزمان، مولانا ظفر علی خان، سردار اورنگ زیب خان سر حاجی عبداللہ ہارون۔ نواب محمد اسماعیل خان۔ مسٹر آئی۔ آئی۔ چندریگر اور قاضی محمد عیسیٰ وغیرہ نے تائید کی۔ اور لیگ کے کھلے اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی جو قرارداد لاہور کے نام سے مشہور ہوئی۔

پاکستان کے جس نظریہ کو اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہیں دو سو سال لگ گئے اسے

عملی جامہ پہنانے میں معمار پاکستان قائدِاعظم اور ان کے رفقائے کار ارباب مسلم لیگ کو زائد از سات سال کا عرصہ لگا۔ تب جا کر ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو اس خواب کی تعبیر سامنے آئی۔ لیکن جن کو یہ خدا داد نعمت ملی۔ وہ چونکہ اس کے اہلِ ثابت نہ ہوئے۔ اس لئے ان کو اس کے نصف حصہ سے محروم کر دیا گیا اور بطور آزمائش بقیہ نصف باقی رہنے دیا گیا۔ اگر ہم بھی اس کے بنیادی مقاصد کو پورا نہ کر سکے۔ تو پھر ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔



(حصہ دوم)

معمارانِ پاکستان

جن کی زندگی کے تابندہ نقوش اہل پاکستان کے
لئے نشانِ راہ کی حیثیت
رکھتے ہیں۔

طائفۂ حق

"یہی وہ لوگ تھے جو ظلمت وجہل اور جبر و قہر کے خلاف پہاڑوں کی طرح ڈٹ گئے اور بڑے بڑے آمروں کی سپاہِ قاہرہ، ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ دے سکیں۔ جسے حق سمجھا، اسے برملا کیا۔ جسے کفر وطغیان اور غلط سمجھا۔ اسے مٹا کر چھوڑا۔ ان اللہ کے شیروں کی جوانمردی، کو منافقت، دجل و فریب۔ مجرمانہ خاموشی، عافیت کوشی۔ بزدلی اور کسی قسم کا خوف اور بیم جان اظہار حق سے باز نہ رکھ سکا۔ دراصل اسی دلیری اور بہادری میں رضائے حق اور بقائے دوام پوشیدہ ہے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(ماخوذ)

(۱)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح

مقصد حیات

مغلوں کی حکومت کے دوران ہی اسلام کے نام لیواؤں کو ہندوانہ رسم و رواج سے آزاد کرانے کا کام شروع ہوگیا تھا۔ اس تحریک کا آغاز حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ آپ کی اصلاحی تحریک مسلمانوں کے دورِ عروج میں شروع ہوئی اور اسکے ذریعہ زیادہ تر ان خرابیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی وجہ سے معرض وجود میں آگئی تھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رح کے انتقال کے قریباً اسّی سال بعد حضرت شاہ ولی اللہ رح دہلی میں پیدا ہوئے۔ جبکہ ابھی شہنشاہ اورنگ زیب برسراقتدار تھے۔ مگر شاہ ولی اللہ کی پیدائش کے چار سال بعد آپ کا انتقال ہوگیا اور اسکے چند سال بعد مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ہونے شروع ہو گئے۔ ملک بدامنی کا شکار ہوگیا۔ مرہٹے تختِ دہلی پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے لگے۔ مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی حالت بھی روز بروز دگرگوں ہوتی گئی۔ اسلیئے شاہ ولی اللہ نے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس امر کی تحریک شروع کی کہ مسلمان باہم متحد ہو جائیں۔ ان کی پھر سے ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم ہو جائے۔ ان کی اخلاقی کمزوریاں دور ہو جائیں اور وہ غیر اسلامی رسم و رواج کو چھوڑ کر صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں۔

سکھا شاہی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا دَور بڑا پُرآشوب دَور تھا۔ طاغوتی قوتوں نے چاروں طرف سے مسلمانوں کو گھیر رکھا تھا۔ شمالی مغربی علاقوں میں سکھوں نے قیامت مچا رکھی تھی۔ گورو گوبند کا جانشین بندا بیراگی اور اسکے چیلے اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں قابو پاتے۔ چڑھ دوڑتے اور جو کوئی ان کے ہاتھ چڑھ جاتا۔ خواہ وہ بچہ ہو، جوان ہو یا بوڑھا۔ اسے شہید کر دیتے۔ یہانتک کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچے نکال کر مار ڈالتے تھے۔ تاکہ مسلمانوں کا تخم تک باقی نہ رہے۔ یہ سکھ مسلمانوں

کو باآواز بلند بانگ نہیں دینے دیتے تھے۔ مسجدوں پر قبضہ کر کے انکو گوردواروں میں بدل دیتے تھے۔ ان کی قساوت قلبی کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کو پرندوں کی طرح آہنی پنجروں میں بند کر کے آگ جلا دیتے تھے اور اسطرح انہیں تڑپا تڑپا کر مار دیتے تھے۔ اس وقت کی اسلامی حکومت اسکی دار و گیر کی کوشش کرتی۔ لیکن یہ شاہی فوج کا سامنا کرنے سے کتراتا اور گوریلوں کی طرح چھپ چھپا کر مسلمان علاقوں میں لوٹ مار۔ رہزنی۔ قتل و غارت۔ مقبروں اور مسجدوں کو تباہ و برباد کرتا رہتا۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ کا جوانی کا زمانہ تھا۔ پنجاب کی طرف سے سکھا شاہی کی جو آندھی اٹھی تھی۔ اس میں آپ مسلمانوں کے بھیانک مستقبل کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

مرہٹہ گردی

اورنگ زیب عالمگیر پچیس ۲۵ سال تک جنوبی ہند میں مرہٹوں کی گوشمالی کرتا رہا لیکن خود غرض۔ مفاد پرست امراء مرہٹوں سے ساز باز کی وجہ سے عالمگیر کی کوششوں کو ناکام کر دیتے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں کو صرف دکن اور کوکن کے علاقوں میں ہی نہیں، ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں کو پامال کرنے کی جرأت پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اب خود دلّی پر حملے کرنے لگے تھے اور حکومت وقت اب ان کے حملوں کی روک تھام سے قریباً عاجز آ گئی تھی۔ "برگی" مرہٹہ غارت گروں کا کپکپا دینے والا نام تھا جو اکثر صوبوں کو پامال کر رہا تھا۔ اگرچہ جنوبی ہند کی مسلم کُش تحریک کے بانی سیواجی تھے۔ لیکن بعد ازاں مرہٹوں کی لیڈر شپ کوکن کے برہمن بالاجی المعروف پیشوا کے ہاتھ آ گئی۔ جو تمام روئے زمین کے مالک بن جانا چاہتے تھے۔ مرہٹے ہوں یا کوکنی برہمن، دونوں کی غرض یہ تھی کہ:۔

"جہاں ان کو قابو حاصل ہو جائے۔ وہاں خدا کی ساری مخلوق کے ذرائع معاش بند کر کے ان کو اپنی طرف سمیٹ لیں۔ زمینداری۔ مقدمی۔ پٹواری تک کا کام انہوں نے سنبھال لیا۔ یہ جہاں کہیں آبادی دیکھتے۔ اسے لوٹ کر جلا دیتے اور اس کا نام و نشان مٹا دیتے"۔

اگر حضرت شاہ ولی اللہ ایسے نازک وقت میں اسلام کے تحفظ کے لئے حرکت میں نہ آتے تو مرہٹوں

کا تیار کردہ اعلان کہ :۔

"اب ممالک ہند کی شہنشاہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے"۔

حقیقت بن کر سامنے آجاتا۔ اسوقت کا نقشہ طبا طبائی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :۔

"نجیب الدولہ اور ہندوستان کے مختلف راجواڑے مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں جان بلب ہو کر دیکھنے لگے کہ ان کی حکومت، ان کے ہاتھوں نکل کر مرہٹوں کے قبضہ میں جارہی ہے"۔

غرض کہ بقول مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی :۔

"ایک طرف پنجاب سے سکھوں کا فتنہ تھا جو بڑھتے ہوئے بادل کی طرح مسلمانوں پر چھاتا چلا جاتا تھا۔ اور بیدردی سے بجائے پانی کے، ان پر آگ برسا رہا تھا۔ اور دوسری طرف جنوبی ہند کا عرصۂ سیلاب تھا۔ جس میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک مسلمان اپنے بہنے اور ڈوبنے کا نظارہ کر رہے تھے"۔

اندرونی حالت

ایسا صرف اسلئے ہو رہا تھا کہ مسلمان اب کمال کی منزل سے گزر کر زوال کی جانب گامزن تھے۔ اسوقت ان کی حالت یہ تھی :۔

"اسلامی شعائر سے منحرف ہو کر ایرانی اور تورانی لبادہ اوڑھ کر ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ نام نہاد علماء، فتنہ و فساد برپا کرنے میں پیش پیش تھے اور مسلمانوں میں فرقہ واری اختلافات پیدا کر کے متخاصم گروہ تیار کر رہے تھے۔ کتاب و سنت اور حدیث و فقہ کے مسائل پر تیز و تند بحثیں تلخی و عداوت پیدا کر دیتی تھیں اور اکھاڑہ نما مناظروں کا نتیجہ ہاتھا پائی کی شکل میں نکلتا تھا۔ یہ علماء صرف اس بات پر متفق تھے کہ عوام کو جاہل اور اسلامی تعلیمات سے غافل رکھا جائے۔ تاکہ ان کی مذہبی اجارہ داری باقی رہے"۔

(مسلمانوں کے سیاسی افکار صہ ۲۶۱)

اصلاحی اقدام اسلئے قانون قدرت کے تحت جب زمین پر فتنہ و فساد بڑھ جاتا ہے تو اس وقت کوئی نہ کوئی مصلح۔ رہبر اور ہادی بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی جلسہ۔ کانفرنس یا کنونیشن نہیں بلاتا۔ لچھے دار جذباتی تقریر کرکے عوام کا دل نہیں بہلاتا۔ آنسوؤں کے سیلاب بہاکر عوامی ہمدردیاں حاصل نہیں کرتا قوم کے سامنے بے سروپا منصوبے اور بے کار تجویزیں نہیں رکھتا۔ پریس کانفرنسیں نہیں کرتا۔ اخباری بیان جاری نہیں کرتا۔ باتیں نہیں بناتا۔ اپنے مجدد یا ولی ہونے کا اعلان نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اپنے کردار کی روشنی میں عوام و خواص کو صراط مستقیم دکھاتا اور ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس دَور کا اوپر نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اسکے ہادی اور مہدی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تھے۔ جنہوں نے اپنے زورِ قلم سے سلاطینِ اسلام پر واضح کیا کہ:۔

"مشیتِ ایزدی چاہتی ہے کہ تمام تلواریں کھینچ لو اور اسوقت تک نیام میں داخل نہ کرو۔ جب تک مسلم، مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہلِ کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جاکر شامل نہ ہو جائیں اور ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے۔ جسکی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں"۔

آپ نے امراء وارکانِ دولت کو برملا کہا کہ:۔

"تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ دنیا فانی کی لذتوں میں ڈوبے جا رہے ہو۔ جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے۔ ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ بعض، بعض کو کھاتے اور نگلتے جائیں اور تم محلوں میں بیٹھ کر جوا کھیلتے رہو، شرابیں پیتے رہو اور زنا کرتے رہو تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو۔ اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے ہیں؟"

آپ نے فوجی سپاہیوں کو للکارا کہ:۔

"تمہیں اللہ نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا۔ تاکہ اللہ کی بات اونچی ہو اور خدا کا کلمہ بلند ہو۔ شر اور اسکی تمام جڑوں کو تم دنیا سے نکال دو۔ لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے۔ اسے تم چھوڑ بیٹھے۔ جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو۔"

عام پیشہ وروں یعنی اہلِ صنعت و حرفت کو بتلایا کہ:۔

"امانت و دیانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے۔ تم اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہو۔ تم اپنے فرضی معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو اور حصولِ رزق کے لئے غلط راستے اختیار کر رہے ہو۔"

اسی طرح آپ نے فرداً فرداً ابن زمانہ کے طالب علموں۔ واعظوں۔ زاہدوں۔ سجادہ نشینوں پیرزادوں۔ غلط کار مولویوں کو ان کی گمراہیوں کی طرف متوجہ کیا اور عامۃ المسلمین کو آگاہ کیا کہ:۔

"تمہارے اخلاق سو چکے ہیں۔ تم پر بے جا حرص و آز سوار ہے۔ تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے۔ عورتیں مردوں پر سوار ہیں۔ مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا ہے اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے۔"

(تفہیماتِ الٰہیہ)

دعوتِ جہاد

ان خرابیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ وہ اصلاح کی صورت بھی تبلاتے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے جدا کر دو۔ تاکہ ملک کی اندرونی فضا پاکیزہ ہو جائے اور کفار کے مقابلہ کے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ان اصلاحی اقدامات کے ساتھ ساتھ آپ نے سکھوں کی یلغار اور مرہٹوں کے سیلاب کو روکنے کے لئے نجیب الدولہ اور غازی احمد شاہ ابدالی کو امداد و اعانت کیلئے خط پر خط لکھے کہ:۔

"یہاں مسلمانوں کی حالت قابل رحم ہے۔ اسوقت جو عمل و دخل سرکاری بادشاہی میں باقی ہے۔ وہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ مستعد کارکن ان کے سوا کوئی نہیں۔ ہر قسم کی دولت و ثروت ان کے گھروں میں ہے۔ افلاس و مصیبت کا بادل مسلمانوں پر

چھایا ہوا ہے ...... قوم مرہٹہ کا فتنہ ہندوستان کے اندر بہت بڑا فتنہ ہے، رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر ہوتی گئی اور اکثر بلاد اسلام ان کے قبضہ میں آگئے۔ اب یہ تمام ہندوستان پر اثر انداز ہے ..... قوم مرہٹہ کو شکست دینا آسان کام ہے۔ بشرطیکہ غازیان اسلام کمر ہمت باندھ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم مرہٹہ خود قلیل ہے۔ لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس گروہ میں سے ایک صف کو بھی درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی۔"

اس بوریہ نشین محدث کی نظر صرف مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر ہی نہ تھی۔ حکومت کے خزانہ پر بھی تھی۔ آپ نے اپنے خط میں ہندوستان کی مالیاتی تفصیل بھی لکھی تاکہ احمد شاہ ابدالی پر اس مہم کی اہمیت واضح ہو جائے۔ آپ نے لکھا کہ:-

"ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں بشرطیکہ غلبہ و شوکت موجود ہو۔ ورنہ ایک کوڑی بھی ملنی مشکل ہے۔ جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں۔ وہ ایک کروڑ روپیہ محصول کی جگہ ہے۔ راجپوتانہ کا علاقہ اپنی وسعت کے اعتبار سے دو کروڑ روپے سے کم آمدنی کا نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہر راجہ پر خراج مقرر کیا جائے۔ بنگالہ سے ہر سال ایک کروڑ کی آمدنی تھی۔ صوبہ اودھ سے دو کروڑ وصول ہوتا تھا۔ ایک کروڑ خرچ ہوتا تھا اور ایک کروڑ بچ رہتا تھا۔"

آگے چل کر اسی خط میں آپ استدعا کرتے ہیں کہ:-

"اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار و شوکت ہو۔ اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو۔ پھر دور اندیش بھی ہو اور جنگ آزما بھی! سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔ یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے کہ ہندوستان کا قصد کریں اور مرہٹوں کا تسلط توڑ دیں اور کمزور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرائیں۔ اگر کفر کا غلبہ معاذ اللہ اسی طرح رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا

ہی عرصہ نہ گزرنے پائے گا کہ مسلمان قوم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔
سلطنت دہلی بچوں کا کھیل بن گئی ہے۔ پناہ بخدا اگر قوم کفار اسی حالت پر رہی اور مسلمان ضعیف ہوتے گئے تو اسلام کا بھی نام کہیں باقی نہ رہے گا... پس واجب ہے کہ ان مجاہدات میں تقویت اسلام کی نیت کرلی جائے۔ جب افواج قاہرہ ایسے مقام پر پہنچیں جہاں پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں رہتے ہوں۔ چاہیئے کہ منتظمین کو خاص طور پر ہدایت کردی جائے کہ کسی مسلمان کا مال نہ لوٹا جائے اور نہ کسی کی عزت میں فرق آئے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے نزدیک تمام دنیا کا زوال قتلِ مسلم کے مقابلہ میں ہیچ ہے"۔

(احمد شاہ ابدالی شائع کردہ یوم احمد شاہ ابدالی کمیٹی ملتان)

عین اسوقت جب حضرت شاہ صاحب احمد شاہ ابدالی سب کو خطوط لکھ رہے تھے۔ مرہٹوں کے سردار بھاؤ ایک بت تیار کرا رہا تھا اور کہتا تھا کہ جب وشواس راؤ دہلی کے تخت پر بیٹھے گا تو اس وقت یہ بت دہلی کی مسجد میں نصب کیا جائے گا اور اس مسجد کو ہندوؤں کا معبد بنایا جائے گا۔

شاہ ولی اللہ کم و بیش اسی نوعیت کے خطوط نجیب الدولہ کو لکھتے رہے کہ جب تک مرہٹوں۔ جاٹوں اور سکھوں کے فتنے ختم نہ کئے جائیں۔ شاہان اسلام اور عوام و خواص کو چین کی زندگی نصیب نہیں ہوسکتی۔ مثلاً ان کے نام ایک خط میں یہاں تک لکھا کہ:-

"ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں۔ خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے کئی بار صدمات دیکھے ہیں اور کئی بار لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں۔ خنجر ہڈی تک پہنچ چکا ہے۔ رحم کا مقام ہے۔ خدا اور اسکے رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں۔ اگر اس بات کا خیال رکھا تو امید یہ ہے کہ فتوحات کے دروازے پے درپے کھلتے چلے جائیں گے۔ اگر اس امر سے تغافل

برتا گیا تو میں ڈرتا ہوں کہ آہ مظلوماں سدِ راہ مقصود نہ بن جائے"۔

پورے ہندوستان میں یہ صرف شاہ ولی اللہ کی ذات گرامی تھی۔ جو مسلمانوں کی حالتِ زار اور اسلام کی کس مپرسی پر بے تاب ہو رہی تھی۔ بے قرار ہو رہی تھی۔ ہر ایک جو اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔ اسے جگا رہی تھی۔ اٹھا رہی تھی۔ واسطے دی رہی تھی اور اسکے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی سمجھا رہی تھی کہ:۔

"عنقریب تم اللہ کے پاس واپس جاؤ گے۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا۔ جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ اسلئے اپنے فرائض کو صحیح طور پر ادا کرو۔ دل میں جہاد کا ولولہ پیدا کرو۔ شرعی قوانین کے مطابق باہمی معاملات کا فیصلہ کرو۔ تاکہ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکو۔ لوگوں پر زیادتیوں اور ظلم سے بچو۔ نماز کو خوب زور سے پکڑ لو۔ صالحین کا لباس اور وضع اختیار کرو۔ حرص مت کرو۔ اتنی روزی پر قناعت کرو جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے اور صبح و شام تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو اور جہنم کی آگ سے ڈرو۔ خبردار۔ خبردار۔ ہرگز ہرگز اسکی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو کیا تمہارے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں کہ:۔

"یہ میری سیدھی راہ ہے۔ تم اس پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو۔ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گی"۔

کرامت ولی اللہی

آپ کے ان ارشادات عالیہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ ہندوستان میں صحیح معنوں میں نہ صرف پاکستان بنانے کے لئے زمین ہموار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ بلکہ وہ اپنی ایمانی فراست سے "پاکستان" میں بسنے والوں کو بھی ان ہدایات سے نواز رہے تھے۔ جن کو عملی جامہ پہنانے سے پاکستان زندہ و پائندہ رہ سکتا ہے۔ شاہ صاحب نے صرف یہی ہدایات جاری کرنے اور خطوط لکھنے پر ہی بس نہ کی بلکہ خود التجابن

کر درِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر انور پاشا کی طرح پہنچے اور حالی کی زبان میں دہائی دی کہ امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے۔ تو آپ کو مدینہ منورہ میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست اس بشارت کا مژدہ سنایا:۔

ان مراد الحق فیک ان یجمع شملا من شمل الامۃ المرحومۃ بک (فیوض ص ۶۲)

تمہارے متعلق خدا کا ارادہ ہوچکا ہے کہ امت مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعہ سے کی جائے۔

بقول مولانا مناظر احسن گیلانی:۔

"یہ ہندوستان ہی کی امتِ مرحومہ تھی۔ جس کی پراگندگیوں کی تنظیم کا کام ایک خاص الٰہی تدبیر سے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت کے دودمان اور "ذرّیاتِ طیبات" سے لیا گیا"

آپ کے صرف خطوط پر احمد شاہ ابدالی دوڑتا چلا آیا اور عین اس وقت مدد کو پہنچا۔ جب بالاجی پیشوا مرہٹوں کا بادشاہ بن کر یہ اعلان کرنے والا تھا کہ:۔

"اب ممالک ہند کی شاہنشہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے"

احمد شاہ ابدالی، غضب الٰہی کی صورت میں مرہٹوں پر پانی پت کے میدان میں اس شدت سے آگ کی طرح برسا کہ بقول طباطبائی صرف دو تین آدمیوں کے سوا دشمن کے نامور سرداروں میں سے کوئی بھی اپنی جان بچاکر نہ بھاگ سکا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ بالاجی پیشوا کا بیٹا بسواس راؤ جو مرہٹوں کا شہزادہ تھا۔ عین جوانی کے عالم میں صحرائے عدم کو لوٹا۔ خود بالاجی موت کے غصہ کا شکار ہوکر اپنے بیٹے اور بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ اور ان کے ۲۲ ہزار غلام اور لونڈیاں جن میں اکثر بڑے اور اوسط درجہ کے لوگوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابدالی کے لشکر میں تقسیم ہوئیں اور جواہر و نقد روپیہ اور دوسری قسم کی چیزیں توپخانے وغیرہ قسم کا بیشمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ پچاس ہزار گھوڑے۔ دو لاکھ بیل۔ کئی ہزار اونٹ اور پانچسو ہاتھی اس

کرہ پیکر فوج نے حاصل کئے۔

احمد شاہ ابدالی چونکہ شاہ ولی اللہ کی التجاؤں اور دعاؤں کے صدقے مامور من اللہ ہو کر آئے تھے۔ اسلئے انہوں نے امرائے سلطنت کی درخواست کے باوجود تخت ہند پر قدم رکھنے یا تاج ہند کو ہاتھ لگانے سے صاف انکار کر دیا اور ہندوستان کی اس عظیم سلطنت کو جسکے حصول کے لئے بڑے بڑے نامور تاجور خواب دیکھتے رہے۔ لٹتے اور پٹتے رہے۔ شاہ عالم کو۔ وزارت شجاع الدولہ کو اور امیر الامرائی نجیب الدولہ کے حوالے کر کے دلی کے شالا مار باغ سے گھوڑے پر بیٹھ کر قندہار کی راہ لی۔ احمد شاہ ابدالی کی یہ آمد و رفت ولی اللّٰہی کرامت تھی۔ جس نے اسلامیانِ ہند کو کفر و شرک کے سیلاب میں ڈوبنے سے بچا لیا۔ تاریخ اقوامِ عالم غازی احمد شاہ ابدالی کے اس بے مثال ایثار کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ولی اللّٰہی انفرادیت

شاہ ولی اللہ نے اپنی زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ دس سلاطین کا زمانہ پایا۔ ساداتِ بارہ کو حصولِ اقتدار کے لئے عوام و خواص پر ظلم کے پہاڑ توڑتے دیکھا۔ نادر شاہ کا حملہ، دہلی میں قتلِ عام۔ مرہٹوں کی بربریت۔ سکھوں کی سفاکیت۔ ایرانی اور تورانی اربابِ اختیار کی رسہ کشی آپ کے سامنے ہوتی رہی۔ جسکا مسلمانوں کے دین و ایمان اور عقائد و اخلاق پر بہت برا اثر پڑا۔ ان کا معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس ابتری کو بہتری میں بدلنے کے لئے آپ نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ قومی اصلاح کی مہم شروع کی۔ آپ نے متقدمین کی راہ سے ہٹ کر اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق تصنیف و تالیف کی نئی راہ اختیار کی۔ جدید علمی اور فکری زندگی کی بنیاد رکھی۔ بدعات و خرافات کا تجزیہ کر کے کتاب و سنت کی راہ نکھار دی۔ "حجۃ اللہ البالغہ" اور "البدور البازغہ" کے ذریعہ مغربی الحاد و زندقہ کے زہر کا تریاق تجویز کیا۔ متحدہ ہندوستان کے ایک ہزار سالہ اسلامی عہد میں جو کام کسی سے نہ ہو سکا۔ وہ آپ نے کیا چونکہ آپ کے عہد میں سرکاری اور عوامی زبان فارسی تھی۔ اس لئے آپ نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ موسومہ "فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن" کر کے پہلی

دفعہ عوام وخواص کو قرآن فہمی کا سنہری موقعہ دیا۔

عربی ادب وانشاء میں بھی آپ نے نئی راہیں اختیار کیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ :-

"عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھیں ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی، جو ان کا مخصوص اسلوب ہے۔ پوری پابندی کی ہے۔ شاہ صاحب نے عربی انشاء و ادب کا جو نیا قالب تیار کیا ہے۔ یہی نہیں کہ ہندوستانی مصنفین میں اسکی نظیر نہیں پائی جاتی۔ بلکہ جہاں تک میری محدود رسائی کا تعلق ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آغاز سے اس وقت تک کسی اسلامی علاقہ کے اربابِ تصنیف نے اسکو اختیار کیا ہے۔

شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں۔ جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر "صاحب الجوامع" النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ گفتگو کی پیروی کی۔ حتی الوسع وہ اسکی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاوروں میں کریں جو لسانِ نبوت اور زبانِ رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اس چیز نے ان کی کتابوں کے رنگ کو عربی زبان کے تمام دوسرے مصنفین سے ممتاز کر دیا ہے۔"

شاہ صاحب معاشرہ کے ارتقاء پر ایمان رکھتے تھے۔ اسلئے آپ نے عصری تقاضوں کے مطابق اجتماعی معاشرہ۔ مملکت کے ارتقاء۔ سلطان کے اوصاف و فرائض۔ عمال حکومت کے طرزِ عمل اور معاشیات کے اصولوں کی وضاحت کی۔ ان پر دَور جدید کے مذاق کے مطابق روشنی ڈالی اور ملت کی رہنمائی کی۔ ان سے قبل کسی مفکر یا مدبر نے ان امور کی اہمیت پر توجہ نہ دی تھی۔ اور نہ کسی کے پاس ایسے امور پر توجہ دینے کی فرصت تھی اور نہ انہوں نے کبھی اسکی ضرورت محسوس کی۔

اقتصادی اصول

آج جن معاشی اور اقتصادی مسائل کے حل کا سہرا کارل مارکس کے سر باندھا جاتا ہے۔ وہ گتھیاں حضرت شاہ ولی اللہ اسوقت سلجھا چکے تھے۔ جب ابھی کارل مارکس پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ کارل مارکس تو شاہ صاحب کی وفات کے

بھی ۵۶ سال بعد پیدا ہوا۔ اور شاہ صاحب مدتوں پہلے مندرجہ ذیل اصول اقتصادیات اپنی تصنیفات میں تحریر کر چکے تھے :۔

۱۔ دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔

۲۔ مزدور اور کاشتکار قوتِ کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون۔ مدنیت (شہریت) کی روحِ رواں ہے۔

۳۔ جوا۔ سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کئے جائیں۔ جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا اور بغیر اسکے کہ قوم و ملک کی دولت میں اضافہ ہو۔ دولت بہت سی چیزوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ جاتی ہے۔

۴۔ مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک و ملّت کے لئے دماغی کام کریں۔ وہی دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوشحالی ملک اور قوم کی ترقی و خوشحالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے۔ وہ ملک کے لئے خطرہ ہے۔ اسکو ختم ہو جانا چاہیئے۔

۵۔ جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے۔ مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے۔ قوم کا دشمن ہے۔ اسکو ختم ہونا چاہیئے۔

۶۔ ضرورت مند مزدوروں کی رضامندی قابلِ اعتبار نہیں۔ جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔

۷۔ جو پیداوار اور آمدنی تعاون باہمی کے اصول پر نہ ہو۔ وہ خلافِ قانون ہے۔

۸۔ کام کے اوقات محدود کئے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیئے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

۹۔ تعاونِ باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ لہٰذا اسکو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہیئے۔ پس جسطرح تاجروں کیلئے مناسب نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے مقابلہ سے روحِ تعاون کو نقصان پہنچائیں۔ ایسے ہی حکومت کے لئے بھی درست نہیں کہ بھاری ٹیکس

لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔

۱۰۔ وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کر دے۔ ملک کے لئے تباہ کن ہے۔

۱۱۔ وہ شاہانہ نظامِ زندگی، جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو۔ اسکا مستحق ہے کہ اسکو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے۔ اور ان کو مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع دیا جائے۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

اسی طرح آپ نے اصولِ سیاست۔ نظامِ حکومت کے بنیادی اصول۔ انسان کے بنیادی حقوق۔ بین الاقوامی تحفظات اور مذہبیات کی علیحدہ علیحدہ تنقیحات وضع کیں اور اصول تبلائے۔ یہ سب ۱۷۳۱ء کی باتیں ہیں۔ جبکہ فرانس کا مشہور انقلاب اس کے قریباً پچاس سال بعد ۱۷۸۹ء میں وقوع پذیر ہوا۔ کمیونزم کے خالق اول کارل مارکس اور اسکے ہمنوا اینگلس کی پیدائش میں ابھی ایک سو سال باقی تھے اور یورپ کے مشینی دور کا آغاز ہنوز چالیس سال دور تھا۔

صرف متحدہ ہندوستان ہی نہیں۔ پوری دنیا کے اندر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے قبل کسی نے یہ نظریات پیش نہ کئے تھے اور انکا مقصد نعوذ باللہ بے خدا کمیونزم یا سوشلزم پھیلانا نہ تھا۔ بلکہ ہر فرد بشر کو خدا اور رسول کے احکامات کے مطابق اسکا جائز حق دلانا تھا۔ اسی لئے آپ نے نظامِ حکومت کا اولین اصول یہ لکھا کہ:۔

"حاکم حقیقی اور زمین کا مالک اللہ جلشانہ ہے"۔

مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ:۔

"انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ جسکی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے عقلمندوں نے۔ اور زیادہ با اخلاق صوفیا نے سیاست سے دُور رہنے میں اپنا کمال سمجھا۔ انسانی

اخلاق اور اقتصادیات کے باہمی رشتہ اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ اسکے برعکس شاہ صاحب نے زندگی کی اس حقیقت کو اس کی صحیح شکل میں پہنچایا۔ اور بار بار اپنی کتابوں میں اسکی طرف توجہ دلائی"۔

دولت کے نفع و نقصان کی وضاحت فرمائی اور بتلایا کہ یہ دولت جہاں انسان کو طمانیتِ قلب بخشتی ہے۔ اسے بے کسی سے مامون و مصئون رکھتی ہے۔ وہاں یہی دولت بغض و عناد کا بیج بھی بوتی ہے۔ لوگوں کو لوٹ مار پر آمادہ کرتی ہے۔ ظلم و ستم کے دروازے کھول دیتی ہے۔ آخرت سے غافل بنا دیتی ہے اور جو معاشرہ زر پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ بالآخر تباہی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد "حیات ولی" کی رو سے ۵۱ تھی۔ جن کے ذریعہ آپ نے اصلاح معاشرہ اور خرافات و بدعات کو کتاب و سنت سے الگ کرنے کا کام لیا جسکی توفیق آپ کو فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد نصیب ہوئی۔ اور رد بدعات کے متعلق آپ کی تصنیفات مغل دربار کے آخری امیر نجف علی خان کو ناگوار گزریں اور اس نے اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں آپ کے پنجے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے تاکہ آپ ائندہ کوئی کتاب یا مضمون تحریر نہ کر سکیں۔ کیونکہ :-

ع نازک مزاج شاہاں تابِ سخن نہ دارند

اور آپ کے خاندان پر ایسے مظالم ڈھائے۔ جنہوں نے کربلائی مصائب کی یاد تازہ کر دی۔

تعلیم و تعلم مصلح اعظم حضرت شاہ ولی اللہؒ نے عہد عالمگیری کے آخری ایام میں ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو سرزمینِ ہند پر قدم رکھا۔ پانچ سال کی عمر میں آپکے والد ماجد شاہ عبدالرحیم نے خود آپکو پڑھانا شروع کیا۔ دو سال کے اندر آپ نے قرآن مجید ختم کر لیا۔ اور دس سال کے قلیل عرصہ میں معقولات اور منقولات پر پوری دستگاہ حاصل کر لی اور آپ کو حدیث۔ تفسیر فقہ۔ معانی۔ کلام۔ ادب۔ فلسفہ۔ منطق۔ طب۔ ہئیت اور ریاضی میں مہارت تامہ حاصل ہو گئی

علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی بھی حاصل کرتے رہے اور پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہاتھ پر بسلسلہ نقشبندی بیعت ہوئے۔ اسطرح آپ کے والد ماجد ہی آپ کے استاد اور مرشد تھے۔

اتنی تعلیم کے باوجود مدینہ منورہ میں آپ نے اپنے استاد سے یہ فرمایا کہ:۔

"جو کچھ میں نے پڑھا تھا۔ سب کچھ بھلا دیا بجز علم دین یعنی علم حدیث کے"

(ملفوظات عزیزیہ)

اسی علم حدیث کی بدولت آپ نے متحدہ ہندوستان کو ایسا بام رفعت پر پہنچایا کہ دوسرا کوئی اسلامی ملک اسکی ہمسری نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ الازہر کے ہم وطن، مشہور ناقد و بصیر عالم رشید رضا مصری کو اعتراف کرنا پڑا کہ:۔

"اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا ہونے کا فیصلہ ہو چکا تھا"۔

آپ کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:۔

"میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے۔ چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل کی تھی" (ملفوظات عزیزیہ ص ۹۳)

شاہ صاحب کی ذکاوت و ذہانت کی ان کے استاد حدیث علامہ طاہر بن ابراہیم کردی نے ان الفاظ میں داد دی تھی کہ:۔

"مجھ سے وہ لفظوں کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے حدیث کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں"۔

آپ کے پسر حضرت شاہ عبدالعزیز کا بھی یہی ارشاد ہے:۔

مثلِ والد ماجد، شخصے کم نظر آید۔

نیز کہ:۔ مثل والد ماجد حافظہ ندیدہ ام۔

آجکل ہندو پاک میں دورۂ حدیث کا جو سلسلہ رائج ہے۔ وہ حضرت شاہ صاحب کی بدولت

قائم و دائم چلا آرہا ہے۔

دارالحدیث

قدرت کا یہ خوب انتظام ہے کہ جہاں بدعات و خرافات کا زور ہوتا ہے۔ وہیں مصلحین و عارفین کا بھی ہجوم رہتا ہے۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک قول کے مطابق "صرف دلی میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد سلسلہ اور طریقہ رہتے تھے۔ ایسا اتفاق کم ہوتا ہے"۔ یہ شاید انہیں کا اثر تھا کہ محمد شاہ رنگیلا نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کو دارالحدیث قائم کرنے کے لئے، خود بلا کر ایک عالی شان مکان اندرون شہر عطا کیا۔ دلی کے پرانے کھنڈروں کے ماہر مولوی بشیرالدین کا بیان ہے کہ:-

"یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا"

اس رنگیلے کا یہ عطیہ "غدر" تک قائم رہا۔ بدوران غدر اس کے کڑی۔ تختے تک لوگ اٹھا کر لے گئے بعد ازاں یہ جگہ آباد ہونے پر محلہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہوئی۔

صدقہ جاریہ

اس دنیائے فانی میں ساٹھ سال گزارنے کے بعد آپ ۱۷۶۳ء میں دارالبقا کو سدھار گئے۔ لیکن ایسی بیش بہا تعلیمات بصورت تصنیفات چھوڑ گئے۔ جو قیامت تک نشانِ راہ کا کام دیتی رہیں گی۔

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:-

"اس تاریک زمانے میں نشو و نما پاکر شاہ ولی اللہ ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے۔ جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ اور ایسا لٹریچر چھوڑ جاتا ہے۔ جس کی زبان۔ اندازِ بیان، خیالات نظریات مواد تحقیق اور نتائج مستخرجہ، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں

اس جگہ لکھی گئی تھیں۔ جس کے گرد و پیش عیاشی۔ نفس پرستی، قتل و غارت۔ جبر و تشدد
بدامنی، طوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔"

(اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص۴۴)

آپ صرف تصنیفات و تالیفات کا خزانہ ہی نہ چھوڑ گئے۔ ایسی اولاد بھی چھوڑ گئے جو صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ تا ۱۸۲۳) عربی و فارسی کے بڑے انشاء پرداز تھے اور ساٹھ سال تک علومِ دین و احادیث کی تعلیم دیتے رہے اور عیسائی مشنریوں سے بحث و مباحثے کرتے رہے۔ آپ کے دوسرے فرزند شاہ محمد رفیع الدین (۱۷۵۰ تا ۱۸۱۸) تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ آپ کے تیسرے صاحبزادے شاہ عبدالقادر (۱۱۶۷ھ تا ۱۲۳۰ھ) تھے۔ جنہوں نے قرآن مجید کی اردو تفسیر موضح القرآن لکھی۔ جو بہت مقبول ہوئی۔ جس سے مسلمانوں کو قرآن فہمی میں آسانی ہوئی۔ یہ سب حضرات اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے۔ اور مسلمانوں کے بہت بڑے محسن!

(۲)

شاہ اسماعیل شہیدؒ

صورتِ حال

اسلامی دنیا پر اٹھارویں صدی عیسوی کی آخری تہائی میں ذلت و پستی۔ نفاق و افتراق کا دَور شروع ہوا۔ وہ غیر مسلم قومیں جو اسلام کے حصارِ عافیت میں امن و امان کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اپنی غلامی کا انتقام لینے کے لئے پورے عالم اسلام کو اپنا غلام بنانے میں مشغول تھیں۔ ہندوستان میں بھی سلطنتِ مغلیہ کا چراغ بجھ چکا تھا۔ فرنگیوں کا آفتابِ اقتدار طلوع ہو چکا تھا۔ ان کی حکومت کی نہ صرف داغ بیل پڑ چکی تھی۔ بلکہ وہ سرطان کی طرح ہندوستان میں پھیل رہی تھی۔ ہندو اس کے معین و معاون بن چکے تھے۔ علمائِ سوء بدعات و خرافات پھیلانے کے لئے خریدے جا چکے تھے۔ کلمۂ حق کہنے والا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ تشتت وافتراق کی خلیج روز بروز وسیع ہو رہی تھی اور زوال و انحطاط کی منزل قریب آ رہی تھی۔ جسکی وجہ سے ہر مسلمان مایوسی و ناامیدی کا شکار تھا۔ یا عیش و عشرت میں مبتلا تھا۔ اور اسلام کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ شمع اسلام کے بجھنے کا ہر کس و ناکس کو یقین ہو گیا۔ اس وقت مسلمان تو اسلام کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ مگر اسلام نے مسلمانوں کی مدد کی کیونکہ حق تعالیٰ نے اسلام کی شمع کو روشن رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا رہبر اور رہنما بھیج دیا۔ جس نے مسلمانوں کو جہل کی تاریکی اور خود غرضی کی دلدل سے باہر نکالا اور انہیں پھر سے بدعات و خرافات سے نکال کر صراط مستقیم پر گامزن کر دیا۔

ولادت باسعادت

انہی نفوسِ قدسیہ میں ایک حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی بھی تھی۔ آپ ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء کو دہلی کے گہوارہ علم و عرفان میں پیدا ہوئے۔ آپ ہندوستان کے نامور ولی اللّٰہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یعنی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے۔ شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی کے بھتیجے اور شاہ عبدالغنی کے صاحبزادے تھے۔ اور اسی گھرانے میں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین ایسے جیّد علماء بھی موجود تھے۔ غرض کہ آپ جس خاندان میں پیدا ہوئے وہ علمی لحاظ سے اس وقت نوراً علیٰ نور تھا۔ ان بزرگانِ دین کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور حضرت سید احمد شہید جیسے پیر کامل کے فیضِ نظر نے انہیں اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔

تعلیم و تربیت

آپ نے اپنی خداداد ذہانت و فطانت سے بہت جلد دینی علوم کے علاوہ فلسفہ۔ حکمت ریاضی اور جغرافیہ میں کمال حاصل کر لیا۔ آپ کا حافظہ بہت تیز تھا۔ ایک بار جو کتاب پڑھ لیتے۔ وہ ازبر یاد ہو جاتی۔ اسے دہرانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ان علوم کے علاوہ آپ نے دیگر فنون مثلاً اسپ سواری۔ تلوار زنی۔ نیزہ بازی۔ نشانہ بازی۔ کشتی رانی وغیرہ میں بھی دستگاہ حاصل کر لی۔ آپ گھنٹوں دریائے جمنا میں تیرتے رہتے۔ بسا اوقات دہلی سے تیر کر آگرہ تک چلے جاتے اور پھر آگرہ سے پیر کر دہلی آجاتے اور لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے۔

جفاکشی کے میدان میں بھی آپ کا دور دور تک جواب نہ تھا۔ کڑکتی دھوپ میں مسجد کے فرش پر گھنٹوں ننگے پاؤں پھرتے رہتے۔ یا تپتی ہوئی زمین پر پہروں چہل قدمی کرتے رہتے۔ یا گھنٹوں دھوپ یا سردی میں بیٹھے رہتے۔ ایک ایک سانس میں آٹھ آٹھ دس میل دور نکل جاتے۔ جاگنے پر آتے تو مسلسل آٹھ آٹھ اور دس دس راتیں نہ سوتے اور جاگ کر یہ راتیں گزار دیتے۔ یہاں تک کہ کئی کئی دن بھوکے پیاسے رہتے اور اپنے نفس کو نہ سرکش ہونے دیتے۔ نہ خواہشات کو غالب آنے دیتے۔ بلکہ آپ اپنی مشقت۔ ریاضت۔ اور جفاکشی کے ذریعہ اپنے جسم کے گوشت پوست تک کو اپنا مطیع و فرمانبردار رکھتے اور کسی تکلیف مصیبت سے نہ پریشان ہوتے اور نہ رنج و غم و الم کو قریب آنے دیتے۔

دعوت وارشاد

آپ جب تبلیغ وارشاد کے لیے میدانِ عمل میں نکلے تو اس وقت شرک و بدعات کا دَور دورہ تھا۔ حکمران طبقہ نے مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کی عظمت اور ایمان کی قوت اور جہاد کی اہمیت جتانے کے لئے علمار سو کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ جنھوں نے رفع یدین۔ آمین بالجبر۔ ایمان بالغیب ایسے مسائل میں مسلمانوں کو الجھا رکھا تھا۔ انہیں غیراللہ کا پرستار بنا رکھا تھا اور خود اسلام کے اجارہ دار بنے بیٹھے تھے۔ آپ نے برسرِ منبر آتے ہی اعلان کیا کہ:۔

”آدمی سارے اللہ کے بندے ہیں۔ اور بندہ کا کام بندگی ہے۔ جو بندہ بندگی نہ کرے۔ وہ بندہ نہیں۔ اصل بندگی ایمان کا درست کرنا ہے۔ جس کے ایمان میں کوئی خلل ہے۔ اس کی کوئی بندگی قبول نہیں۔ اور جس کا ایمان سیدھا ہے۔ اس کی تھوڑی بندگی بھی بہت ہے۔ اسلئے ہر آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنا ایمان درست کرنے کی فکر کرے“

اس زمانہ میں علمار سور نے اپنے آقایانِ ولی نعمت کے اشارۂ چشم وابرو پر مسلمانوں کو یوں گمراہ کر رکھا تھا کہ اللہ اور رسول کا کلام سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ ہم میں وہ طاقت کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں۔ اس کلام کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا یہ بزرگوں کا کام ہے۔ آپ نے اس دجل وفریب کا تار و پود بکھیرتے ہوئے اعلان فرمایا کہ:۔

”آجکل لوگ دین کی باتوں سے کنی کتراتے ہیں اور رسم و رواج کی پابندی کرتے ہیں اور مولویوں کی باتوں کو سند پکڑتے ہیں۔ جو محض ان کی دماغ کی اختراع ہوتی ہیں۔ اسلئے دین کے معاملہ میں اپنی عقل کو دخل نہ دو۔ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے کہ قرآن آسان ہے۔ اس کے احکام واضح ہیں۔ ان کا سمجھنا مشکل نہیں البتہ اس پر چلنا نفس کو گوارہ نہیں اور نہ قرآن کو سمجھنے کے لئے بہت بڑے علم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اللہ اور رسول کا کلام تو ناوانوں کو راہ بتانے، جاہلوں کو سمجھانے اور

بے علموں کو علم سکھانے کے لئے ہے۔ جیساکہ سورہ جمعہ میں آیا ہے۔ اسلئے جو کوئی بہت جاہل ہے۔ اسکو اللہ و رسول کے کلام کو سمجھنے کی کوشش اور رغبت کرنی چاہیئے اور جو بہت گنہگار ہیں ان کو اللہ و رسول کی راہ میں چلنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اور غیر اللہ سے لاتعلق ہو جانا چاہیئے۔"

آپ کے مواعظِ حسنہ سے بدعات و رسومات و خرافات کی دکانیں سرد پڑ گئیں۔ شرک کے بادل چھٹنے لگے توحید کا ڈنکا بجنے لگا اور علماء سوء کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ اسلئے انہوں نے اپنے ارباب من دون اللہ کے پاس حضرت اسماعیل شہید کی چغلیاں کھانی شروع کر دیں اور دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ نے ایک حکمنامہ کے ذریعہ شاہ صاحب پر پابندی لگا دی کہ آئندہ کے لئے وہ وعظ کرنے سے باز رہیں۔ شاہ صاحب کو تقریر کے علاوہ تحریر کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ آپ نے اس حکمنامہ کی غلطیاں اور خرابیاں تحریر کر کے ریذیڈنٹ کو بھجوا دیں۔ جن کا اس انگریز ریذیڈنٹ کو اعتراف کرنا پڑا۔ اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ علماء سوء کو منہ کی کھانی پڑی اور اہل نظر اسے تائید ایزدی پر محمول کرنے لگے۔

اصلاحِ شاہ

وہ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ جیسا راجہ ویسی پرجا کا دور تھا۔ اللہ کی بجائے غیر اللہ کی زیادہ خوشنودی مطلوب ہوتی تھی۔ بعض اربابِ غرض نے جامع مسجد میں کچھ تبرکاتِ نبویؐ رکھے ہوئے تھے۔ جو ہر جمعہ بادشاہ کو زیارت کرانے کے لئے دربار میں لائے جاتے تھے۔ شاہ اسماعیل انہیں فرضی سمجھتے تھے اور ان کے خلاف علانیہ وعظ کرتے تھے۔ یار لوگوں نے اس بات کی بھی مخبری کر دی۔ آپ دربار میں بلائے گئے۔ چنانچہ آپ دربار میں حاضر ہوئے مگر تمام شاہی آداب کو بالائے طاق رکھ کر بادشاہ کو عام آدمیوں کی سطح پر تصور کرتے ہوئے السلام علیکم کہا۔ بادشاہ نے گرمجوشی سے جواب دیا۔ اسکے بعد آپ نے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرنے شروع کئے۔ بادشاہ نے فی الفور کہا کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو تعریف کرتے ہیں۔ مگر ان کے تبرکات

کی تعظیم نہیں کرتے جسکا شہر میں واویلا ہے۔ آپ نے بڑی حاضر جوابی سے فرمایا کہ اگر یہ فی الواقعہ تبرکات ہوتے تو آپ ان کی زیارت کے لئے جامع مسجد جایا کرتے۔ نہ کہ یہ آپ کے دربار میں حاضر کئے جاتے۔ اس جواب پر بادشاہ بہت خفیف ہوا اور شاہ صاحب کو سونے کا ایک کڑا اتار کر پیش کیا۔ آپ نے بڑی بے نیازی سے فرمایا کہ مجھے آپ کے مال و دولت کی ضرورت نہیں آپ یہ مساکین میں تقسیم کر دیجئے۔ یہ کہہ کر آپ دربار سے چلے آئے اور علماء سو ایک دوسرے کی بغلیں جھانکنے لگے۔ کیونکہ ان کا یہ فریب بھی کامیاب نہ ہوا۔

حلقۂ ارشاد

آپ کا وعظ و ارشاد صرف مسجدوں تک محدود نہیں ہوتا تھا۔ جہاں بھی شرک و کفر یا بدعات و خرافات نظر آتیں فی الفور وہاں پہنچ کر دعوتِ اصلاح دیتے۔ کبھی مسجد کے صحن میں۔ کبھی مسجد کی سیڑھیوں پر کبھی سیتلا کی پرستش پر۔ کبھی بی بی کی صحنک پر۔ کبھی تعزیہ کے موقع پر۔ کبھی خانقاہوں پر کبھی تکیوں پر اور کبھی رنڈیوں کے چوباروں تک پہنچ کر ان کو خدا اور رسول کا پیغام پہنچاتے اور راہِ ہدایت دکھاتے یہانتک کہ ایک مرتبہ ایک معروف رنڈی کے ہاں کوئی تقریب تھی۔ جس میں شہر کی سب کسبیاں جمع تھیں اور رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ پتہ لگتے ہی آپ وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پند و وعظ کا چونکہ شہر میں غوغا تھے اور ہر کس و ناکس آپ کو جانتا تھا۔ اسلئے آپ کو دیکھتے ہی سب کسبیاں دوڑ کر ادھر اُدھر چھپ گئیں۔ آپ نے ایک ایک کو بڑی شفقت اور محبت سے بلایا۔ جب سب جمع ہو گئیں تو آپ نے انہیں نہایت خلوص اور دردِ دل کے ساتھ ایسا وعظ فرمایا کہ وہ محفل رقص و سرود برخواست ہو گئی اور سب کسبیاں آپ کے ہاتھ پر تائب ہو گئیں۔ چونکہ آجکل کے علماء کی طرح وعظ انکا ذریعہ روزگار نہ تھا۔ اسلئے آپ کے بیان میں خدا نے کچھ ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی اور آپ کے انداز گفتگو میں کچھ ایسا جذب پیدا کر دیا تھا کہ جو بھی آپ کے ارشادات سنتا، وہی راہِ ہدایت پر آجاتا۔

معرکۂ جہاد حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد شاہ شہید نے مولانا عبدالحی کے ساتھ ملک بھر میں وعظ و تبلیغ کے لیے دورے شروع کر دیئے۔ اسی دوران آپ کو پنجاب میں سکھوں کے مظالم اور سید احمد شہیدؒ کی جہاد کی تیاری کی خبریں ملیں۔ تو آپ حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھنے کی بجائے فی الفور میدان جہاد میں نکل آئے۔ آپ پہلے عالم دین تھے جو تلوار لیکر جہاد کے لیے نکلے۔ سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت ہونے کے بعد ان کے ہمراہ پنجاب کا رخ کیا۔ لیکن جنوب کی طرف سے انگریزوں سے ٹکراؤ کے اندیشہ سے یہ مجاہدین شمال مغرب کی طرف سے براستہ تھانیسر۔ مالیر کوٹلہ۔ ممدوٹ۔ بہاولپور حیدر آباد سندھ۔ خان گڑھ۔ درہ دھاڑواڑہ۔ درہ بولان وغیرہ سے ہوتے ہوئے پشین پہنچے۔ وہاں سے قندھار۔ کابل اور درہ خیبر کی دشوار گزار اور طول طویل مسافت طے کر کے پنجاب میں داخل ہوئے۔ ان مجاہدین کے مقابلہ میں سردار بدھ سنگھ دس ہزار فوج لیکر مقابلہ میں نکلا۔ جبکہ سید صاحب کا لشکر آٹھ پلٹنوں پر مشتمل تھا۔ اکوڑہ خٹک کے مقام پر پہلا مقابلہ ہوا۔ جس میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ جنگوں کا یہ سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ شاہ شہید نے شنگاری کے مقام پر حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس جنگ میں آپ کی ایک انگلی شہید ہوئی۔ ملہار کے مقام پر سرحدیوں کو شکست دی۔ ہوتی مردان پر قبضہ کرنے کے بعد پشاور فتح کیا۔ سب سے بڑا معرکہ بالاکوٹ کے مقام پر ہوا اور اس میں سید احمد اور شاہ اسماعیل ہر دو نے جام شہادت پیا۔ جنھیں راجہ شیر سنگھ نے سیاہ دوشالوں میں اعزاز کے ساتھ دفن کرایا۔

ان جنگوں کے دوران اقتدار کے بھوکوں نے غداریاں کیں۔ سیم و زر کے بندوں نے رفیق بن کر بیوفائیاں کیں اور اغیار کے آلہ کار بنکر زہر کے پیالے تک نوش کرائے۔ ان مجاہدین کی راہ میں طرح طرح کے کانٹے بچھائے گئے۔ مگر ان کے عزم بالجزم اور جذبہ جہاد میں آخیر وقت تک فرق نہ آیا۔ شہادت کے بعد بھی دشمنان اسلام نے ان کی عظمت و

عزت گھٹانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اور علمار سور سے شاہ اسماعیل پر تکفیر کے تیر چلواتے رہے۔

تصنیفات وتالیفات

شاہ اسماعیل شہید کی شہرہ آفاق۔ ایمان افروز اور یادگار کتاب تقویت الایمان ہے۔ جو اس بات کی داعی ہے کہ شرک خفی و جلی سے بچو۔ یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ حال وقال میں اللہ کے سوا غیر اللہ کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلاؤ۔ آپ کا ارشاد ہے کہ متقی مشرک سے فاسق موحد ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس نے گذشتہ سو سال میں جس قدر اصلاح عقائد کا کام کیا ہے۔ اتنا کسی دوسری کتاب نے نہیں کیا۔ اسکے علاوہ آپ کی قابل تصنیفات تنویر العینین۔ منصبِ امامت اور جہاد کے موضوع پر غربال نامی کتاب ہے۔ جو یہاں نایاب ہے۔ البتہ مصر میں اس کے چند نسخے موجود ہیں۔ جو اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ "تقویۃ الایمان" کا انگریزی ترجمہ بھی ۱۸۵۲ء میں چھپ گیا تھا۔ ان کے علاوہ ایضاح الحق طبقات۔ اصولِ فقہ۔ صراطِ مستقیم کا پہلا حصہ اور فقہ پر ایک رسالہ بھی آپ نے تصنیف کیا تھا اور بہت سی کتب پر آپ نے حواشی بھی لکھے تھے۔ جو غدر کے ایام میں ضائع ہو گئیں۔

جوہرِ ذکاوت

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد العزیز سے فیضیافتہ شاہ اسماعیل شہید کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ ملا تھا۔ نواب صدیق حسن خان کے قول کے مطابق :-

"ان کی ذکاوت کا جوہر بہت بلند پایہ تھا۔ اور ان کے ذہن وفہم کی تیزی کے قصے اب تک اہل علم کی ہر مجلس کے لئے باعثِ زینت سمجھے جاتے ہیں"۔

(اتحاف النبلاء صہ ۴۱۶)

سرسید احمد خان آپ کی نسبت لکھتے ہیں کہ :-

"ایسے فردِ کامل کا پیدا ہونا خدائے ذوالجلال کی قدرت کا ایک خاص کرشمہ تھا۔

غیر معمولی ذہانت کے ساتھ طبیعت میں استغنا بھی بہت تھا۔ مطالعہ پر چنداں توجہ نہ تھی۔ مقام سبق اکثر محفوظ نہ رہتا۔ کبھی اصل مقام چھوڑ کر آگے سے شروع کر دیتے۔ شاہ عبدالقادر ٹوکتے تو کہہ دیتے کہ بیچ کا حصہ آسان سمجھ کر چھوڑ دیا۔ کبھی پڑھا ہوا حصہ دوبارہ پڑھنے لگتے۔ تنبیہہ پر عرض کر دیتے کہ فلاں فلاں بات سمجھ میں نہیں آئی اور اس پر ایسے ایسے اعتراضات صادر کر دیتے کہ انہیں دور کرنے کے لئے استاد کو خصوصی توجہ کی ضرورت لاحق ہوتی"۔

اگرچہ آپ پندرہ سولہ سال میں رسمی تعلیم سے فارغ ہو گئے تھے۔ لیکن جب آپ سے بڑے بڑے عالم سرِ راہ کوئی ایسا مسئلہ پوچھ بیٹھتے۔ جسکے جواب کے لئے کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی۔ تو آپ کتاب دیکھے بغیر محض اپنی فراست اسے ایسا جواب دیتے کہ وہ دنگ رہ جاتا فقہ کا ہر مسئلہ بتاتے وقت قرآن و حدیث کا حوالہ دیتے۔ آپ نے اپنے رسالہ منطق میں شکل اول کے بعید الطبائع اور شکل رابع کے ابدہ البدیہیات ہونے کے جو دلائل دیئے ہیں۔ بقول سرسید احمد خان :-

"آپ کے دلائل کی قوت ارسطو کو بھی معرض حیرت میں ڈال دیتی اور اپنے دلائل کو تار عنکبوت سے بھی سست تر سمجھتا"۔

سعادت یار خان رنگین تو شاہ اسماعیل کی غیر معمولی ذکاوت دیکھ کر یہاں تک کہہ اٹھے کہ

"اس خاندان سے جو اٹھتا ہے باون گز کا اٹھتا ہے"۔

آپ کو قرآن مجید حفظ تھا اور تیس ہزار حدیثیں نوکِ زبان تھیں۔ نواب صدیق حسن صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"آپ معقول و منقول میں پہلوں کی یاد بھلا دیتے تھے۔ فروع و اصول میں آئمہ کو پرے بٹھا دیتے تھے۔ جس علم میں ان سے بات کر گئے۔ جان لوگے کہ وہ اس فن کے امام ہیں اور جس فن میں ان سے مناظرہ کی نوبت آئے گی۔ پہچان لوگے کہ وہ

اس کے حافظ ہیں۔ ساری عمر خدا کے کلمے کی بلندی اور رسول اللہ کی سنتوں کے احیاء خدا کی راہ میں جہاد اور خلق خدا کی ہدایت میں گزار دی۔"

آپ کا ذہن اتنا سریع الانتقال تھا کہ بقول حکیم جمیل الدین "آپ پانچ آدمیوں کو سامنے بٹھا کر پانچ مختلف مضامین لکھواتے تھے اور کسی کا قلم نہ رُکتا تھا۔"

(ارواح ثلاثہ صہ ۷۶)

مولانا فضل حق خیرآبادی سے آپ کی خاصی کشمکش رہی۔ لیکن جب انہوں نے آپ کی شہادت کی خبر سنی تو سبق پڑھانا بند کر کے رونا شروع کر دیا اور گھنٹوں بیٹھے روتے رہے۔ جب ذرا سنبھلے تو کہا:-

"اسماعیل کو ہم مولوی نہ جانتے تھے۔ وہ امتِ محمدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شے نہ تھی جس کی انیت اور لمیت اس کے ذہن میں نہ ہو۔"

(حیات بعد المات صہ ۱۲)

مجاہدانہ کارنامے

شاہ اسماعیل جہاد کے دوران شروع سے اخیر تک سید احمد شہید کے ہمراہ رہے اس دوران آپ نے جو خدمات سرانجام دیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے ان کی یہ فہرست گنوائی ہے:-

۱۔ وہ تمام انتظامات میں سید صاحب کے مشیر خاص تھے۔

۲۔ سید صاحب کے لئے امامت جہاد کا پورا بندوبست انہیں نے کیا تھا۔

۳۔ جنگ شیدو میں جان پر کھیل کر سید صاحب کو محفوظ مقام پر پہنچایا۔

۴۔ ہزارہ میں جہاد کی ابتدائی تنظیمات انہیں نے کیں۔

۵۔ جنگ شنکیاری میں تھوڑی سی جمعیت سے سکھوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دی۔ سکھوں کی گولیوں سے شاہ صاحب کی قبا چھلنی ہو گئی۔ لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے نہ مورچے میں پناہ لی اور نہ جنگ روکی۔

۶۔ بیعت شریعت کے سلسلے میں علماء سرحد سے تمام گفتگوئیں شاہ صاحب ہی نے کیں۔

۷۔ ہنڈ کا مضبوط و مستحکم قلعہ چھوٹی سی فوج کے ساتھ فتح کر لیا۔ دشمن کے دو آدمی مارے گئے۔ مگر اپنے کسی آدمی کو خراش تک نہ آئی۔

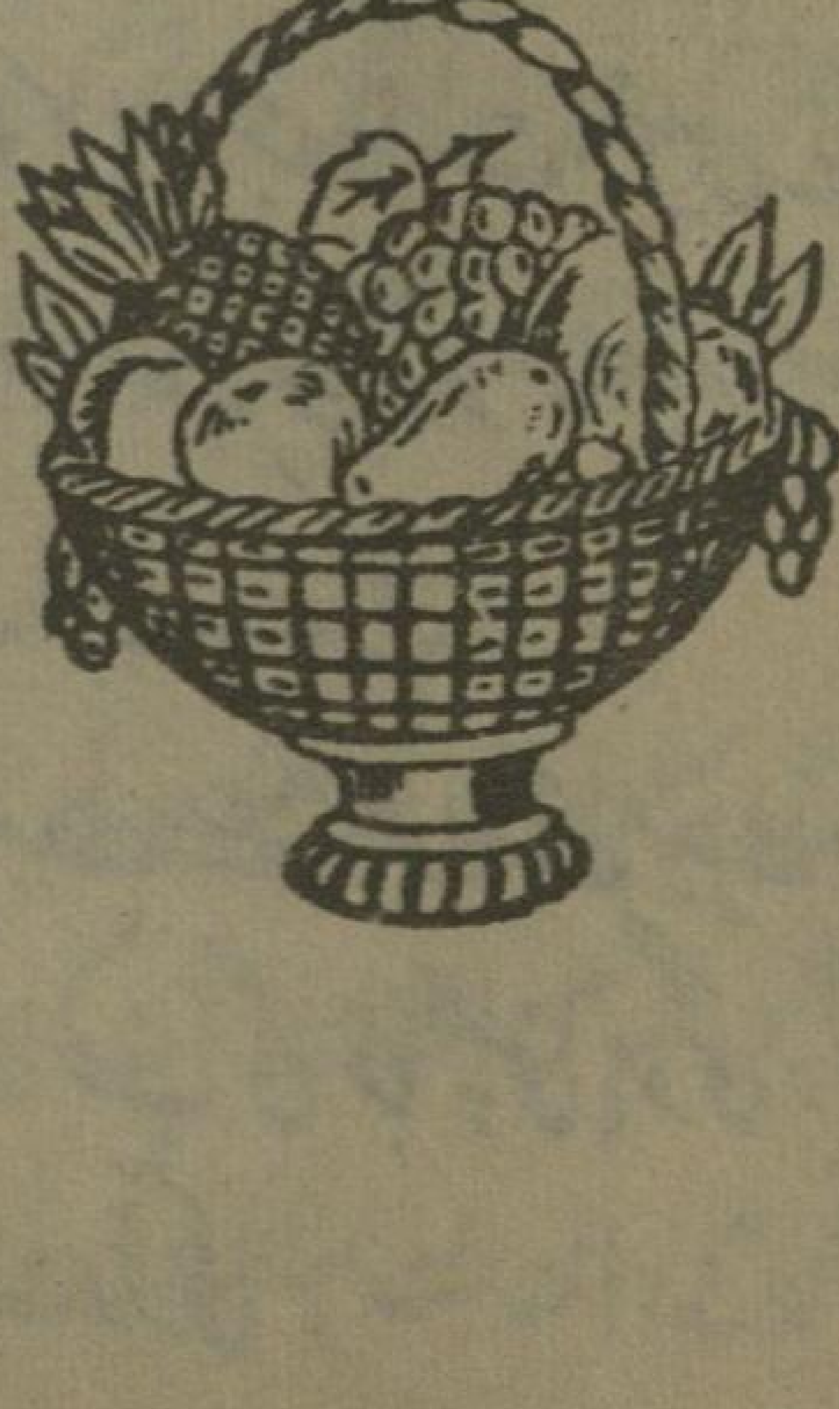
۸۔ جنگ زیدہ میں صرف سات سو مجاہدین سے درانیوں کی آٹھ دس ہزار فوج کو شکست دی۔

۹۔ مایار کی جنگ میں درانی فوج بارہ ہزار سے کم نہ تھی اور مجاہدین صرف ساڑھے تین ہزار تھے۔ جن میں بڑی تعداد ملکیوں کی تھی۔ تاہم درانی مقابلے پر نہ ٹھہر سکے۔

۱۰۔ امب و عشرہ کی لڑائیاں شاہ صاحب کے کمالِ سپہ گری کا ایک روشن ثبوت ہیں۔

۱۱۔ انتظام عشر کے سلسلہ میں وہ سید محمد حبان قاضی القضاۃ کے مشیرِ خاص تھے اور جنگ مردان میں انہیں کے حسنِ تدبیر سے فتح حاصل ہوئی۔

۱۲۔ پشاور میں صلح کی تمام گفتگوئیں سید صاحب کی طرف سے شاہ صاحب ہی نے کی تھیں (تحریک مجاہدین صد ۲۴-۱۲۳)



(۳)

سیّد احمد شہید بریلویؒ

بانیِ تحریک

تحریک احیاء دین کے بانی حضرت سیّد احمد شہید بہت پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگرچہ معلموں نے آپکو پڑھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر آپ کی طبیعت ان مدرسوں کی تعلیم کی طرف راغب نہ ہوئی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد سترہ سال کی عمر میں، اپنے آبائی شہر رائے بریلی (اودھ) سے نکل کر دہلی پہنچے۔ جہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ کئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ شروع سے چونکہ آپ کا طبعی رجحان جہاد کی طرف تھا۔ اس لئے آپ دہلی سے راجپوتانہ پہنچے اور نواب امیر محمد خان کی فوج میں شامل ہو گئے۔ جن کے انگریزوں کے ساتھ مخاصمانہ تعلقات تھے۔ سکھوں اور انگریزوں کو آپ شروع سے اچھا نہ سمجھتے تھے۔ اسلئے آپ نے خیال کیا کہ نواب موصوف کی مدد و اعانت سے ان ہر دو کے خلاف جہاد کرنے کا موقع ملے گا۔

آپ سات سال تک نواب موصوف کے مشیر خاص اور متعدد لڑائیوں میں ان کے ایک دستہ کے امیر بھی رہے۔ مگر نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ جس سے بد دل ہو کر آپ واپس دہلی لوٹ آئے۔ جہاں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد مولانا عبدالحی اور ان کے بھتیجے مولانا شاہ اسماعیل شہید اور خاندان ولی اللّٰہی کے دوسرے سرکردہ ارکان آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔

آغازِ جہاد

ان حضرات کی بیعت پر آپ نے سب سے پہلے معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعات و خرافات کے خلاف جہاد کا آغاز کیا۔ آپ نے مولانا عبدالحی اور شاہ محمد اسماعیل شہید کی معیت میں ملک کے طول و عرض میں تبلیغی دورے شروع کر دیئے

چونکہ آپ اس کام کے لیئے مامور من اللہ تھے۔ اسلیئے حق تعالےٰ نے آپ کو بڑی تاثیر اور جاذبیت بخشی تھی اور آپ کے رفقاء عہدِ صحابہ کی یاد تازہ کرتے تھے۔ اسلیئے آپ کے سوانح نگار کے قول کے مطابق :-

"سیّد صاحب اور ان کے رفیقوں نے جس زمین پر قدم رکھے۔ وہ سونے اگلنے لگی اور ان کی نگاہیں جن دلوں پر اتر گئیں۔ وہ حقائق و معارف کا گنجینہ بن گئے"۔

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صہ ۳۴)

بڑے بڑے نواب، رئیس۔ رئیس زادے نہ صرف نقد دل دے بیٹھے۔ بلکہ اپنے پورے خاندان کو آپ کے قدموں میں ڈال دیا۔ صوبہ بہار سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اپنے رفقاء سمیت میرٹھ۔ مظفر نگر۔ سہارنپور اور شمالی ہند کے دورے کیئے۔ لوگوں کو توحید کا سبق پڑھایا اور بدعات و رسومات سے ان کی جان چھڑائی۔ لاکھوں نے آپ کی بیعت کی اور ہزاروں آپ کی تبلیغ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

سفرِ حج

عین اس زمانہ میں جب سکھوں نے پنجاب میں غارت گری شروع کر رکھی تھی۔ آپ عازمِ حج ہوئے۔ اس زمانہ کا حج بھی جہاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ سفر کی مشکلات اور عام بدامنی اور ناقابل برداشت مصائب کی وجہ سے علماء نے سقوطِ حج کا فتویٰ دے رکھا تھا۔ جس کی مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل شہید نے تردید کر دی تھی۔

آپ چار سو مردوں۔ عورتوں اور بچوں کا قافلہ لے کر عین عیدالفطر کے روز ۲، جون ۱۸۲۱ء کو سفرِ حج پر روانہ ہوئے اور راستہ میں منزل بہ منزل فریضۂ تبلیغ ادا کرتے گئے۔ اور ۱۸۲۳ء میں عیدالاضحیٰ کے قریب ان حضرات نے حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد سات اٹھ ماہ تک آپ نے حرم شریف میں قیام کیا اور بلادِ حرم کے ممتاز علماء آپ سے فیضیاب ہوتے رہے۔ قریباً تین سال بعد آپ ۲، اپریل ۱۸۲۴ء کو واپس وطن پہنچے اور پھر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا اور جہاد کی عملی تیاریاں کرنے لگے۔

مقصدِ جہاد

اس وقت سکھا شاہی عروج کو پہنچ چکی تھی۔ پنجاب میں سکھ، سفاکیت و بربریت کا نیا ریکارڈ قائم کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی مسجدوں اور خانقاہوں پر انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ سرحد سے نوجوان مسلمان لڑکیاں جبراً اغوا کر کے لاتے اور بطور تحفہ آپس میں تقسیم کرتے۔ مسجدوں اور دیگر معبدوں میں گھوڑے باندھتے رہتے۔ گائے کی قربانی ممنوع تھی۔ مسلمانوں کی عزت و عصمت محفوظ نہ تھی۔ اور یہ سکھ ایک بے پناہ سیلاب کی طرح پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کی مسلم آبادی کو بہا کر لئے جاتے تھے۔ پنجاب کا آج کی طرح اس وقت بھی کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مسلمانوں کے قوائے عمل مفلوج ہو چکے تھے۔ جن کی اس علاقہ میں بادشاہی تھی۔ سکھ آج ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اور وہ عیش و عشرت منا رہے تھے۔ پنجاب کے قرب و جوار میں مسلمانوں کی کئی برائے نام چھوٹی بڑی ریاستیں موجود تھیں۔ سرحد میں اشراف اور شجاع خاندانوں کی کمی نہ تھی۔ مگر کوئی اسلامیانِ پنجاب کی دستگیری کو آگے نہیں بڑھ رہا تھا کہ سید صاحب تک چند ان افغان دوشیزاؤں کی فریاد پہنچی کہ "ہمیں اس وحشی قوم سے نجات دلاؤ"، جنھیں سکھ سرحدی علاقہ سے جبراً ہانک کر لے آئے تھے اور مالِ غنیمت کے طور پر آپس میں تقسیم کر لی تھیں۔ اس سکھ گردی کا نقشہ علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کھینچا ہ۔

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندر آں کشور مسلمانی بمرد

افغان لڑکیوں کی فریاد سنکر آپ کی حمیت و غیرتِ اسلامی جوش میں آئی اور آپ نے قال اللہ و قال الرسولؐ کی "رٹ لگانے والے" بے برگ و بے نوا سر پھرے مولویوں اور ملانوں کو جہاد کے لئے تیار کیا۔ اور پنجاب کو سکھوں کے مظالم سے نجات دلانے کے لئے توکلاً علی اللہ چل پڑے۔ ان نفوس قدسیہ کی قربانیوں اور فداکاریوں کا ذکرِ خیر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تذکرہ میں یوں کیا ہے۔

"اسلامیانِ ہند میں بنائے تجدید کی ابتدا حضرت مجدد سرہندیؒ نے کی اور تعمیر و تزئین امام ولی اللہ دہلوی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ مگر "خاک و خون" سے کھیلنا، تتمہ دودمان ولی اللّٰہی مولانا اسماعیل شہید کے لئے مقدر کیا گیا تھا"۔

مجاہدین کی اس جماعت کا مقصد خالص کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی دعوت تھی۔ بدعت و شرک کو مٹانا تھا اور دینِ محمدی میں عہدِ فاروقی کی شوکت و عظمت پیدا کرنی تھی۔ جس کا خود ان انگریزوں نے جو کسی خدمت کے سلسلہ میں ۱۸۶۴ء کے لگ سرحدی علاقے میں موجود تھے۔ اپنی رپورٹ میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

"یہ لوگ اس وقت مجاہدین کے لیڈر ہیں۔ جو صحیح تخمینہ کے مطابق بارہ۔ چودہ سو کے لگ بھگ ہوں گے ——— ان کا مقصد جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں۔ ہندوستان میں از سرِ نو اسلام کو قائم کرنا ہے اور اپنے مستقر میں یہ لوگ سختی کے ساتھ شریعت کے پابند ہیں۔ انہوں نے فوجی تنظیم کر لی ہے۔ اور اسلحہ سے آراستہ ہیں۔

(General Report on Yusufzais 99-100)

سیّد صاحب نے اس ضمن میں جن مسلمان حکمرانوں کو خطوط لکھے۔ ان کے متن سے بھی آپ کے مقصد جہاد پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ محمود درانی ہرات کے نام جو خط بھیجا۔ اس میں تحریر تھا۔

"جہاد قائم کرنا اور بغاوت اور فساد کو مٹانا ہر زمانے اور ہر مقام میں خدا کا اہم حکم رہا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کافروں اور سرکشوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے۔ کہ سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھوں دینی شعائر بگاڑے جا رہے ہیں اور شاہانِ اسلام کی حکومتوں میں ابتری پیدا کی جا رہی ہے اور یہ زبردست فتنہ ہند۔ سندھ اور خراسان کے خطوں پر چھا گیا ہے۔ اس صورت میں سرکش کافروں کی بیخ کنی سے غفلت اور مفسد باغیوں کی گوشمالی

سے سہل انگاری بہت بڑا اور بہت قبیح گناہ ہے۔ اس بنا پر خدا کی درگاہ کے اس بندے نے اپنے وطن سے نکل کر ہند و سندھ و خراسان کا دورہ کیا اور وہاں کے مومنوں اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی"۔

(جماعت مجاہدین ص۱۴۰۔۱۴۱)

اسی سلسلہ میں آپ نے ہندو رائے گھوٹکے ناظم اعلیٰ گوالیار کو جو خط لکھا۔ اس میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:۔

"وہ غیر جن کا وطن بہت دور ہے۔ بادشاہ بن گئے۔ جو تاجر سامان بیچ رہے تھے۔ انہوں نے سلطنت قائم کرلی۔ بڑے بڑے امیروں کی امارتیں اور بڑے بڑے رئیسوں کی ریاستیں خاک میں مل گئیں۔ ان کی عزت اور ان کا اعتبار چھن گیا۔ جو لوگ ریاست و سیاست کے مالک تھے۔ وہ گمنامی کے گوشے میں بیٹھ گئے۔ آخر فقیروں اور مسکینوں میں سے تھوڑے سے آدمیوں نے کمر ہمت باندھی ضعیفوں کا یہ گروہ محض خدا کے دین کی خدمت کے لئے اٹھا ہے۔ وہ لوگ نہ دنیا دار ہیں۔ نہ جاہ طلب! جب ہندوستان کا میدان غیروں اور دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ضعیفوں کی کوشش کا تیر مراد کے نشانے پر جا بیٹھے گا۔ تو آئندہ کے لئے ریاست و سیاست کے عہدے طالبوں ہی کو مبارک رہیں"۔

(ایضاً ص۱۴۱)

دعوتی خطوط

اس سے صاف عیاں ہے کہ یہ جہاد صرف سکھوں کے خلاف نہ تھا۔ انگریز بھی آپ کی نظر میں تھے۔ اس ضمن میں آپ نے جن سلاطین اور فرمانرواؤں کو خطوط لکھے۔ وہ یہ تھے:۔

۱۔ امیر دوست محمد خاں بارک زئی۔ فرمانروائے کابل۔

۲۔ یار محمد خان والیٔ پشاور۔

۳۔ سلطان محمد خان۔ والئے کوہاٹ و بنوں۔

۴۔ سیّد محمد خاں والئِ ہشت نگر۔

۵۔ شاہ محمود درانی۔ والئِ ہرات۔

۶۔ شاہزادہ کامران ولی عہد ہرات۔

۷۔ شاہ زمان درانی۔

۸۔ نصراللہ بادشاہ بخارا۔

۹۔ مراد بیگ حاکم قندر۔

۱۰۔ سلیمان شاہ والئِ چترال۔

۱۱۔ سکندر جاہ فولاد جنگ۔ آصف جاہ ثالث فرمانروائے دولت آصفیہ۔

۱۲۔ احمد علی فرمانروائے رام پور۔

۱۳۔ محمد بہاول خان عباسی فرمانروائے بہاولپور۔

۱۴۔ محراب خان حاکم بلوچستان۔

۱۵۔ امیرانِ سندھ۔

۱۶۔ حاکمانِ قندھار و غزنین۔

ان کے علاوہ مختلف علاقوں کے ۲۲ امراء و خوانین کو بھی دعوتِ جہاد کے خطوط لکھے۔ دعوتِ عام کا بھی انتظام کیا۔ آپ نے دوستوں اور محبوں کو اس نوع کے خط لکھے:۔

"کام کا وقت سر پر آپہنچا ہے۔ پس ہر راسخ الاعتقاد مومن اور ہر اطاعت گزار مسلم کے لئے لازم ہے کہ جسطرح بھی ممکن ہو۔ فقیروں کے پاس پہنچ کر جماعت مجاہدین میں شامل ہو جائے۔ اگرچہ حق تعالےٰ اپنی قدرت کاملہ سے خود اس مقدمے کو منزل اتمام پر پہنچائے گا۔ اسکا اپنا ارشاد ہے۔ کذالک حق علینا نصر المومنین اور دینِ محمدی کو اپنے دعوے کے مطابق تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے گا۔ لیکن جو شخص اپنی

جان اس معرکے میں حاضر کرے گا۔ وہ سعادتِ جاودانی پائے گا اور جو آج اس مقدمے میں سستی کرے گا۔ وہ قیامت کے دن افسوس و ندامت میں مبتلا ہوگا"۔

ایک دوسرے خط میں یوں ترغیب دی:۔

"یہ محمود زمانہ اور یہ مبارک وقت مخلصوں کے اخلاص اور مومنون کے یقین کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو بہار کو گل و بلبل کے تعلق میں اور برسات کو درختوں یا دوسری نباتات کے تعلق میں حاصل ہوتی ہے۔ (اہل اخلاص کا اخلاص اور اہلِ یقین کا یقین عمل میں نمایاں ہونا چاہیئے) جو پھول موسمِ بہار میں نہ کھلا، اسے کانٹے کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ جو فصل برسات میں نہ اُگی۔ اسکے درد کی امید ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانی چاہیئے۔ جو درخت فصلِ ربیع میں سرسبز نہ ہوا۔ اسے ہیزم خشک کی طرح جڑ سے کاٹ ڈالنے کے سوا چارہ کیا ہے"۔

یہ اسی دعوت کا نتیجہ تھا۔ کہ لوگ جماعت مجاہدین میں جوق در جوق شامل ہوتے گئے اور جہاد کے لئے ایک لشکرِ جرار جمع ہوگیا۔

سرحد کا انتخاب

سرحد کی جغرافیائی حیثیت چونکہ بڑی محفوظ تھی۔ اسکے شمال مغرب میں دور دور تک اسلامی آبادیاں تھیں۔ جن سے مخالفت کی بجائے امداد کی توقع تھی۔ خود سرحد کا سارا علاقہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جو بڑے جنگجو تھے اور سکھوں کے بڑے ستائے ہوئے تھے۔ اسلئے جہاد کے لئے انہیں بآسانی تیار کیا جا سکتا تھا۔ جس سے نہ صرف ان کی آزادی برقرار رہ سکتی تھی بلکہ وہاں سے پنجاب کی طرف بے فکری سے پیشقدمی کی جا سکتی تھی۔ اسی لئے سیّد صاحب نے اپنا مستقر اور مرکز جہاد سرحد کو بنایا اور کابل و غزنی کے حکام کو لکھا کہ:۔

"ہم ہندی مسلمانوں نے ہندوستان کے کفرستان سے تنگ آکر جہاد کے ارادے سے ہجرت کی۔ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دیتے اور حضرت سیّد المرسلین ؐ کی ملتِ

بیضاء کی تائید پر آمادہ کرتے ہوئے رضائے باری تعالیٰ کے شوق میں لمبی مسافت
طے کر کے آپ کے بلاد میں پہنچ گئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اسی طرح یوسف زئی میں
پہنچ جائیں جو پشاور کے حوالی میں ہے۔ مروت و دانائی کا لازمہ یہ ہے کہ دل
میں کسی قسم کا وسوسہ نہ لائیں۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے اجازت نامہ بھیج دیں تاکہ
ہم کھٹکے کے بغیر ان حدود سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں"۔

وہ ریل گاڑی یا ہوائی جہازوں کا زمانہ نہ تھا۔ رائے بریلی سے کابل تک قریباً اڑھائی ہزار میل کی مسافت تھی۔ آپ رائے بریلی سے بندھیل کھنڈ اور گوالیار سے گزر کر ٹونک پہنچے۔ پھر راجپوتانہ کا بے آب وگیاہ ریگزار طے کر کے سندھ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے بلوچستان کے صحرائی علاقہ میں پہنچے۔ اس انتہائی گرم اور دشوار گزار راستہ کو طے کرنے میں کم وبیش دس ماہ بعد اپنی منزل مقصود پر پہنچے۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:۔

"تاریخ ہند کے اوراق کھنگال کر دیکھو اور پھر بتاؤ کہ کوئی ایسی جماعت مل سکتی ہے۔ جس نے احیاء دین، اعلاء کلمۃ الحق اور آزادی بلادِ مسلمین کے لئے ایسی صعوبتیں، ولی عشق و شیفتگی قبول کی ہوں۔ جس طرح سید صاحب کی جماعت نے قبول کیں؟ اس ساری مدت میں ایک شخص کی زبان پر بھی کبھی حرف شکایت نہ آیا راحت و آسائش کو چھوڑ کر اذیتوں کے مواج سمندر میں کود پڑنے پر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کو پریشانی نہ ہوئی"۔

کابل اور غزنی کے حکمرانوں نے سید احمد شہید کے خطوط کا بڑا احترام کیا۔ ان کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا۔ مہینہ بھر کابل رہنے کے بعد آپ پشاور پہنچ گئے اور بالآخر ۱۹ دسمبر ۱۸۲۶ء کو آپ نوشہرہ پہنچ گئے۔ سکھ بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ بھی بدھ سنگھ کی سرکردگی میں قریباً دس ہزار کی تعداد میں اکوڑہ پہنچ گئے جو نوشہرہ سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔

دعوت و شبخون سیّد صاحب نے سکھوں سے جہاد شروع کرنے سے پہلے دربار لاہور کو جو اعلامیہ بھیجا۔ اس میں اسلامی شعار کے مطابق یہ شرطیں مذکور تھیں:

۱۔ اسلام قبول کرلو تو ہمارے بھائی بن جاؤگے اور برابر کا درجہ حاصل کرلوگے۔ لیکن اس باب میں ہماری طرف سے جبر نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ دین کا قبول یا عدم قبول ہر انسان کی مرضی پر موقوف ہے۔

۲۔ ہماری اطاعت اختیار کرلو اور جزیہ دو۔ اس حالت میں تمہارے اموال و نفوس کی حفاظت اسی طرح ہم پر واجب و لازم ہو جائے گی۔ جس طرح ہم خود اپنے اموال و نفوس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

۳۔ دونوں باتیں منظور نہیں تو لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سارا یاغستان اور سارا اسلامی ہند ہمارے ساتھ ہے۔ اور راہِ حق میں شہادت ہمیں اس درجہ عزیز و محبوب ہے۔ کہ تمہیں شراب اتنی عزیز و محبوب نہ ہوگی۔

سکھوں نے ان شرائط کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ جس پر شبخون مارنے کا فیصلہ ہوا۔ جس کے لئے نو سو مجاہدین کا انتخاب ہوا۔ جن میں سے ۱۳۶ ہندوستانی، قندھاری اور باقی اہل سرحد تھے مہم پر روانگی سے قبل سب نے ایک دوسرے کہا سنا معاف کر دیا اور یہ کہتے ہوئے شبخون مارنے چل پڑے اگر زندہ رہے۔ تو واپسی پر ورنہ پھر جنت میں ملیں گے۔ سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے یہ مجاہد سکھوں پر بجلی بن کر گرے۔ ایک ایک نے آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ان غازیوں نے شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھائے۔ سکھ اتنے بدحواس ہوئے کہ بھاگ نکلے اور کسی کو ان غازیوں کے تعاقب کی ہمت نہ ہوئی۔ بدھ سنگھ کے پائے ثبات میں تزلزل پیدا ہو گیا۔ شیدو کی طرف پیچھے ہٹ گیا اور سکھ ان غازیوں کے یوں گُن گانے لگے:۔

سکھاں ایں چنیں مقاتلاں دیدہ و شنیدہ نہ شدہ کہ ہم نے ان غازیوں جیسے جوانمردنہ

دیکھے نہ سنے ۔

جذبۂ جہاد

سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین جذبۂ جہاد سے کتنی سرشار تھی ۔ اور شہادت کی کتنی مشتاق تھی ۔ اس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب سیّد صاحب سکھوں پر شبخون مارنے کے لئے مجاہدین کا انتخاب کرنے لگے تو عبدالمجید آفریدی کا نام خارج کر دیا ۔ کیونکہ وہ کئی دنوں سے بیمار چلے آتے تھے ۔ عبدالمجید کو جب اس بات کی خبر لگی تو وہ فوراً سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اصرار کرنے لگا کہ مجھے اس سعادت سے محروم نہ رکھا جائے ۔ جس پر آپ نے اسکا نام بھی شبخون مارنے والے جتھے میں لکھ لیا ۔

شبخون کے دوران اس مردِ بیمار نے اپنے ہاتھ سے چودہ سکھوں کو جہنم رسید کیا ۔ بعد ازاں اسکی تلوار ٹوٹ گئی تو اس نے ایک دوسرے مجاہد کی تلوار لے کر کئی اور سکھوں کو ختم کیا اور بالآخر خود بھی جام شہادت پی کر آرام کی نیند سو گیا ۔

سیّد احمد شہید چار سال تک یہ جنگ لڑتے رہے اور صوبہ سرحد کا ایک بہت بڑا علاقہ سکھوں سے فتح کر کے وہاں نظام اسلام جاری کر دیا ۔ جسکی تفصیل شروع کے اوراق میں گزر چکی ہے ۔ لیکن پاکستان آج تک اسکے لئے ترس رہا ہے ۔

عزائم و مقاصد

بدھ سنگھ کو اس شبخون میں جو ہزیمت اٹھانی پڑی ۔ اسکے سلسلہ میں اس نے سید صاحب کو خط لکھا کہ اتنی دور سے جو آپ شوقِ شہادت لے کر آئے ہیں تو سامنے آکر لڑیں ۔ چھاپے مارنا کہاں کی مردانگی ہے ۔ حالانکہ حالتِ جنگ میں دشمن کو ہر ممکن طریقہ سے نقصان پہنچانا ۔ پریشان کرنا ۔ اسکے نظام کو درہم برہم کرنا تدابیر جنگ میں شامل ہوتا ہے ۔ شکست پر طعن زنی کسی کو زیب نہیں دیتی ۔ اس خط کا درج ذیل جواب سیّد صاحب کی شانِ عزیمت کا شاہد عدل ہے :-

دینِ محمدی کی نصرت کے لئے جو کوشش ، جس صورت میں بھی ممکن ہو گی ۔

بجالاؤں گا اور جس تدبیر کو بھی مفید پاؤں گا، اسے لازماً اختیار کروں گا۔ انشاءاللہ زندگی کے آخری سانس تک اسی سعی میں مشغول رہوں گا۔ پوری عمر اسی کام میں صرف کردوں گا۔ جب تک زندہ ہوں۔ اس مقصد کے لئے تگ ودو جاری رکھوں گا۔ جب تک سر گردن پر سلامت ہے۔ اس میں یہی سودا سمایا رہے گا اور جب تک پاؤں، تاب رفتار سے محروم نہیں ہو جاتے۔ اسی راستے پر چلتا رہونگا۔

اس ہنگامہ آرائی سے میرا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ دین محمدی کی نصرت میں اپنے مولا کا حکم بجالاؤں۔ نہ اس میں کوئی نفسانی غرض شامل ہے اور نہ کبھی ایسی غرض زبان پر آتی ہے۔ نہ دل میں گزری ہے۔ مجھے نہ مہادری جتانا مقصود ہے۔ نہ ریاست حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جب آپ اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں کوئی عذر وحیلہ روا نہیں رکھتے۔ حالانکہ وہ آپ جیسا انسان ہے۔ بلکہ آپ کی برادری میں سے ہے تو میں احکم الحاکمین کے فرمانوں کی بجا آوری میں کیوں کر عذر کرسکتا ہوں۔ حالانکہ وہ تمام انسانوں کا خالق ہے اور سارے جہان اسی نے بنائے ہیں۔

میں مفلس بن جاؤں یا دولتمند۔ منصب سلطنت پر پہنچ جاؤں یا کسی کی رعیت بن جاؤں۔ بزدلی کی تہمت لگے یا شجاعت کی ستائش کی جائے میدان جہاد سے کامیاب ہو کر زندہ لوٹوں یا شہید ہو جاؤں۔ اگر میں دیکھوں گا کہ میرے مولا کی رضا اسی میں ہے کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تنہا میدان جنگ میں آؤں تو خدا کی قسم، دل وجان سے تنہا سینہ سپر ہو جاؤں گا اور لشکروں کے ہجوم میں گھستے وقت دل میں ذرا سا بھی کھٹکا نہ ہوگا۔" (منظورہ صد ۲۴۲)

بیعتِ امامت

اسکے بعد بیعت امامت شروع ہوئی۔ کم وبیش دو مہینوں میں اسّی[۹۰] ہزار سرحدی عوام جہاد کے لئے پروانہ وار جمع ہو گئے۔ سرداران پشاور کا لشکر اس سے الگ تھا۔ جسکی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی اور اسکے ساتھ توپیں بھی تھیں۔

یہ لشکرِ جرار فتح خان (پنجتاری)۔ اشرف خان (زیدہ)۔ خادے خان (ہنڈ) ۔ امیر احمد خان (باجوزی)، کی مساعی جمیلہ سے فراہم ہوا تھا۔ ہر ہزار کا ایک گروہ تھا اور ہر گروہ کا الگ الگ نشان یا جھنڈا تھا۔

مولوی فتح علی کے بیان کے مطابق :-

"لشکر میں قریب ایک لاکھ کی جمعیت تھی اور کوئی آٹھ دس ہزار فقط نشان یعنی پرچم تھے۔ کیونکہ اس ملک کا دستور ہے کہ اگر دس بارہ آدمی کی جماعت ہے تو اس میں ایک نشان ضرور ہوتا ہے۔ اگر پانچ سات آدمی کی جماعت ہے تو اس میں بھی ایک نشان ہوتا ہے۔ بڑی جماعتوں کے تو کئی کئی نشان ہوتے ہیں"

(وقائع صہ ۴۶۲)

بیعتِ امامت کے بعد اکثر مقامات پر خطبہ جمعہ سید احمد شہید کے نام کا پڑھا جاتا رہا۔ جن کی حیثیت اس وقت صحیح معنوں میں امیر المؤمنین کی تھی۔

نظم و ضبط

سید صاحب نے جہاد کے لئے روانگی سے قبل مجاہدین کی جماعت بندی کی۔ قلبِ لشکر۔ مقدمۃ الجیش۔ میمنہ۔ میسرہ۔ ساقۃ الجیش وغیرہ ترتیب دیئے۔ ابتداء میں تو مجاہدین کو رسد کی کمی کی وجہ سے عہدِ نبوی کی طرح مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ساگ پات کھا کر گزارہ کرتے رہے۔ مگر بہت جلد رسد کا خاطر خواہ انتظام ہو گیا اور ہر جنس ہر شخص کو مساوی مقدار میں ملنے لگی۔ ہر مجاہد کو سال بھر کے لئے کھادی کے کپڑے کے تین جوڑے اور دو جوڑے جوتے ملتے۔ سردیوں کے لئے ہر ایک کو ایک ایک میرزئی اور ایک ایک دوہر ملتی تھی۔ ہر جمعرات کو کپڑے دھونے کا صابن ملتا اور بیماروں کو بیت المال سے دوائی ملتی۔

سید صاحب نے اپنے مجاہدین میں ایسی روح پھونک دی تھی کہ وہ زندگی کا ہر کام عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ مستحکم اخوت و محبت کی وجہ سے وہ سب ایک ہی خاندان

کے فرد معلوم ہوتے تھے۔ جو اپنے کپڑے دھونے جاتا۔ اپنے ایک دو ساتھیوں کے کپڑے بھی دھونے کے لیے ہمراہ لے جاتا۔ ان مجاہدین کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اس جہاد کے دوران نہ کوئی تنخواہ لیتے اور نہ کوئی معاوضہ قبول کرتے۔ اسلئے ان کی خوراک اور پوشاک کا تمامتر انتظام بیت المال کی طرف سے کیا جاتا۔ جنگ زیدہ میں مالِ غنیمت کے طور پر جو پچیس ہزار روپیہ ملا۔ اس میں سے سید صاحب نے پانچ ہزار بیت المال میں جمع کر دیا اور باقی مجاہدین میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ جو مجاہدین نے اسلئے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ جب بیت المال ان کی سب ضروریات کا کفیل ہے تو پھر وہ یہ روپیہ لے کر کیا کریں۔ سید صاحب کے اصرار پر چند مجاہدین نے اپنے متعلقین کو کچھ رقوم بھیجنا منظور کر لیا۔

زخمیوں کے علاج کا معقول انتظام تھا۔ اس دور کے مطابق ہر قسم کا جنگی سامان موجود تھا۔ بارود سازی کا کارخانہ پنجتار میں قائم کیا گیا۔ توہیں آنے پر مولانا احمد اللہ ناگپوری اور مولوی خیرالدین شیرکوٹی نے گولے ڈھالنے کا کارخانہ قائم کر لیا۔ مجاہدین کی قواعد اور چاندماری کا باقاعدہ انتظام تھا۔ مجاہدین کو باقاعدہ فنونِ جنگ کی مشق کرائی جاتی تھی۔ صبغتہ اللہ۔ مطیع اللہ اور فتح اللہ نامی مجاہدین کے تین پرچم تھے۔ جن پر آیاتِ قرآنی کڑھی ہوتی تھیں۔ مجاہدین کے ساتھ امیرالمجاہدین اتنی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے کہ ہر شخص آپ کو ماں باپ سے زیادہ شفیق سمجھتا تھا۔ سید صاحب ہر معاملہ میں اتباعِ شریعت چاہتے تھے۔ جہاں جاتے تھے۔ سب سے پہلے یہی اعلان فرماتے تھے کہ :-

"تم نے ریاست، سیاست اور دوسرے امور میں جو غیر شرعی طریقے مال اور اقتدار کی غرض سے جاری کر رکھے ہیں۔ ان سب کو یک قلم چھوڑ دو۔ اگر کوئی جھگڑا پیدا ہو تو اسکا فیصلہ خود نہ کرو۔ بلکہ قاضی سے کراؤ۔ اگر کسی نے کچھ کہنا ہو تو قاضی کے سامنے لے اور اس معاملہ میں کوئی دوسرا دخل نہ دے۔" (سفارش وغیرہ نہ کرے)۔

امتیازی شان

مجاہدین کی اس جماعت نے اپنے خلوص۔ ایثار۔ قناعت اور اطاعت سے عہدِ صحابہ کی یاد تازہ کردی اور یہ سعادت اس جماعت کے سوا متحدہ ہندوستان کی کسی دوسری تحریک کے کارکنوں ہی کبھی دیکھنے میں نہ آئی۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:۔

"اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے آسمان نے ایسا کوئی لشکر نہ دیکھا۔ جو علم و فضل، زہد و تقویٰ۔ حُبّ و حمیّتِ اسلام۔ شجاعت و جوانمردی۔ ایثار و فداکاری اور بے غرضی و بے نفسی میں سید صاحب کے لشکر کا نمونہ ہوتا۔ اس لشکر میں قرآن کے حافظ۔ مفسّر۔ محدث۔ فقیہہ۔ صوفیہ کرام غرض ہر مذاق و مشرب کے اصحاب شریک تھے۔ جنھیں اپنے حلقوں میں عزت کے بلند مراتب حاصل تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے۔ جنھوں نے بچپن ہی سے امارت و ریاست کی آغوش میں تربیت پائی۔ لہٰذا جسمانی تکلیف کا تصور بھی دماغ میں قائم نہ کرسکتے تھے۔ لیکن سید صاحب کی دعوت و تربیت نے ان میں ایسا جذبۂ صادقہ و راسخہ پیدا کردیا کہ وطن۔ اہل و عیال۔ اعزہ و اقارب اور وسائلِ راحت و عزت کو ترک کرکے انتہائی تکلیفوں کی زندگی بہ خوشی گوارا کرلی۔ ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی سب سے بڑی بیقراری یہ تھی کہ راہِ حق میں بہہ کر احیاء اسلامیت کا موجب بنے۔ کمال یہ ہے کہ سید صاحب کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے پیشتر یہ تمام اصحاب بالکل ویسی ہی زندگیاں بسر کرتے تھے۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو عموماً میسّر تھیں۔ لیکن سید صاحب کی دعوتِ حق اور ان کی حقانی تربیت نے ان لوگوں کی کایا ہی پلٹ دی اور وہ راہ خدا کے ایسے مجاہد بن گئے کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ان کی مثالیں شاید ہی مل سکیں۔"

(سید احمد شہید)

مثالی کردار سید صاحب کی تعلیم و تربیت اور دعوت و ارشاد کے یہ محیر العقول اثرات محض ان کی للٰھیت کی بدولت تھے اور صحیح معنوں میں اتباعِ کتاب و سنت کا نتیجہ تھے۔ آپ کن نظریات و اعتقادات کے مالک تھے اور کہاں تک آپ کا اور آپ کی حزب اللہ کا اس پر عمل تھا۔ اسکا صحیح صحیح پتہ آپ کے مکاتیب سے چلتا ہے۔ آپ خود لکھتے ہیں کہ:۔

"میرا طریقہ وہی ہے۔ جو میرے نانا سردار انبیاءؐ نے اختیار فرمایا۔ ایک روز سوکھی روٹی پیٹ بھر کر کھا لیتا ہوں اور خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ میرا لشکر انہیں چند مخلص مہاجروں پر مشتمل ہے۔ جنھوں نے محض رب العالمین کے دین کی خدمت کے لئے کمر باندھی اور اپنی طرف سے جانیں راہِ خدا میں قربانی کے لئے پیش کر دیں۔ دعا ہے کہ خدا انہیں منصبِ شہادت نصیب فرمائے۔ فتح و نصرت کی توفیق عطا فرمائے۔ غرض ہمارا حال ان فقیروں اور مہاجروں کا سا ہے۔ جس سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرامؓ کو ہجرت کے زمانے میں سابقہ پڑا تھا"۔

"ہم لوگوں نے رب العالمین کے احکام کی پیروی اور سید المرسلین کی سنت کے احیاء کی خاطر اہل و عیال کو چھوڑا۔ بھائی بندوں اور وطنوں سے ہجرت کی۔ ہم نے خدا کے سوا ہر شے کو پسِ پشت ڈالا اور خدا کے احکام کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا نصب العین بنایا۔ انسان کو بال بچوں، اہل و عیال، مال و منال وطنوں اور بھائی بندوں سے جو مضبوط رشتے ہوتے ہیں۔ وہ سب دل کی گہرائیوں سے نکال کر باہر پھینک دیئے۔ طرح طرح کے رنج اور تکلیفیں اپنے لئے پسند کیں رکنِ اعظم کے قیام اور سردارِ انبیاءؐ کے دین کی تائید میں کسی قسم کی سستی اور کوتاہی گوارا نہ کی۔ دنیوی فائدوں میں سے کسی فائدے کی امید ہم روا نہیں رکھتے۔ قدیم دوستوں اور مخلص بھائیوں کی پاسداری چھوڑ دی۔ اپنی جان

کے نفع ونقصان سے بھی دست بردار ہوگئے۔ اس راہ میں خدا کے سوا ہر شے کی پاسداری سے ہم بیزار ہیں"۔

نظریہ واعتقاد

زبانی جمع خرچ کرلینا بہت آسان ہے۔ لیکن اسے عملی جامہ پہنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر جب رضاء الٰہی مقصود ہو۔ احیاء دین پیش نظر ہو۔ پیرویِ کتاب وسنت مطلوب ہو تو پھر یہ مشکل اتنی آسان ہوجاتی ہے کہ عقل وفکر دنگ رہ جاتی ہے۔ آپ سب سے زیادہ ترکِ اشتراک اور ترکِ بدعات پر زور دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ:-

"ترک اشتراک یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو مشکلوں اور بلاؤں کا دور کرنے والا نہ سمجھا جائے۔ نبی۔ ولی، صالحین اور فرشتے خدا کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے ان کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اس راہ میں انہیں پیشوا ماننا چاہیئے انہیں زمانی حوادث پر قادر ماننا یا عالم الیسر جاننا ہرگز مناسب نہیں۔ ترکِ بدعات یہ ہے کہ تمام عبادات۔ معاملات نیز معاشی اور معادی امور میں انبیاء کے خاتم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر مضبوطی اور اولوالعزمی سے قدم جمائے جائیں۔ دوسرے لوگوں نے جو رسمیں پیدا کرلی ہیں۔ ان سے دور رہنا چاہیئے"۔

بندگی کا معیار آپ نے یہ تبلایا کہ:-

"جس بندے کے دل میں اپنے آقا کے دشمنوں کے خلاف غیرت اور حمیت کی حرارت پیدا نہ ہو۔ وہ بندہ نہیں اور محبت کا جو دعویدار محبوب کی خوشنودی کے لئے مال و جان اور عزت وآبرو قربان کردینے میں دریغ کرے۔ اس کا دعویٰ محبت بے اصل ہے۔ رب العالمین کی فرمانبرداری میں جو آرام ولذت ہے وہ کسی دوسری چیز میں متصور نہیں۔ یہی سیدھا راستہ دونوں جہان کی سرخروئی اور بہتری کا باعث ہے۔ کسی دوسری چیز میں ایسی سعادت نہیں اور اس دولت کا اتمام نصیب

نہیں ہو سکتا۔"

اطاعتِ امیر

اللہ والوں کی جماعت، قال اللہ وقال الرسول کرنے والوں کا یہ گروہ حجرہ نشینوں کا یہ طائفہ اپنے مقصد کے لئے کتنا مخلص اور اسکے حصول کے لئے کتنا بیقرار تھا۔ اسکا اندازہ سید صاحب کی اس سند سے لگایا جا سکتا ہے کہ:۔

"خدا کی رحمت سے اس تقویٰ شعار سپاہ کا اخلاص اس مرتبہ پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک ایک سپاہی کی للّھیت کے محاسن تحریر کئے جائیں تو ان کی تکمیل کے لئے ایک پورا دفتر درکار ہے۔"

جو لوگ ان کی امداد و اعانت کے لئے شریک جہاد ہو جاتے تو انگریز اور سکھ دونوں ان کو بدراہ کرنے اور ورغلانے کے لئے مختلف قسم کی رشوتیں اور چکمے دیتے۔ جن کی بنا پر بعض کم ظرف غداری پر اتر آتے اور چند روپہلی سکوں کے عوض اپنا دین و ایمان بیچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آخرت خراب کر بیٹھتے۔ اہلِ سمّہ کی غداری کے باعث جب بہت سے مجاہدین انتہائی مظلومی کی حالت میں شہید کر دیئے گئے تو اس وقت امب اور چھتر بائی کے قلعے مجاہدین کے قبضہ میں تھے۔ شیخ بلند بخت امب کی جماعت مجاہدین کے سالار تھے اور حافظ مصطفیٰ چھتر بائی میں قلعہ داری کے منصب دار تھے اور وہ سید صاحب کے حکم کے بغیر یہ قلعے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اسی اثنا انہیں سکھوں نے پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے ساتھ مل جائیں۔ آپ کو بڑے بڑے عہدے دینے کو تیار ہیں۔ تو شیخ بلند بخت نے ان کو یہ تاریخی جواب بھیجا۔

"اپنے سرداروں سے کہو! ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں۔ حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اپنے وطنوں سے اسلئے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں۔ نہ ملک چاہتے ہیں۔ نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا غرض؟ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے۔ قادر ذوالجلال کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے .... اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے کر آئے تو نہ ڈریں گے۔ ڈر خوفِ مرگ سے

پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں۔ پس ہمیں کیا ڈر ہے ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیغام نہ بھیجا جائے۔"

(منظورہ صہ ۱۰۶۸ - ۱۰۶۹)

حسنِ کردار یہ مجاہدین ہمہ تن صبغۃ اللہ کا نمونہ تھے۔ ان کی عفت و پاکیزگی کے چرچے زبان زد خلائق تھے اور لوگ ان کی زیارت کو ترستے تھے۔ پشاور پر پیش قدمی کے دوران جب یہ مجاہدین براستہ تنگی چارسدہ سے مٹ پہنچے تو لشکر کی حق شناسی پر لوگ یوں رطب اللسان تھے :۔

" یہ عجیب لشکر ہے۔ اگرچہ چھ سات ہزار سوار اور پیادے اترے ہوئے ہیں لیکن کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔" (ایضاً صہ ۸۹)

بخلاف ان کے سکھوں کا سلوک بقول جنرل فیین یہ رہا :۔

" سکھ فوجیں جب نقل و حرکت میں ہوتی ہیں تو کھیتی باڑی کا کچھ خیال نہیں کرتیں ان کا توپ خانہ اور رسالہ کھڑی فصلوں سے بے تکلف گزرتا ہے۔"

(ہندوستان میں پانچ سال)

ملّا کلیم اخوند زادہ کا بیان ہے کہ مجاہدین کے قیام خہر کے زمانے عورتوں کے اندر ان کے متعلق یہ قیل و قال عام تھی کہ :۔

" سید بادشاہ کے ساتھی یا تو نفسانی خواہشات سے محروم ہیں۔ یا اولیاء ہیں۔ پن چکیوں پر آٹا پسوانے آتے ہیں۔ وہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی مجاہد کی نگاہ عورت کی طرف اٹھی ہو۔"

احترام احکام شریعت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حسن زئی قبیلے نے سید صاحب سے عشر معاف کرنے کی درخواست کی جو از راہِ تالیفِ قلوب آپ نے منظور کر لی۔ جب اسکی خبر اسماعیل شہید تک پہنچی تو آپ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ والا جواب دیا کہ عشر

حقوق شرعی میں سے ہے اور امام اسے معاف نہیں کر سکتا۔ جس پر سید صاحب کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ یہی وہ نفوسِ قدسی تھے۔ جنھوں نے صحیح معنوں میں پاکستان کا نمونہ پیش کیا۔

غداریاں اور بیوفائیاں

سید صاحب نے جن فرمانرواؤں کو دعوتی خطوط بھیجے تھے۔ ان میں یار محمد خان والئی پشاور بھی شامل تھا۔ یوسف زئیوں کو میدانِ کارزار میں لانے کے بعد جب سرحد اور پشاور کے عام خوانین و روسا سید صاحب کے مجاہدین میں شامل ہونے کے لئے جوق در جوق آنے لگے تو یار محمد خان نے بھی وقت کے تقاضا کے تحت سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور بزمرہ مجاہدین شامل ہو گیا۔ لیکن وہ اس معاملہ میں مخلص نہ تھا۔ بدقسمتی سے پشاور کے قیام کے دوران سید صاحب کے لئے دونوں وقت کا کھانا اور میوہ جات یار محمد خان بھیجتا تھا۔ جسے نوشہرہ کے قریب ہونے والی جنگ کے عین موقعہ پر سکھوں نے رشوت دیکر شیشہ میں اتار لیا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ کے آغاز کا جس وقت فیصلہ ہوا۔ اسی وقت سید صاحب کی طبیعت کھانا کھاتے ہی خراب ہو گئی اور غشی طاری ہو گئی۔ ان کی کمان مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے سنبھالی۔ جنگ شروع ہو گئی۔ مجاہدین کا پلہ بھاری رہا۔ زیادہ تر سکھ مارے گئے۔ کئی راہِ فرار اختیار کر گئے۔ اور فتح کی مبارک بادی شروع ہوئی ہی تھی کہ یار محمد خان نے جس نے لڑائی میں حصہ بھی نہ لیا تھا۔ جب سکھوں کی جمعیت ختم ہوتے دیکھی تو میدان جنگ سے شکست شکست کہتا ہوا بھاگ پڑا۔ اس کے عسکری بھی اس کے ساتھ نو دو گیارہ ہو گئے اور یہ بات جنگل کی آگ کی طرح عسکریوں میں پھیل گئی۔ جس پر کئی سردار بھاگ گئے۔ اس افراتفری نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا یار محمد خان چونکہ سکھوں سے ساز باز ہو چکا تھا۔ اس لئے اولاً تو اس نے سید صاحب کو زہر دیدی۔ ثانیاً محاذ جنگ میں ایسی جگہ اپنے عسکریوں سمیت کھڑا ہوا کہ باسانی راہ فرار اختیار کر سکے۔ اس بات کا تذکرہ خود رنجیت سنگھ کے روزنامچہ میں موجود ہے۔ جہاں تحریر ہے کہ:۔

”جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو یار محمد خان نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ربط و اتحاد

کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحب کو زہر دیدیا اور خود بھاگ نکلنے کی ٹھان لی اسکا لشکر بھی ساتھ ہی فرار ہوگیا" (عمدۃ التواریخ)

صاف بیانیاں

اگر یار محمد خاں اس وقت غداری نہ کرتا تو یہ میدان مجاہدین نے جیت لیا تھا۔ مگر اس شکست سے مجاہدین نے ہمت نہ ہاری۔ اس کے بعد متعدد جنگیں ہوئیں اور بعض سرداروں نے یار محمد خان کی طرح غداریاں اور بیوفائیاں کیں۔ اور مجاہدین کے لئے سنگ راہ ثابت ہوئے۔ مگر سید صاحب نے انہیں صاف صاف فرمایا کہ:۔

"جو سردار اور رئیس جاہ طلب اور دنیا دار ہیں۔ ان سب کا یہی برتاؤ ہے۔ ان کو اول خطرہ اپنی جان کا ہوتا ہے۔ دوسرا زوالِ ریاست کا۔ ہمارا معاملہ تو خواہ دین کا ہو یا دنیا کا۔ صرف اللہ تعالےٰ کی رضا پر موقوف ہے۔ اسکی رضا کے کام میں جان و مال صرف کرنا سعادتِ ابدی سمجھتے ہیں۔ کوئی ہم سے دغا اور فریب کرے گا۔ تو ہمارا دین بگاڑے گا۔ نہ ایمان۔ اسکا عوض وہ اللہ سے پاوے گا ہم کو خطرہ کس بات کا ہے؟"

ایک اور موقعہ پر ناسا عد حالات دیکھ کر مجاہدین کا یوں حوصلہ بڑھایا:۔

"لڑائی کی فتح اور شکست اللہ کے اختیار میں ہے۔ کثرتِ فوج اور درستیٔ اسلحہ پر موقوف نہیں اللہ تعالےٰ تھوڑوں کو بہتوں پر کامیاب کرتا ہے اور بہتوں کو تھوڑوں پر۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کار خیر ہے۔ جو کوئی خلوص دل اور درست اعتقاد سے شریک ہوگا۔ لڑکا ہو یا جوان یا بڈھا، اسکی بہ ہر طور فتح ہے۔ اور جس کی نیت میں خلل ہے۔ اگر اسلام کی جہاں بھر پر فتح ہوئی۔ مگر اسکی شکست ہوئی اور میں تو جب تک زندہ رہونگا۔ انشاء اللہ اس کام کو نہ چھوڑونگا۔ میرے بعد جب تک پروردگار چاہے گا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھے گا"

(وقائع جلد سوم)

آپ نے منحرف اور متزلزل ہونے والے سرداروں کو یہاں تک غیرت دلائی کہ :۔

" بھائیو! میں جو اپنے وطن سے اتنے بندگان خدا کو جا بجا سے لیکر اور طرح طرح کی سختیاں اور مصیبتیں جھیل کر آپ کے اس ملک کوہستان میں آیا فقط اسواسطے کہ آپ کے ملک پر کفار غالب ہوگئے۔ اور طرح طرح کی آپ کو تکلیف اور ذلت دیتے ہیں۔ان کو مدد الہٰی سے مغلوب کروں۔ تاکہ آپ اپنی ریاستوں پر قابض و متصور رہوں اور دین اسلام قوت پکڑے۔ اگر میں طالب عیش و آرام ہوتا تو میرے واسطے ملک ہندوستان میں طرح طرح کے عیش و آرام تھے۔ اس کوہستان میں کبھی نہ آتا۔ سو اس گفتگو سے میری مراد یہ ہے کہ آپ سب بھائی بھی حکومت کفار سے غیرت کریں اور جان و مال سے میرے ساتھ شریک ہوں۔ اگر شرکت نہ کروگے۔ تو چند روز میں ایسا افسوس اور غم کروگے۔ جو بیان سے باہر ہے۔ پھر وہ افسوس اور غم کچھ کام نہ آئیگا۔ اگر اللہ تعالےٰ میرے ہاتھوں سے اپنا کام لینا چاہے گا تو اپنے اور بندوں کو میرے ساتھ کردیگا اور ان کے ہاتھوں اپنے دین اسلام کو غالب کردے گا"

(ایضاً)

آخری مورچہ

ان مایوس کن حالات میں سید صاحب اپنے مخلص مجاہدین کے ساتھ دشمنان اسلام کے ساتھ مختلف مقامات پر معرکہ آرائی کرتے کرتے بالآخر بالاکوٹ پہنچے۔ شیر سنگھ بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ موجود تھا۔ بالاکوٹ سے آپ نے وہاں کے حالات کے متعلق اپنی شہادت سے صرف گیارہ روز قبل مورخہ ۲۵ر اپریل ۱۸۳۱ء کو نواب محمد وزیر خان ولی عہد ٹونک کو اپنا آخری خط لکھا کہ :۔

" اگر تائید ربانی شامل حال رہی اور ہم اس جنگ میں کامیاب ہوئے تو انشاء اللہ دریائے جہلم پر ملک کشمیر تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائیگا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکر مجاہدین کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتے رہیں "

عین اس وقت بھی جب کفار اور مجاہدین میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آچکے تھے۔ بعض مسلمان سردار خطوط کے ذریعہ سید صاحب کو میدان جنگ سے ہٹ جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ بعض سردار مجاہدین کی یوں حوصلہ شکنی کر رہے تھے کہ سکھوں کا لشکر بہت بڑا ہے۔ ہم بہت تھوڑے ہیں۔ سید صاحب سب کو باری باری یہ کہہ رہے تھے کہ:۔

"ہم کو اپنے خداوند کی رضامندی منظور ہے۔ تھوڑے بہت لوگوں کا اصلا خیال نہیں اور نہ غیرت اسلام اس بات کو چاہتی ہے کہ مقابلۂ کفار سے ہٹ جائیں۔ اب اسی بالاکوٹ کے میدان میں ہم لوگوں کے واسطے جو کچھ منظور الٰہی ہے۔ وہ ہوگا۔ فتح و شکست سے کچھ غرض نہیں۔ پروردگار کی خوشنودی میں بہ ہر صورت ہماری فتح مندی ہے"

اس محاذ پر بھی مجاہدین سکھوں کی کثرت کے باوجود بڑی بے جگری سے لڑے بقول میاں لکھمیر اس وقت یہ حال تھا کہ:۔

"جو سکھ غازیوں کے مقابلے میں تھے۔ ان کے ہاتھوں اور بدنوں پر رعشہ پڑ گیا۔ بندوقیں نہ چلا سکے۔ غازی لوگ ایک ہاتھ سے ان کی بندوق پکڑتے۔ دوسرے ہاتھ سے تلوار مارتے اور قرابین والے قرابین مارتے تھے اور سکھ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑ کی طرف چلے جاتے تھے۔ بے شمار سکھ اسوقت مارے گئے"

بقول مولوی سید جعفر علی نقوی:۔

"سید صاحب اور آپ کے ساتھی بجلی اور آندھی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ سکھوں کے سر پر پہنچے۔ ان میں سے بعض نے نیزہ و شمشیر اٹھانے کا حوصلہ کیا۔ باقی بھاگ نکلے۔ لیکن راہ گریز کہاں تھی۔ وہ پہاڑ سے نیچے اتر چکے تھے۔ اور دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ نہ سکتے تھے۔ بس جتنے نیچے اترے مارے گئے۔ جو سکھ اوپر تھے۔ وہ گولیاں چلاتے رہے۔ ان کی گولیاں نہ اپنوں کو چھوڑتی تھیں نہ بیگانوں کو۔ گولیاں اولوں کی طرح

برس رہی تھیں۔ کارتوس کے کاغذ ہوا میں اڑ رہے تھے۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر پتھر بھی پھینکے جا رہے تھے۔"

(وقائع جلد ۳)

اس کے علاوہ دھوئیں نے تاریکی طاری کر دی تھی۔ عین اس وقت جب اس معرکہ کا مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہونے والا تھا۔ ایک مقامی غدار نے سکھوں کو بالاکوٹ کا ایک مخفی اور متروک راستہ تبلا دیا۔ جسکی وجہ سے سکھ شہر پر حملہ آور ہوئے۔ اسی گھمسان کے رن میں پھر دشمن نے بڑی چابکدستی سے یہ آوازہ بلند کیا کہ سید صاحب کہاں گئے؟ ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سید جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ:-

"بدورانِ جنگ سید صاحب کی گمشدگی کا سن کر جاں نثار ارادت مندوں نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور بے قرار ہو کر آپ کی تلاش میں سُو بہ سُو پھرنے لگے۔ سکھوں کی گولیاں جو شربتِ شہادت سے لبریز تھیں، کھا کھا کر رحمتِ الٰہی کی آغوش میں پہنچتے رہے۔"

یہ غداری اور آواز مجاہدین کی شکست کا باعث بنی اور اس محاذ میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید دونوں اللہ کی راہ میں لڑتے لڑتے اپنے اللہ کے پاس مئی ۱۸۳۱ء میں واپس پہنچ گئے۔

حسنِ استقامت

عام طور پر جب کسی تحریک کا قائد یا کسی مہم کا سربراہ فوت ہو جاتا ہے تو اسکے جانثاروں اور جانبازوں پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ ان کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ مگر سید صاحب کی شہادت نے آپ کے مجاہدین کو حیاتِ نو بخش دی۔ انہوں نے پہلے سے زیادہ جذبہ۔ ہمت و قوت اور سرشاری کے ساتھ اس تحریک کو جاری رکھا۔ راہِ حق میں ان کی فدائیت انتہا کو پہنچ گئی۔ اور ہر کو اس بات کا یقین کامل حاصل ہو گیا کہ:-

"موت فنا نہیں۔ بلکہ شاہراہِ ابدیت کا وہ پل ہے۔ جو اسکو محبوبِ حقیقی تک پہنچا دیتا ہے"۔

سر ولیم ہنٹر کے قول کے مطابق یہ تحریک اپنے سربراہ کی موت وحیات سے مستغنی ہو گئی تھی اور "خود سید (صاحب) کی وفات کو ان کے پرجوش حامیوں نے اپنے مسلک کی اشاعت کا مستقل ذریعہ بنا لیا تھا"۔

(سرگذشتِ مجاہدین ص۲۱)

سید صاحب کے بعد صادق پوری علماء نے یہ محاذ سنبھال لیا۔ سید صاحب کے بعد آپکے رفیق کار مولوی نصیر الدین امیر منتخب ہوئے۔ ان کے بعد مولانا ولایت علی۔ مولانا عنایت علی مولانا نور اللہ۔ میر مقصود علی مولانا عبداللہ یکے بعد دیگرے امیر مقرر ہوتے رہے۔ مولانا عبداللہ ۱۸۶۲ء سے ۱۹۰۲ء تک بیالیس سال امیر رہے۔ ان کے بعد ان کا چھوٹا بھائی مولوی عبدالکریم۔ پھر ان کا پوتا غازی نعمت اللہ امیر بنے جو ۱۹۲۱ء میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد مولانا عبداللہ کے دوسرے پوتے سید رحمت اللہ امیر بنے۔ یہ حضرات ہندوستان سے روپیہ وغیرہ جمع کرتے اور سرحد بھیجتے رہتے۔ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۶۲ء تک انگریزوں کی سی آئی ڈی اس بات کا سراغ تک نہ لگا سکی کہ ہندوستان سے سرحد پار رسد روپیہ اور اسلحہ کیسے پہنچتا ہے یہ معرکہ جہاد ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔

ان مجاہدین کے ہاتھوں انگریزوں کو کتنا جانی ومالی نقصان پہنچا۔ اسکا اندازہ ولیم ہنٹر کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ:۔

"۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ جنگی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء و ۱۸۶۰ء تک ان مہموں کی گنتی بیس۲۰ تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اسکے علاوہ تھی۔ بہرحال جب ہم نے اس

مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں"۔

(ہمارے ہندوستانی مسلمان صہ: ۶۰)

انگریزوں کو جب صادق پوری علماء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا سراغ ملا تو انہوں نے ان کے خلاف سازش کے متعدد مقدمات قائم کئے۔ خانہ پری کے لئے جھوٹے گواہ پیدا کئے۔ گواہ کو سچ بولنے یعنی منحرف ہونے کی سزا حبس دوام مقرر کی اسطرح بیسیوں مجاہدین کو سنگین سزائیں دیں۔ جو پھانسی یا عمر قید سے کم نہ تھیں۔ ان کو سزا سنانے کے بعد جزائر انڈمان میں بھیج دیا گیا۔ جو "کالا پانی" کے نام سے مشہور ہیں۔ تاکہ یہ ہندوستان کے اندر رہ کر پھر کوئی مصیبت کھڑی نہ کریں۔

ان مجاہدین کی منقولہ جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ ان کے مکانات رہائشی پیوندِ زمین کر دیئے گئے یہاں تک کہ ان کا پورا کا پورا محلہ زمین کے برابر ہموار کر دیا گیا۔ جہاں بعد میں بلدیہ پٹنہ کے دفاتر تعمیر ہوئے۔ علاوہ ازیں مجاہدین کی قبریں تک کھود کر ان کی بے حرمتی کی گئی۔

ان مجاہدین کے خلاف جو سازش کے مقدمات چلائے گئے۔ بقول مسٹر ہنٹر ان سے یہ امور ثابت ہوئے۔

۱۔ حیرت انگیز قابلیت۔ جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔

۲۔ رازداری۔ جس سے انکی مختلف اور پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔

یہ مجاہدین موت کو چونکہ بازیچۂ اطفال سمجھتے تھے اور شوق شہادت میں گھر سے کفن بردوش نکلتے تھے۔ جس سے انگریز بہت گھبراتے تھے اسلئے وہ پھانسی کی سزا کو یہ کہتے ہوئے عمر قید میں بدل دیتے تھے کہ:۔

"تم لوگ پھانسی پڑھنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمہاری پھانسی، سزائے دائم الحبس عبور دریائے شور سے بدل گئی ہے"۔ (تواریخ عجیب صہ ۴۲)

ان مجاہدین میں سے اکثر نے وہیں کالا پانی میں وفات پائی جو قریباً سب کے سب طبقہ علمار حق سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:۔

"مجاہدین کے اس قابل تعریف عمل کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ انہوں نے مصیبت کی حالت میں بھی اپنی جدوجہد کو ترک نہ کیا۔ اور سکھوں کو اور ان کے بعد انگریزوں کو جو پنجاب میں سکھوں کی جگہ آئے، برابر پریشان کرتے رہے۔ مگر اب ان کی جدوجہد کچھ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ سکھوں نے ایک شدید ضرب لگائی تھی.... تاہم ۱۸۶۳ء میں انگریزوں کو دو یورپی اور چھ دیسی فوج کے رسالے شمال مغربی پہاڑوں میں" وہاں" قلعہ سھانہ کے خلاف بھیجنے پڑے۔ بہادر محافظوں نے ڈٹ کر دشمن کا ایسا مقابلہ کیا اور اسقدر شدید نقصان پہنچایا کہ ایک دفعہ تو حکومت نے اپنی مہم واپس بلانے کا ارادہ کر لیا۔ قبائلی علاقوں میں قیام پاکستان تک پرانے لڑنے والوں کی نسل کے مجاہدین موجود تھے"۔

.... سکھوں کے بعد جب اس تحریک کا رخ انگریزوں کی طرف ہو گیا تو اس تحریک کے رہنماؤں پر بغاوت اور سازش کے مقدمات چلائے جانے لگے اور انہیں سخت سزائیں دی جانے لگیں پٹنہ میں تحریک کے مرکز محلہ صادق پور کو مسمار کر دیا گیا ۱۸۵۷ء کے طوفان کے بعد کسی ایسی تحریک کا چلانا جسکا مقصد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو واپس لانا ہو۔ غیر ممکن ہو گیا۔ مگر اسکے باوجود مشعل آزادی کو فروزاں رکھا گیا۔ سرحد کے لئے بھرتی کی جاتی رہی اور شمال مغربی سرحد کے مجاہدین کے لئے خفیہ چندے ہوتے رہے"۔ (تاریخ پاکستان صفحہ ۱۹۰)

ان مجاہدین نے جنگ پاکستان کے دوران بھی حتی الوسع خان عبدالغفار خان اینڈ کو کو ناکام کرنے کی کوشش جاری رکھی اور جب قائد ملت نواب بہادر یار جنگ قائداعظم کی اپیل پر سرحد میں خان برادران کے اثر کو زائل کرنے اور مسلم لیگ کا الیکشن جیتنے سرحد میں پہنچے اور لوگوں

نے انہیں آگے بڑھنے سے روکا کہ جان کا خطرہ تھا۔ تو اسی وقت فقیر ایپی کے پیغامبر نے پہنچ کر آپ کو ہر قسم کے تحفظ کا یقین دلایا۔ تاکہ آپ جس مشن کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اسے بخیر و خوبی کامیابی کی منزل تک پہنچائیں۔ جس کی وجہ سے نواب بہادر یار جنگ وہاں خان برادران کا اثر زائل کرنے اور الیکشن جیتنے کے لئے میدان ہموار کر آئے۔ یہی وہ لوگ تھے۔ جنھوں نے صحیح معنوں میں پاکستان کی بنیاد رکھی۔

قابل نفرین عمل

لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول کے تحت انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے جو اصول و قواعد وضع کئے۔ ان میں ایک قاعدہ تکفیر و تفسیق کا بھی تھا۔ جسکے ذریعہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں یا فرقوں کے درمیان تفریق اور تنفر کی خلیج اس حد تک وسیع کردی جاتی تھی کہ نوبت سر پھٹول تک جا پہنچتی تھی۔ انگریزوں کے جانشینوں نے بھی اپنے دور اقتدار میں اسی اصول کو حرزِ جاں بنائے رکھا۔ جس پر آجتک عمل ہو رہا ہے۔

رحمٰن اور شیطان کی جنگ ہمیشہ جاری رہی ہے۔ جس میں علماء سوء نے اربابِ غرض کے آلہ کار کی حیثیت سے علماء حق کے خلاف محاذ بنائے رکھا اور انہیں دار و رسن تک پہنچاتے رہے۔ مجاہدین کی مذکورہ بالا جماعت قدسیہ کو عوام و خواص میں، محض ان کی للّٰہیت کی وجہ سے جو مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی۔ اسے عداوت و نفرت میں بدلنے کے لئے انگریزوں نے اپنے دور کے علماء سوء کی خدمات حاصل کرکے سید احمد شہید۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ہمنواؤں پر وہابی اور نجدی کا فتویٰ صادر کرا دیا۔ اس دور میں یہ الفاظ گالی کے مترادف تھی۔ کیونکہ محمد بن عبدالوہاب کے پیروکاروں نے جب تھوڑے عرصہ کے لئے نجد میں اقتدار حاصل کیا تھا تو انہوں نے مقاماتِ مقدسہ کی سخت بے حرمتی کی تھی۔ جس سے عالم اسلام میں سخت ہیجان پھیلا۔ تب سے وہابی اور نجدی کا لفظ بطور گالی استعمال ہونے لگا۔ حالانکہ وہاب اللہ جلشانہ کا ایک اسم مبارک ہے۔ اسلئے وہابی فی الواقعہ اللہ والا ہوتا ہے۔ مگر سیاسی لغت نے اسکا مفہوم ہی الٹ دیا گیا۔ چنانچہ انگریزوں کے حواریوں اور پجاریوں۔

ایجنٹوں اور جاسوسوں نے ان حضرات کو وہابی ظاہر کرنے میں اور مسلمانوں کو ان سے دور رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حالانکہ انہوں نے جو قربانیاں احیاء اسلام کے لئے دین یا جن حالات کا ان کو سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے میدانِ کربلا اور جنگ احد کی یاد تازہ کردی تھی۔ مگر ان لوگوں کو تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض تھی۔ اسلئے ان مجاہدین پر برابر وہابی کا لیبل چسپاں کرتے رہے اور آج زائد از سو سال گزر جانے کے باوجود انہیں بدستور وہابی کہہ کر مسلمانوں کو ان کے مجاہدانہ نظریات اور اقدامات سے بے بہرہ رکھنے کی کوشش جاری ہے۔ حالانکہ حقیقت اسکے برعکس تھی۔

محمد بن عبدالوہاب کی تحریک صرف انسدادِ بدعات تک محدود تھی۔ جہاد بالسیف اس کے مقاصد میں داخل نہ تھا اور سید احمد شہید کی تحریک کا اولین مقصد ہی جہاد بالسیف تھا۔ ردِ بدعات کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی تھی۔ حرمین شریفین پر نجدیوں کا صرف نو سال قبضہ رہا۔ ۱۸۱۲ء میں محمد علی مصری نے انہیں حرم سے بیدخل کردیا۔ مقاماتِ مقدسہ کے انہدام کی وجہ سے بلادِ حرم کے حکام ان حاجیوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ جن پر نجدی ہونے کا شبہ ہوتا اور انہیں وہاں سے نکال دیتے مگر سید احمد شہید بلاد حرم میں سات آٹھ ماہ رہے اور بلادِ عرب کے ممتاز علماء آپ سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اگر ان کا نجدیوں سے بھی تعلق ہوتا تو انہیں ہرگز وہاں اتنا عرصہ نہ رہنے دیا جاتا۔ علماء سوء شروع سے علماء حق کے مخالف رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے علماء حق کو کسی دور میں بھی نہیں بخشا۔

خصوصیاتِ بشری

سیّد صاحب بڑے شفیق اور رحمدل تھے۔ یہاں تک کہ جانوروں پر بھی زیادتی برداشت نہ کرتے تھے۔ تقویٰ اور توکل آپ کے ان ارشادات سے عیاں ہے جو ان اوراق میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ فراست۔ شجاعت۔ سخاوت۔ صبر اور استقامت آپ کو بدوِ فطرت سے ملی تھی۔ عفت مآب ایسے کہ آپ کی کبھی کسی عورت کے چہرے پر نظر نہ

پڑی۔ عبادت و ریاضت۔ تسلیم و رضا۔ عفو و درگزر اور علم و حیا، مساوات اور مروت کے آپ پیکر تھے۔ بداعتمادی کے عادی نہ تھے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی خدمت اسلام میں گزار دی تھی اور کبھی کسی کے لئے بارِ خاطر نہ ہوئے تھے۔ حسن علی خان کا بیان ہے کہ:-

"خدا نے سیّد صاحب کو جن کمالات اور جن کرامات سے شرف بخشا تھا۔ ان کو حافظے میں محفوظ رکھنے کی مقدرت ہم سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔"



(۴)

سر سیّد احمد خان

پُرکشش شخصیّت

سرخ و سفید رنگ بارعب چہرہ - روشن آنکھیں۔ لمبی داڑھی فربہ جسم - لمبا قد - وجیہہ صورت - لباس ترکی - معاشرت انگریزی - زبان اردو - ایک وزیر سلطنت کا نواسہ - شاہ ولی اللہؒ کے فرزندانِ ارجمندان کے پوتوں اور مظہر جان جاناں کے جانشین شاہ غلام علیؒ کے فیض یافتہ - ملک کے خیر خواہ - قوم کے ہمدرد - مسلمانوں کے غمخوار سر سیّد احمد خان بڑے خوش اخلاق - علم دوست - بہادر و جانباز - مخلص و دیانتدار - آزاد منش - راست باز - مردم شناس - کھرے و صاف گو - باہمت باغیرت - اولوالعزم - بلند حوصلہ - مستقل مزاج - دور اندیش - عالی ظرف انسان، بلند پایہ ادیب اور دلنشین مقرّر تھے - آپ کی تحریر مسجع و مقفّیٰ عبارت سے پاک اور آپ کی تقریر تصنع اور لفاظی سے مبّرا ہوتی تھی - آپ کے قلم اور کلام میں بے انتہا سادگی اور بے ساختگی تھی - دور از کار تشبیہات اور بے محل قوافی کا ان کی عبارت میں کوئی عمل دخل نہ ہوتا تھا - جس کی وجہ سے آپ کا کلام بڑا مؤثر - دلکش اور دلنشین ہوتا تھا - اس کے تنوع سے دل مسحور ہو جاتا تھا - آپ کے اسلوب بیان کی سادگی اور بے تکلفی کی داد مولانا الطاف حسین حالی ان الفاظ میں دیتے ہیں :-

"اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کی سی روانی ہے - تو مذہبی اور پولٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرائی کا سا زور ہے - اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت اور خوش طبعی - نصیحت کے نشتر سے زیادہ دلخراش ہے اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہے - غصہ مہربانی سے زیادہ پُر لطف ہے اور نفرین، آفرین سے زیادہ خوش آیند - وہی ایک قلم ہے - جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ

(Moralist) کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے۔ تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں، اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئیدادوں میں ایک تجربہ کار سیکرٹری کے ہاتھ میں"۔

ایسی خصوصیات کسی ایک مصنف میں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔

مسلمانوں کا غمخوار

سرسید احمد خان پہلے مسلم مفکر تھے۔ جنہوں نے آل انڈیا نیشنل کانگرس کے مقابلہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرکے ایک طرف مسلمانوں کو کانگرس میں شمولیت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور دوسری طرف مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر لاتے اور حکومت کے عمل دخل میں شریک کرنے کے لئے متحدہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت درست اور بہتر بنانے کے لئے ایک ہندوستان گیر مہم چلائی۔ جو ہندوؤں سے ہر میدان میں مات کھا رہے تھے اور ہندو —— انہیں ہر میدان میں بری طرح نیچا دکھا رہے تھے۔ جس سے سرسید احمد خان بہت متاثر تھے۔ اسی لئے آپ نے ایک خط میں لکھا کہ:-

"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے۔ وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے۔ ویسے ہی ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے"۔

ہندوؤں نے جس چابکدستی سے مسلمانوں کو انگریزوں کی نظر میں غدار بنایا اور انہیں نقصان پہنچایا۔ اس کے ازالہ کے لئے اگرچہ آپ نے اسبابِ بغاوت ہند لکھ کر انگریزوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مگر نشۂ اقتدار سے دو آتشہ غصہ نے پھر بھی مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کے دل بالکل صاف نہ کئے اور انہیں جب بھی موقع ملتا۔ وہ مسلمانوں سے بدلہ لینے میں دریغ نہ کرتے۔ ہندوؤں اور سکھوں کو سینے سے لگائے رکھتے اور اسلام دشمنی میں یہ سب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے

مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ نہ کوئی رہبر و رہنما تھا۔ نہ کوئی ادارہ یا انجمن، جو ان لٹے پٹے مسلمانوں کی خبرگیری کرتی۔ عظمتِ رفتہ اور شاندار ماضی کے تمام آثار ونشان مٹ چکے تھے۔ انتشار۔ ابتری۔ بدنظمی اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ دقیانوسیت اور قدامت پرستی جڑ پکڑ چکی تھی۔ اخلاقی بیماریاں گھر کر چکی تھیں۔ کفر و شرک تعصب و تنگ نظری کی گرم بازاری تھی۔ اوہام وخرافات اور خود ساختہ رسم و رواج کے جال ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ادبار و افلاس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بد دلی۔ بے حسی اور مایوسی نے چاروں طرف سے محصور کر رکھا تھا۔ تعلیم و تہذیب ان میں مفقود ہو چکی تھی۔

ہندو گردی انگریزوں نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد مسلمانوں پر اہم عہدوں کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ اسلامی نظام ونصاب تعلیم یک قلم منسوخ کر دیا تھا۔ فقہ اور اسلامی علوم کی بیخ کنی کے لئے قاضیوں کو موقوف کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی صنعت و حرفت کو تباہ کر دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان پر معیشت کے سب دروازے مقفل کر دیئے۔ جس کی دردناک تفصیل ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی تصنیف Indian Muslims (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں دیکھی جا سکتی ہے جو ۱۸۷۱ء میں لکھی گئی۔ اس کی رو سے صرف سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی یہ حالت زار تھی:-

اسسٹنٹ انجنیئروں کے تینوں درجوں میں۔	ہندو ۱۴	مسلمان ×
سب انجنیئروں اور سپروائزروں میں۔	〃 ۲۴	〃 ۱
اورسیئر۔	〃 ۶۳	〃 ۲
اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ۔	〃 ۵۰	〃 ×

۱۸۵۱ء سے قبل ہائیکورٹ کے سب وکیل مسلمان تھے۔ مگر ۱۸۵۱ء کے بعد وکالت کے امتحان کا طریقہ بدل کر مسلمانوں کو اس آزاد پیشہ سے بھی محروم کر دیا۔ جسکی رو سے وکالت کے لائسنس اس شرح سے جاری ہوئے:-

آزادی اور مذہب ہر قوم کو پیارا ہوتا ہے اور پھر مسلمان تو اسلام پر اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ آزادی کی ناکامی سے مسلمانوں کے دل بجھ گئے وہ دنیا میں عبرت و حسرت کا مجسم نمونہ بن کر رہ گئے۔ ان میں پھر سے سر سید احمد خان نے قوت و عظمت پیدا کرنے کے لئے اپنی اصلاحی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے آغاز کے وقت متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بالکل وہی حالت تھی۔ جو آج ہے۔ جس کی تائید دو قومی نظریئے اور قیام پاکستان کے شدید مخالف کے۔ ایل۔ گابا کی کتاب Passive voices (مجبور آوازیں) سے ہو رہی ہے۔ جو لوگ پاکستان میں بیٹھ کر متحدہ ہندوستان کے خواب دیکھ رہے ہیں اور پاکستان کا نقشہ مٹانے کے لئے ہندوؤں کے ہاتھوں کھیل رہے ہیں۔ انہیں اس میں اپنا مستقبل دیکھنا چاہیئے۔

یہ حق تعالےٰ کا بہت بڑا کرم تھا کہ اس نے ہندوستان میں اسلام کا نام باقی رکھنے کے لئے سر سید احمد خان کے دل میں درد پیدا کیا۔ اس نے اس فارمولے کے تحت کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ مسلمانوں میں علی گڑھ تحریک چلائی۔ تاکہ یہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے ایوان اقتدار میں گھسنے اور اندر بیٹھ کر اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے جدوجہد کر سکیں اس تحریک کے ذریعہ پاکستان کا ڈھانچہ تیار ہوا۔

سر سید احمد خان کے سامنے اس وقت تین خطرات تھے۔ پہلا یہ کہ انگریز مشنری حکومت کے بل بوتے پر اور ملازمتوں کے چکمے دے کر مسلمانوں کو عیسائی بنا رہے تھے جو سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ مذہبی انحطاط کا باعث ہو رہا تھا۔ دوسرا خطرہ جس کو دیکھ کر سر سید کا مر جانے کو جی چاہتا تھا یہ تھا کہ یہ لوگ اسلام کو عقل کا دشمن۔ اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کا مانع ثابت کر رہے تھے۔ اس مہم میں مغربی یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور انگریز حکام مشنریوں کا ہاتھ بٹا رہے تھے اور صوبہ متحدہ یعنی یو۔ پی کا گورنر سر ولیم میور اپنی رسوائے زمانہ

کتاب کے ذریعہ خدا کے کلام اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ثابت کر رہا تھا۔ اس کتاب کا خلاصہ اس نے اپنے دیباچہ میں ان الفاظ میں لکھا نعوذ باللہ:۔

"انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن، محمد کی تلوار اور محمد کا قرآن ہے"۔

تیسرا سب سے بڑا خطرہ، جس نے خود سرسید کے دین و ایمان کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ یہ تھا کہ عیسائی مشنریوں۔ مصنفوں اور مفکروں کی کتابیں پڑھ پڑھ کر مسلمان اسلام سے دور اور عیسائیت کے قریب ہو گئے تھے۔ عوام و خواص تو الگ رہے، خود سرسید کا یہ حال تھا جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:۔

"اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقت پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ بیٹھتا"

کس مذہب کو؟ اس مذہب کو جسکے تحفظ کے لئے پاکستان کی ضرورت لاحق ہوئی اور جس کا آج کوئی پرسانِ حال نہیں۔

دورِ آزمائش

سرسید احمد خان پر آزمائش کی جو دوسری گھڑی آئی۔ اسکا بھی حال خود ان کی زبان حقیقت ترجمان سے سنئے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:۔

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا۔ نہ مال و اسباب تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا۔ اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ جو کچھ انگریزوں پر گزرا، اسکا رنج تھا۔۔۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا۔ وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک

بڑا غمکدۂ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا۔ اس علم کو کسی قدر ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں، اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے۔ اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" (دیباچہ لیکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراجدین ۱۸۹۰ء)

وہ مقلب القلوب جب کسی سے کام لینا چاہتا ہے۔ تو اسی طرح اس کے دل کی دنیا میں انقلاب لاتا ہے۔ واپس لوٹ کر یہ مرد مجاہد قوم کے کتنے کام آیا۔ اسکا اندازہ مولانا حالی کے اس جائزہ سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ جو آپ نے ۱۹۰۰ء میں بمقام حیدر آباد دکن سر سید کی آٹھویں برسی پر تقریر کرتے ہوئے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:۔

"ہندوستان میں جس قدر انجمنیں۔ سوسائٹیاں۔ سبھائیں اور کانفرنسیں قائم ہوئی ہیں۔ جس قدر ہندو اور مسلمانوں نے ملک کے اطراف و جوانب میں مذہبی اور علمی درسگاہیں قائم کی ہیں اور جسقدر اردو۔ ہندی اور سنسکرت میں تالیفات تصنیفات اور تراجم ملک میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے۔ تو یہ سب اسی ایک انسان ضعیف البیان سر سید کی تحریک کے کرشمے ثابت ہوں گے۔"

بے نظیر قربانیاں

سر سید نے قوم کے لئے ذاتی طور پر کتنی قربانیاں دیں۔ اس کی فہرست طویل ہے۔ یہاں صرف چند باتوں کا اظہار کافی ہوگا۔

۱۸۵۷ء کی قیامتِ صغریٰ کے بعد، مسلمان ہی انگریزوں کی نظر میں کشتنی و گردن زدنی تھے۔ ان کے نزدیک مسلمان کے معنی باغی تھے اور مسلمانوں کے حق میں کسی کا کلمۂ خیر کہنا دار و رسن کو دعوت دینا تھا اور اس پر انگریز خونخوار شیر کی طرح لپکتا تھا۔ انگریزوں

کے اس غیظ و غضب کو دیکھنے کے باوجود سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی بے گناہی کے سلسلہ میں اسبابِ بغاوت ہند لکھ کر بازار میں بکنے کے لئے نہ بھیجی بلکہ اس کے نسخے حکومت ہند کے اعلیٰ حکام اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبران کو بھیجے۔ جس میں اس فساد یا ہنگامہ یا غدر کی تمام تر ذمہ داری انگریزوں پر ڈالی گئی تھی۔ نفسا نفسی کے اس دور میں تو اسکا خواب تک دیکھنا ممکن نہ تھا۔ مگر سر سید احمد خان نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اتنا دلیرانہ قدم اٹھایا اور قوم پر اتنا احسانِ عظیم کیا۔ جسکی مثال نہیں۔

(۲) سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر۔ یو۔ پی نے "لائف آف محمدؐ" لکھ کر سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو گستاخیاں اور بے باکیاں کیں۔ وہ پڑھ کر سر سید کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور انہوں نے اسی وقت اس دریدہ دہن کے اتہامات اور اعتراضات کا جواب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے لئے جن کتابوں کی ضرورت تھی۔ وہ ہندوستان میں نایاب اور انگلستان میں دستیاب تھیں۔ آپ نے فوراً انگلستان پہنچنے کا ارادہ کیا۔ مگر زادِ راہ نہ ہونے کی وجہ سے آپ فوری قدم نہ اٹھا سکے۔ لیکن اس سلسلہ میں تاخیر بھی برداشت نہ کر سکے۔ عشقِ نبیؐ میں سرشار سر سید احمد خاں نے جو تزک جہانگیری چھپوائی تھی۔ وہ دس روپے کی بجائے ایک روپیہ فی جلد کے حساب سے بیچ ڈالی۔ گھر کا اثاثہ فروخت کر دیا۔ گھر رہن رکھ دیا اور اس طرح جو کچھ جمع ہو سکا۔ وہ لیکر انگلستان پہنچ گئے اور سر ولیم میور کے اعتراضات کا دندان شکن جواب لکھ ڈالا۔ جب چھپوانے کا مرحلہ آیا تو جیب خالی تھی۔ فوراً گھر خط لکھا کہ جو کچھ بچ رہا ہے۔ بیچ ڈالو۔ میرا کتب خانہ نیلام کر دو۔ جو ایک دو گھر بچے ہوئے ہیں۔ وہ بھی رہن رکھ دو اور مجھے فی الفور روپیہ بھیجو۔ دوسری طرف اس عاشقِ رسولؐ نے دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا کہ جو کچھ دے سکتے ہو۔ فوراً دو۔ نواب محسن الملک کو تو یہاں تک لکھ دیا کہ اگر مجھے بھیک بھی اس کام کے لئے مانگنی پڑی تو پرواہ نہیں۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤنگا کہ :۔

"اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے نانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔
حاضر کرو" ع مارا ہمیں نغمۂ شاہنشاہی بس است۔

ان نامساعد حالات میں آپ نے جوں توں کر کے وہ کتاب اردو اور انگریزی میں چھپوائی جو "خطبات احمدیہ" کہلائی۔

مذہبی جوش باایں ہمہ انگریز مشنریوں۔ پروفیسروں اور مفکروں کے خیالات کے کچھ اثرات سرسید کے دل و دماغ میں اپنا کام کر گئے۔ جن کی بنا پر دینی امور میں بلکہ خالصۃً قرآنی امور میں سرسید سے کچھ غلطیاں اور کچھ لغزشیں ہوئیں۔ لیکن ان کے باوجود ان کا عشق رسول اللہ حب دین شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ جبکا آپ کے مخالفوں کو بھی اعتراف ہے۔ آپ ماشاء اللہ شاعر بھی تھے اور آہی تخلص رکھتے تھے۔ آپ کا مذہبی ولولہ اور جوش آپ کی اس غزل سے ظاہر ہے :۔

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم — مسیحا رشک مے آرد ز درمانے کہ من دارم
خدا دارم دلے بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم — ندارد ہیچ کافر سازوسامانے کہ من دارم
زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمے خواہم — ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم
فلک یک مطلعِ خورشید دارد باہمہ شوکت — ہزاراں ایں چنیں دارد گریبانے کہ من دارم

زبرہاں تابہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہمچو برہانے کہ من دارد

سرسید احمد خان منافق اور دل کے کھوٹے نہ تھے۔ جن انگریزوں نے مدرسۃ العلوم کی مخالفت کی یا اس کے لئے سرکاری زمین ملنے میں مزاحم ہوئے۔ سرسید نے ان سے ملنا ترک کر دیا اسی طرح سکول کے ٹرسٹی بل کے سلسلہ میں آپ کے جن بے تکلف دوستوں نے آپ کی مخالفت کی بلکہ ایک مخالف پارٹی بنا کر سرسید اور ان کے طریق کار پر معترض ہوئے۔ اُن کے متعلق سرسید لکھتے ہیں کہ :۔

"جب وہ مجھ سے ملنے آئے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ خان صاحب! میری عادت کسی سے منافقانہ ملنے کی نہیں۔ آپ رئیس ہیں۔ جب کہیں ملاقات ہو گی۔ میں آپ کی تعظیم کرونگا۔ آپ ممبر کمیٹی ہیں۔ جب اجلاس میں تشریف لادیں گے۔ آپ کا ادب کرونگا۔ لیکن آپ سے دوستانہ جو ملاقات تھی۔ وہ راہ و رسم میں رکھنی نہیں چاہتا"

یہ صاف گوئی اور راستبازی محض دینی جذبہ کی بدولت تھی۔ آجکل تو ایسے صاف دل انسان چراغ لے کر ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آپ نے مذہبی حمیت کا کتنا جذبہ تھا۔ اسکا اندازہ آپ کے مندرجہ ذیل خط سے لگ سکتا ہے۔ ایک زمانہ میں نواب وقار الملک کا کسی ایسے افسر سے سابقہ پڑا۔ جو کچہری کے اوقات میں نماز نہیں پڑھنے دیتا تھا۔ سرسید کو جب اس بات کا پتہ چلا تو آپ نے انہیں لکھا کہ:۔

"نماز جو خدا کا فرض ہے۔ اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے، جسطرح چاہیں، خرابی سے ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو۔ اسکا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے۔ جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا، یا سستی میں ڈالنا، میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامتِ اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا۔ جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا۔ تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا، اور "حضور رخصت ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں" کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفٰی دیدینا تھا۔ اور صاف کہدینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کرونگا۔ نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر آتی۔ فاقے سے مرجاتے نہایت اچھا ہوتا۔

والسلام۔

(خاکسار سید احمد از بنارس ۹ جنوری ۱۸۷۵ء)

مذہب اسلام کے لئے ایسی غیرت اب کہاں ؟

تہذیب الاخلاق

انسان کے اندر اگر خلوص اور جذبہ ہو تو وہ خدمتِ خلق کی کئی راہیں نکال لیتا ہے۔ قومی شعور کو بیدار کرنے میں اخبارات کا جو حصہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کی اصلاح کے سلسلہ میں سر سید احمد خان نے ایک اخبار موسومہ "تہذیب الاخلاق" نکالنے کا فیصلہ کیا اور لندن سے مولانا مہدی علی کو لکھا کہ اسکے لئے :-

"میں نے سال بھر کا کاغذ خرید لیا ہے۔ اسکا ماہانہ خرچہ -/۱۰۰ روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپے مہینہ کر کر دیں گے اور اخبار مفت بانٹیں گے اور بقیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔ امید ہے کہ میں چوتھی پانچویں اکتوبر کو مصر سے ہوتا ہوا اللہ آباد آپ کے جمال مبارک کو دیکھوں گا۔ امید ہے کہ اگر تم مجھ کو اپنے پاس نہ بیٹھنے دوگے تو اپنی جوتیوں کے پاس بیٹھنے دوگے۔ اگر اپنے ساتھ بٹھلا کر نہ کھانے دوگے تو کتے کی طرح دوسری رکابی میں آگے رکھ دوگے۔ ورنہ اور لوگ تو مجھ کافر کو روٹی پانی دینا ہی کفر سمجھتے ہوں گے۔ ہزار ہزار شکر ہے کہ میرا خدا ایسا نہ ہوا۔ جس کی روز لاکھوں تقصیریں کرتا ہوں اور وہ روٹی دیتا ہے اور کیا عجب ہے بقول شخصے کہ قیامت کو بھی اپنی مہربانی سے اپنے دائیں ہاتھ پاس بٹھلالے۔ لیکن اگر وہ بھی میرے بھائی بندوں یا میرے ہم مذہب مسلمانوں کا سا ہوتا۔ تو میں کیا کرتا۔ اس وقت کو تو مولوی مہدی علی کا سہارا بھی نہ رہتا۔ واہ میری کیا قسمت ہے ؟"

یہ وہ حالات تھے۔ جن میں سر سید احمد خان نے قوم کی رہنمائی کے لئے اخبار "تہذیب الاخلاق" جاری کرنے کی جرأت و ہمت کی۔ اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ضرور بد دل ہو کر ہمت ہار بیٹھتا۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس

انہی ایام میں یعنی ۱۸۸۶ء میں سر سید نے دوسرا اہم کام یہ کیا کہ نیشنل کانگرس کے قیام کے ایک سال بعد آپ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ چونکہ علی گڑھ کالج پورے ملک کی تعلیمی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے آپ نے تعلیم انگریزی کو عام کرنے اور مختلف صوبوں اور ضلعوں میں لوگوں کو بیدار کرنے اور تعلیم کا شوق دلانے کی غرض سے یہ کانفرنس قائم کی۔ جس کے مختلف مقامات پر اجلاس ہوتے۔ جن میں مولانا شبلی اور مولانا حالی اپنی نظمیں سناتے۔ مولانا نذیر احمد۔ نواب محسن الملک۔ خواجہ غلام ثقلین لیکچر دیتے اور اسے کانگرس کے مقابلہ میں سیاسی اغراض کے لئے بھی استعمال کرتے کیونکہ اسوقت تک مسلم لیگ معرض وجود میں نہ آئی تھی۔ اور سیاسی یا نیم سیاسی امور میں یہی کانفرنس مسلمانوں کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس نے مسلمانوں کو کانگرس سے دور رکھنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور علی گڑھ کالج سے زیادہ مفید نتائج برآمد کئے۔ بعد میں اس کو چلانے کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا گیا۔ اس سے قبل سر سید نے ۱۸۶۳ء میں مغربی علوم کی ترویج کے لئے غازی پور میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی بھی قائم کی۔ اس کے زیر اہتمام مختلف علمی موضوعات پر تقاریر ہوتیں۔ ترجمے چھپتے۔ ایک اخبار بھی شائع ہوتا۔ جس کے بیشتر مضامین میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح پر اردو اور انگریزی میں زور دیا جاتا۔

انگریزی تعلیم

جو حضرات سر سید احمد خان کو اس لئے مورد عتاب گردانتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔

وہ دراصل اس مہم کے پس منظر سے واقف نہیں۔ اگر اس وقت کے حالات خود ان کے سامنے ہوتے تو خود وہی حضرات اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو جاتے کہ مسلمانوں کو صرف زندہ رہنے کے لئے انگریزی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیئے۔ سر سید مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دلانے کے لئے کیوں دیوانے ہو رہے تھے۔ اسکی وجہ خود ان کے خط مورخہ ۸ راگست ۱۸۹۱ء بنام نواب سید علی حسن میں یہ درج ہے :-

"انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمانانِ ہندوستان ذلت و خواری میں پڑتے جاتے ہیں۔ عہدہ ہائے سرکاری سے روز بروز خارج ہوتے جاتے ہیں۔ اصلی عہدے ان کے ہاتھ سے نکلتے جاتے ہیں۔ ہندو بنگالی روز بروز ترقیاں پاتے جاتے ہیں اور مسلمان ہر امر میں ان کے مغلوب و دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو ہندوؤں و بنگالیوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے یا ان سے مغلوب نہ ہونے دینے کے لئے مسلمانوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینا درحقیقت ہندوؤں اور بنگالیوں پر ان کو فتح مند کرنا ہے اور اس زمانہ میں جو حال مسلمانوں کا ہے۔ درحقیقت ان کی تعلیم انگریزی میں امداد کرنا پوری حسنات میں داخل ہے مگر سرکار عالیہ کو یا عموماً مسلمانوں کو اس خیال کی طرف لانا، محالات سے ہے"۔

اندریں حالات سر سید احمد خان کا مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا اہتمام کرنا، انکا مسلمانوں پر ایک ایسا احسانِ عظیم تھا۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر سر سید، اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر مسلمانوں کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے یہ قدم نہ اٹھاتے تو ہندوؤں نے مسلمانوں کو شودر بنا دیا ہوتا۔ یا ان کا ہندوستان سے نام و نشان مٹا دیا جاتا۔ جیسے آجکل ہندوستان میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا ہو رہی ہے۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دلانے کی جو مہم شروع کی۔ اسکی اس

وقت کے جید علماء نے اعلانیہ تائید کی۔ سرسید نے جب یہ تحریک شروع کی تو بعض قدامت پسند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سلسلہ میں آپ سے فتویٰ چاہا تو انہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ :-

"جاؤ! انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو۔ شرعاً ہر طرح جائز ہے"

اسی طرح حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیرؒ مالٹا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خطبۂ افتتاحیہ کے دوران فرمایا :-

"آپ میں سے جو حضرات محقق و باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا"

اور کوئی صاحب نظر۔ صاحب بصیرت اور صاحب فراست معلم الکتاب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی :-

اُطلبوا العلم لو کان بالصین ۔ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین میں جانا پڑے ۔

کی موجودگی میں حصول علم پر کیسے قدغن لگا سکتا ہے۔ جس طرح انگریزوں نے اپنے دور میں مرزا غلام احمد قادیانی سے جہاد کی منسوخی کی اور غلام احمد پرویز سے انکار حدیث کی مہم چلوائی اسی طرح مسلمانوں کی بیداری کی اس تحریک کو نقصان پہنچانے کا کام بھی انہوں نے اپنے دو سرکاری ملازموں مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی اللہ بخش سب جج سے لیا۔ جنھوں نے اس سلسلہ میں سرسید کے خلاف مضامین لکھ کر لوگوں کو گمراہ کیا۔

تقسیم کی پیشین گوئی

سرسید پرلے درجہ کے محب وطن تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ ان کے بڑے برادرانہ تعلقات تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ :-

"ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں۔ جیسے اپنے عزیزوں سے۔

جب سید مسعود پیدا ہوئے تو مسٹر راس اور ان کی میم نے انگریزی رسم کے مطابق جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے۔ اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا جو سید راس مسعود قرار پایا۔ ہماری دوستی کا دوسرا نمونہ داڑھی منڈا راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ایس۔آئی ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں۔ سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں۔ اور سید راس مسعود راجہ۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں فرق نہیں کرتے۔

ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب وہوا میں دونوں شریک ہیں۔ مقدس گنگا و جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ہم دونوں نے ملکر ایک نئی زبان اردو پیدا کرلی۔ جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔

ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے۔ جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں اتفاق نہ رکھیں گے تو وہ ہماری دلہن بھینگی ہوجائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کردیں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلم! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہے کانڑا۔"

اسی لئے سرسید نے اپنے معاشرتی اصلاحی منصوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو بھی شامل کررکھا تھا۔ وہ مسلمانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ترقی کے لئے بھی کوشاں تھے۔ اسی لئے سرسید احمد خان نے اشاعت تعلیم کے سلسلے میں کبھی ہندو مسلم کی تخصیص نہ کی تھی۔ مراد آباد کے مدرسہ۔ غازی پور کے سکول اور سائنٹیفک سوسائٹی۔ ہندو مسلم

دونوں مستفید ہو رہے تھے۔ مگر مسلمانوں کی یہ مروت و محبت ہندو کے خبث باطن کا ازالہ نہ کر سکی اور ہندو کی فطرت ان کی راہ میں سنگ راہ بننے لگی۔ جس پر سرسید احمد خان کو اپنا مطمح نظر بدلنا پڑا۔ جسکی تفصیل مولانا حالی نے یوں لکھی ہے:۔

"۱۸۶۸ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو۔ تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جاوے اور بجائے اسکے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جاوے۔

سرسید لکھتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے مشترک کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "انہی دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا۔ ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے۔ میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تو ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا۔ وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپکی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔" میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے۔ مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے:"

(حیاتِ جاوید)

تعلیم و تربیت

سرسید احمد خان ۱۷، اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپکی زیادہ تر تربیت آپ کی دور اندیش اور دانشمند والدہ نے کی۔ ابتدا ہی سے آپ کو مذہبی ماحول ملا۔ آپ کے ننھیال کو ولی اللہی مسلک شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی اور آپ کے والد مرزا مظہر جانجاناں کے جانشین شاہ غلام علیؒ نقشبندی کے چہیتے مرید تھے۔ اس وقت دہلی میں ان ہی حضرات کے مدرسے ترویج دین اور اشاعتِ اسلام کے بہت بڑے مرکز تھے۔ آپ کا بچپن زیادہ تر شاہ غلام علیؒ کے مصلیٰ پر گزرا۔ انہوں نے ہی آپ کا نام احمد رکھا تھا اور بسم اللہ پڑھائی تھی اور انہی کے اصولوں پر آپ نے تعلیم پائی۔ جس کا آغاز قرآن مجید، کریما، خالق باری۔ آمد نامہ۔ گلستان۔ بوستان۔ شرح ملا۔ شرح تہذیب۔ میبذی۔ مختصر معانی اور مطول وغیرہ سے ہوئی۔ ان کے علاوہ آپ نے ریاضی اور طب کی تعلیم بھی حاصل کی اور امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ مخصوص اللہ۔ شاہ محمد اسحاق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاد مولانا مملوک علی سے اکتسابِ فیض کیا اور نو سال کے اندر یہ تمام مراحل طے کر کے اپنی تعلیم و تربیت کا جائزہ اس شعر میں پیش کر دیا ؎

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرارِ یزدانی
زِ فیضِ نقشبندِ وقت، جانِ جان جانانی

اسی لئے آپ پر مذہبی اثر زیادہ تھا اور مولانا سید احمد شہید کی طرح آپ میں اصلاحی جوش بھی جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔

آپ کی زندگی کا دوسرا دَور ملازمت میں گزرا۔ پہلے سر رشتہ دار۔ پھر منصف مقرر ہوئے اور دہلی میں ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک منصف لگے رہے۔ جہاں آپ نے دہلی کے باکمال لوگوں اور دہلی کے علم و ادب کے خزانوں سے علمی اور روحانی تربیت حاصل کی۔ جس سے آپ کے دل میں قومی انس اور عشق پیدا ہوا۔ اپنی ملازمت کے ۲۵ سالوں میں آپنے تصنیف و

تالیف کا شغل بھی جاری رکھا۔ ۱۸۷۶ء میں پنشن لیکر علی گڑھ آگئے۔ جہاں مولوی سمیع اللہ خان بڑی محنت شاقہ اور تندہی سے اپنا ابتدائی مدرسہ چلا رہے تھے۔ سر سید احمد خان نے اپنی زندگی کے بقیہ بائیس برس اسی مدرسہ کو ایم۔ اے۔ او کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی تک پہنچانے اور اسے اسلامیانِ ہند کا قومی نشان بنانے میں گزار دیئے۔ جس کا آج ہندوستان میں حلیہ بدل دیا گیا ہے اور اس اسلامی نشان کی اصلی حالت بدل کر اسے ہندو یونیورسٹی کے برابر بنا دیا ہے۔

تصنیفات و تالیفات

سر سید احمد خان نے چونکہ مذہب کی آغوش میں ہوش سنبھالا تھا اور مذہب ہی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے آپ کی زیادہ تر تصانیف مذہبی تھیں۔ علاوہ ازیں آپ نے (۱) انتخاب الاخوین یعنی قواعد دیوانی کا خلاصہ (۲) قولِ متین در ابطال حرکتِ زمین۔ (۳) تسہیل فی جرِ الثقیل۔ (۴) اسباب بغاوتِ ہند (۵) آثار الصنادید (۶) تبئین الکلام (تفسیر بائبل نئے اصولوں کے مطابق)۔ (۷) راہِ سنت در ردِ بدعت۔ (۸) کلمۃ الحق (۹) طعام اہل کتاب (۱۰) خطباتِ احمدیہ (جواب سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد) (۱۱) تفسیر قرآن کی سات جلدیں اور کئی دیگر رسائل لکھے۔ تصنیف و تالیف کے شغل پر آپ نے اپنی متاعِ حیات کے ساٹھ سال صرف کئے۔ ۱۸۳۹ء سے لیکر جب آپ نے رسول اکرم صلی اللہ وسلم کی حیات مبارک کے مختصر حالات لکھے۔ ۱۸۹۸ء تک جب آپ امہات المومنین کے متعلق ایک عیسائی مصنف کے اعتراضات کا جواب لکھ رہے تھے کہ آپ کو مالک حقیقی نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو واپس بلا لیا۔ جب کہ آپ قوم کی خدمت کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ کیونکہ مولا کریم کسی کو اسکی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

علی گڑھ تحریک

سر سید احمد خان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام تھا۔ آپ اس اصول کے مالک تھے کہ زمانہ جب بدلے تو

آپ بھی اپنے مذہبی عقائد و خیالات کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے بدلیں اور زمانے کا ساتھ دیں۔ اسی نظریہ کے تحت آپ نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے۔ مغربی تہذیب و معاشرت کو اپنانے۔ سیاسی اندازِ فکر کو بدلنے۔ علم و ادب کا جدید سرمایہ جمع کرنے اور معیشت کی نئی راہیں تلاش کرنے پر زور دیا اور انہی اغراض کے لئے یہ قومی تحریک چلائی گئی جس پر پاکستان کا خاکہ تیار ہوا۔

اشاعتِ تعلیم چونکہ آپ کا دوسرا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی لئے آپ کے اس شوق کا آغاز ۱۸۵۹ء میں ہو گیا تھا۔ جب آپ نے مراد آباد میں پہلا فارسی مدرسہ قائم کیا اور ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے اندر دوسرا مدرسہ جاری کیا۔ جس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں آپ نے غازی پور میں ہی سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جسکا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم کی ترویج تھا۔

جدید تعلیم کے آغاز کے لئے سر سید نے ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپسی کے بعد ایک کمیٹی "ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی۔ جس نے ایک کالج کھولنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے محمڈن کالج فنڈ کمیٹی بنی۔ حکومت انگریزی نے اس تجویز کو سراہا۔ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے اپنی جیب سے دس ہزار روپیہ سر ولیم میور گورنر یو۔پی نے ایک ہزار روپیہ دیکر اس فنڈ کا افتتاح کیا۔ ۱۸۷۳ء میں مجوزہ کالج کی سکیم کمیٹی نے منظور کی۔ جس کے مطابق علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی جگہ ایم۔ اے۔ او ہائی سکول قائم کیا گیا۔ جس کا انتظام مولوی سمیع اللہ خان کے سپرد ہوا۔ جس کا افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو گورنر یو۔پی سر ولیم میور نے کیا۔ کالج کے لئے چندہ کی فراہمی کی مہم شروع ہوئی۔ نظام حیدر آباد نے نوّے ہزار روپیہ عطیہ اور چھ ہزار سالانہ امداد کا اعلان کیا جو بعد میں بڑھا دیا گیا۔ مہاراجہ پٹیالہ سے اس کے وزیر اعظم سیّد محمد حسین نے اٹھاون ہزار روپیہ دلوایا۔ حکومت نے اس کے لئے بارہ ہزار سالانہ کی گرانٹ مقرر کی۔ ضلع لاہور نے اس فنڈ میں ۲۱ ہزار روپیہ دیا اور سر سیّد اور ان کے

مخلص رفقاء کار کی مساعی جمیلہ سے علی گڑھ کالج قائم ہوا۔ جسکا ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن نے افتتاح کیا۔

سر سید احمد خان نے کالج کی تعمیر و ترقی کے لئے قریہ بہ قریہ اور در بدر پھر کر چندوں کی بھیک مانگی۔ مسلمانوں میں قابل عنصر کے فقدان کی وجہ سے انگریز پروفیسر اور ہندو عملہ رکھا۔ یہ مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی رہی کہ انہوں نے جب بھی غیر مسلموں پر اعتماد کیا۔ انہوں نے موقعہ پاکر مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے سے دریغ نہ کیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی ہندوؤں کی آنکھ میں خار کی طرح کھٹک رہی تھی اور وہ سر سید کی کمر توڑنے کے درپے تھے۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ شام بہاری لعل خزانچی نے کالج کا زائد از ایک لاکھ روپیہ غبن کرلیا۔ جس کا سر سید کو شدید صدمہ پہنچا۔ مگر قدرت کو چونکہ اس تعلیمی منصوبہ کی ترقی منظور تھی اسلئے مخالفین کی مخالفتوں کے باوجود یہ کالج یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچ گیا اور فی الواقعہ یہ پاکستان کا پہلا مورچہ ثابت ہوا۔ اسی لئے آج ہندو اسکا نام و نشان تک مٹانے کے درپے ہے۔

سیاسی نظریہ

باخدا جمہوریت اور بے خدا جمہوریت میں زمین و آسمان کا فرق ہے باخدا جمہوریت میں ارباب اقتدار یا عوام کی نفسانی اور شیطانی خواہشات پر چلنا پڑتا ہے۔ جیسے مغربی ممالک میں عوامی خواہشات پر ہم جنسی یا لواطت زناکاری اور استقاط حمل ایسے قبیح افعال کو قانوناً جائز قرار دیا گیا ہے۔ یا جیسے سکنڈے نیویا کے ممالک ناروے اور سویڈن کی پارلیمنٹ میں عوامی خواہشات پر بہن اور بھائی کے مابین شادی کا بل پیش کر دیا گیا۔ جو صرف گیارہ ووٹوں کی کمی کی وجہ سے پاس نہ ہو سکا۔ یا جیسے ایوبی دور میں قرآنی تقاضوں کے خلاف عائلی قوانین نافذ کر دیئے گئے۔ اسی لئے مغربی جمہوریت اسلام کے مزاج کے موافق نہیں کیونکہ اس میں ارباب اقتدار عوام کے نام اور اکثریت کے بل بوتے پر من مانی کرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے سر سید اس جمہوریت کے حامی نہ تھے۔

ہندوستان میں انگریزوں نے اپنے پاؤں جمانے کے بعد جمہوریت کا جو جال بچھایا

اور ایک مجلس وضع قوانین بنائیں تو اس میں کچھ عرصہ سرسید کو بھی مسلمانوں کی نمائندگی کرنی پڑی۔ جس کے دوران، بہت قریب سے ہندو ذہنیت کے جو مظاہرے سرسید کے مشاہدے میں آئے۔ انہوں نے سرسید کو چونکا دیا اور آپ نے اپنا سیاسی زاویہ نگاہ بدل لیا۔ سرسید نے اس کونسل میں آزاد بیانی اور حق گوئی کا ایسا ریکارڈ قائم کیا کہ آپ کے مخالف مولانا ابوالکلام آزاد اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے الہلال مورخہ ۱۱ر جون ۱۹۱۳ء کے شمارہ میں کونسلوں کے مسلمان نمائندوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:۔

"ہندوستان میں مجلس وضع قوانین کی ابتدا کو ایک قرن سے زیادہ زمانہ گزر گیا اور فارم پر بھی کونسل کا ایک پورا عہد انتخاب گزر چکا ہے۔ لیکن اس تمام عرصے کی پوری تاریخ پڑھ ڈالیے۔ یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ وہ تمام تر صرف ہندوؤں کی قابلیت۔ آزاد بیانی۔ حق پرستی اور ادائے فرض کے صدہا کارنامہ ہائے جلیلہ و عظیمہ کی سرگزشت ہے۔ اور سوائے ایک واقعہ کے مسلمانوں کے لئے کوئی تذکرۂ نمایاں اپنے اندر نہیں رکھتی۔

ایک واقعہ سے مراد سید صاحب مرحوم ہیں۔ جو کونسل کے ابتدائی عہد میں دو بار شامل کئے گئے۔ اور جنھوں نے مشہور البرٹ بل کے مباحثہ میں یادگار حصہ لیا تھا۔"

یعنی اس کونسل میں سرسید کے سوا کبھی کسی مسلمان نے ہندو اکثریت کے رعب کی وجہ سے کبھی کوئی قابلِ ذکر بات نہ کی تھی۔ تو مولانا آزاد کو سرسید کا ذکر کرنا پڑا۔ چونکہ اس کونسل میں بر بنائے آبادی ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اور مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس لئے ان کی کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی۔

یہی بات سرسید کی نظر میں کھٹک رہی تھی۔ آپ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں

کے برابر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں مسلمانوں کے مقابلہ میں چوگنی ہے۔ بس جو طریقہ انتخاب کا مقرر کیا جائے گا۔ اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا۔ تو چار ہندو ہوں گے اور اگر بغرض محال کوئی ایسا طریقہ رکھا جائے۔ جس کی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر ہوں تو موجودہ صورت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا۔ جو وائسرائے کی کونسل میں ہندوؤں کے مقابلہ میں کام کرنے کے قابل ہو"۔

اب جہاں ہندو مسلم سوال نہیں۔ کونسلوں کے تمام ارکان مذہب۔ معاشرت۔ تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے ہم جنس ہیں وہاں اکثریت کی بناء پر ارباب اقتدار من مانی کر رہے ہیں۔ لیکن باخدا جمہوریت میں یہ قطعاً ممکن نہیں۔ اسی لئے سرسید کی طرح علامہ اقبال بھی مغربی طرز کی اس جمہوریت کے خلاف تھے اور اسی غرض کے لئے قائداعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی تھی۔

(۵۱)

مولانا الطاف حسین حالیؔ

مقامِ حالی صاحبِ دل ۔ صاحبِ ایثار ۔ صاحبِ حیاء ۔ قدیم تہذیب کے محافظ ۔ مغربی تہذیب سے نالاں ۔ جدید تعلیم کے حامی مگر اس کے اثر و نتائج سے پریشاں ہمدردِ بنی نوعِ انساں مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالیؔ مروّت و شرافت کے پیکر تھے ۔ آپ بڑے رقیق القلب ۔ فرشتہ منش اور نیک نفس انسان تھے ۔ خاکساری ۔ فروتنی اور سادگی آپ کی فطرت میں داخل تھی ۔ آپ کا کلام آپ کے دردمند دل کی پوری عکاسی کرتا تھا ۔ نمود و نمائش کے عادی نہ تھے ۔ خود نمائی کے خوگر نہ تھے ۔ ہم عصروں اور ہم چشموں والی رقابت کا آپ میں نام و نشاں تک نہ تھا ۔ مال و جاہ کے دلدادہ نہ تھے ۔ حرص و ہوس کی آپ کو ہوا تک نہ لگی تھی ۔ قناعت کو آپ نے معیارِ زندگی بنا رکھا تھا ۔ اسی لئے ہر حال میں ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے تھے ۔ اگر کوئی آپ پر نکتہ چینی کرتا تو آپ اسے بُرا نہ مناتے تھے ۔ اسے عیب نہ سمجھتے تھے ۔ بلکہ اصلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔ جس سے آپ کی عالی ظرفی ٹپکتی ہے ۔ ضبط اور اعتدال کو آپ نے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق کا ارشاد ہے کہ :-

" مجھے اپنے زمانے میں بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔ لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور فضائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا " (میرے چند ہم عصر)

نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ :-

" سرسید کی جماعت میں ، بحیثیت انسان کے ، مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا ۔ اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچے تھے " (ایضاً)

مولانا حالی بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کے تو عادی تھے۔ مگر لبسا اوقات آپ چھوٹوں کا بھی بڑا ادب کرتے تھے۔ یہ خصوصیت بڑے بڑے عالی ظرفوں میں شاذ ہی دیکھنے میں آئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مولانا حالی کو "فرشتہ خصائل انسان" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:- "تاریخ سیاسی میں، تاریخِ تعلیمی میں، تاریخِ معاشرت میں، تاریخِ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب، شاعر، مصلح، محب وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی ذہنی کاوش کے چشمہ صافی سے جا ملتا ہے۔"

یہ "فرشتہ خصائل انسان" اس دور کی پیداوار ہے جو:-

"ہندوستان کی پستی اور تنزل کا انتہائی دور تھا۔ اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ تمدنی اور معاشرتی پستی حد کو پہنچ گئی تھی۔ مغلیہ سلطنت اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔ لوگ اجتماعی زندگی کی اہمیت اور عزت سے بے خبر اور بیگانہ اپنی اپنی انفرادی زندگی میں مگن تھے۔ انہوں نے باہر کی دنیا کے انتشار، ابتری اور تباہی سے ڈر کر عقل اور دماغ کی کھڑکیاں بند کر لی تھیں اور دل کی تسلی کے لئے ایک من کی دنیا الگ بنا لی تھی۔ امیر مال مست تھے۔ اور فقیر حال مست، عالم اپنی علمی دنیا میں محصور اور صوفی اپنے وارداتِ قلب میں مقید۔ شاعر اپنی خود پسندی اور عشق پرستی میں گرفتار۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کسی کو یہ فکر نہ تھی کہ کشتی ڈوبی تو سب کو ساتھ لے کر ڈوبے گی۔ نہ علم کا شیدائی عالم بچے گا۔ نہ تارک الدنیا زاہد۔ نہ عیش پرست رئیس۔ نہ تخیل پرست شاعر۔

ادب اور شاعری میں انفرادیت اور داخلیت کا رنگ اور بھی زیادہ گہرا تھا۔

ادیب اور شاعر۔ زندگی کی ترجمانی کا فرض ادا کرنے کی بجائے اپنی اپنی خیالی دنیائیں بنا کر اس میں قلعہ بند تھے اور زندگی کے تقاضوں اور شاعر کے اصلی نام سے منہ موڑے بے وقت کی راگنی گا رہے تھے"۔

(یادگار حالی)

ایسے نازک ترین دور میں اس فرشتہ خصلت انسان کا میدانِ جہاد میں اترنا اور روایات کے دریا کے بہاؤ کے مخالف پیرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر اس مردِ مجاہد نے نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر جس راستہ کو صحیح سمجھا۔ جس بات کو حق جانا۔ اسی پر اپنا سفرِ زندگی جاری رکھا۔ بالآخر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر دم لیا اور ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لیا۔

آباو اجداد

اس نامور شخصیت نے ۱۸۳۷ء میں اس دنیائے فانی میں قدم رکھا۔ آپ کا خاندانی تعلق قوم انصار سے تھا۔ جسکا سلسلہ نسب ۲۶ واسطہ سے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا۔ یہ قوم آپ کی ولادت سے قریباً سات سو برس قبل اس علاقہ میں آکر آباد ہوئی تھی۔ ساتوی صدی ہجری یا تیرھویں صدی عیسوی میں جب متحدہ ہندوستان کا نامور بادشاہ غیاث الدین بلبن تختِ دہلی پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے اپنے عہدِ حکومت میں قدیم اشراف خاندانوں کی قدر دانی میں بڑی شہرت پائی۔ والد کی طرح اسکا بیٹا سلطان محمد بھی علماء و شعراء کا بڑا قدر دان تھا اور اہلِ کمال کی بڑی عزت و تکریم کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے عہدِ حکمرانی میں ایران و ترکستان سے اکثر اربابِ علم و فضل نے ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں آکر انہوں نے بڑے سکون و اطمینان سے علم و حکمت کی بساط بچھائی۔

مولانا حالی کے آباو اجداد بھی انہی کے زمانہ میں پانی پت میں آکر آباد ہوئے تھے۔ جنھیں سلطان غیاث الدین بلبن نے ان کے مورثِ اعلیٰ خواجہ ملک علی کو قصبہ پانی پت میں بہت سی اراضیات بغرض رہائش و ذریعہ معاش عطا کیں۔ منصب قضا و صدارت

بازاری نرخ کی تشخیص۔ وہاں کے مزارات آئمہ کی تولیت اور خطابِ عیدین کا اعزاز بخشا۔ انہوں نے ہی پانی پت میں محلہ انصاریاں آباد کیا اور وہیں آپ کے والد خواجہ ایزد بخش نے سادات شہدا پور کے ایک معزز گھرانے میں شادی کی۔ جس کے بطن سے خواجہ الطاف حسین حالی پیدا ہوئے۔

مولانا حالی کو اس دارالفنا میں قدم رکھے ابھی نو ہی برس ہوئے تھے کہ آپ کے والد ماجد دارالبقا کو لوٹ گئے اور اس یتیم نے اپنے بھائی اور بہنوں کی سرپرستی میں پرورش پائی۔ انہوں نے سب سے پہلے آپ کو قرآنِ کریم حفظ کرایا۔ جس کی برکت سے آپ کے دل میں تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ مگر نامساعد حالات کی وجہ سے آپ کو کبھی بھی باقاعدہ اور مسلسل اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نصیب نہ ہوا۔ اور نہ کسی مکتب میں داخلہ لیا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں آپ نے میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ آپ نے ابھی سترھویں (۱۷) سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ آپ کی شادی کر دی گئی۔ جس کی وجہ سے مزید تعلیم کے دروازے بند ہو گئے اور تلاشِ روزگار کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ بھائی بہن کا تقاضا تھا کہ نوکری کرو اور گھر سنبھالو۔ مگر شوق مُصر تھا کہ کچھ اور پڑھ لو۔ اسی شوق نے آپ کو گھر چھڑا دیا اور آپ، اہلِ خانہ کو ان کے حال پر چھوڑ کر دلی آ گئے۔ جہاں آپ نے مولوی نوازش علی سے صرف و نحو اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔

اس زمانہ میں صرف عربی اور فارسی پڑھنے کا رواج عام تھا۔ اگرچہ دہلی کالج میں انگریزی تعلیم شروع ہو چکی تھی اور وہ بڑی رونق پر تھا۔ مولانا ذکاء اللہ۔ مولانا نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ اسی میں تعلیم پا رہے تھے۔ مگر دہلی پہنچنے پر مولانا حالی کو جو استاد اور سوسائٹی ملی۔ وہ انگریزی تعلیم کے مخالف تھی۔ وہ انگریزی مدرسوں کو مجہلے یعنی جہالت گاہیں کہتے تھے اور انگریزی خوانوں کو جاہلِ محض سمجھتے تھے۔ انگریزی

مدرسوں یا کالجوں میں زیادہ تر سرکاری نوکری کے شوقین ہی داخل ہوا کرتے تھے۔ اور فی الواقعہ یہ تعلیم گاہیں ایسے نوکر پیدا کرنے کے لئے قائم کی گئی تھیں۔ جو سرکار انگریزی کی حکومت کو فرنگی ذہن سے چلا سکیں۔ اس لئے وہاں ایسی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو اسلامی تقاضوں کے منافی تھی۔ مولانا حالی ڈیڑھ سال دہلی میں رہے۔ مگر اس عرصہ میں نہ انہوں نے دہلی کالج کی شکل دیکھی اور نہ ان کے دل میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اگر آپ انگریزی تعلیم حاصل کر لیتے تو پھر اپنی مشہور زمانہ مسدس مد و جزر اسلام نہ لکھ سکتے کیونکہ انگریزی تعلیم کا شروع سے مقصد ہی دلوں سے اسلامی اثرات کو مٹانا تھا۔ ابھارنا نہ تھا۔

اہل خاندان کے اصرار پر آپ ۱۸۵۵ء میں دہلی سے واپس پانی پت آ گئے اور شوق مطالعہ ہمراہ لائے۔ آپ نے اپنے طور پر مطالعہ کتب جاری رکھا۔ ۱۸۵۶ء میں آپ ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ مگر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب حصار سے انگریزوں کی عملداری اٹھ گئی تو آپ واپس پانی پت آ گئے۔ یہاں آ کر آپ نے پھر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اسی عرصہ میں آپ نے منطق۔ حدیث اور تفسیر پڑھی۔ علم و ادب کا مطالعہ شروع کیا اور نظم و نثر میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

قیام دہلی کے دوران آپ کی زیادہ تر آمد و رفت مرزا اسد اللہ خان غالب کے پاس رہی۔ ان کے اردو اور فارسی کے دیوان اور قصائد خود ان ہی سے پڑھے اور انہی کے مطالعہ سے آپ نے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ مرزا غالب اکثر اپنے ملنے والوں کو فکرِ شعر سے منع کرتے تھے۔ مگر جب انہوں نے مولانا حالی کی اردو فارسی کی ایک آدھ غزل دیکھی تو یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:-

"اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔"

فی الحقیقت یہ ظلم قوم پر ہوتا۔ جو مسدسِ حالی سے محروم رہتی۔ اس کے آئینہ میں اپنی صورت حال نہ دیکھ سکتی اور نہ سنوار سکتی۔ اس قیام کے دوران مولانا حالی نے صرف دو غزلیں کہیں اور وہی آپ کی متاعِ دہلی ہیں۔

عالی ظرفی

مرزا غالب کے ہاں مولانا حالی کی جوانی کے زمانے میں آمدورفت تھی۔ اور مرزا غالب کی مے نوشی کی عادت سے بخوبی واقف تھے۔ مولوی صاحبان کی تعلیمات کا اثر آپ پر غالب تھا۔ اسی لئے آپ کے مذہبی عقائد میں شدت تھی اور مرزا غالب کی اس عادت سے بہت پریشان تھے۔ مگر بحیثیت دوست اور شاگرد ان کی دینی، دنیوی اور اخروی بہتری کے ہر وقت خواہاں تھے۔ آپ نے جب دیکھا کہ مرزا غالب بڑھاپے میں بھی شراب نہیں چھوڑتے۔ نماز نہیں پڑھتے تو آپ کو شدید کوفت ہوتی۔ جیسا کہ مولانا حالی خود لکھتے ہیں کہ:۔

"جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ اسی قدر اس بات کی زیادہ تمنا ہوتی ہے کہ اسکا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات و مغفرت کے لئے ناگزیر ہے۔ چونکہ مرزا کے ساتھ محبت اور لگاؤ، بدرجہ غایت تھا۔ اسلئے ہمیشہ ان کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضوان میں ہمارا ان کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور مرنے کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔"

(یادگارِ حالی صہ ۳۷-۳۶)

چنانچہ اس شاگرد رشید سے نہ رہا گیا اور آپ نے دینی جذبہ اور جوشِ جوانی میں تبلیغ کا فرض کفایہ ادا کرتے ہوئے مرزا غالب کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا۔ جس میں انہیں نماز پڑھنے کی تاکید کی۔ فرض کا احساس دلایا اور درخواست کی کہ:۔

"آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا اشارے سے، غرض جسطرح ہو سکے۔ نماز پنجگانہ

کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی۔ مگر نماز ترک نہ ہو۔"

(ایضاً)

غالب نے اس نصیحت کو برا منایا اور اس پر باہمی خوب بیت بازی ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حالی نے اپنے اس فرض کفایہ کی ادائیگی کو" مذہبی خود لپسندی کے نشے میں سرشار جرانی" کی غلطی پر محمول کیا اور اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ وہ اپنے استاد کے حق میں بے ادبی کر بیٹھے ہیں۔ جس سے آپ کی عالی ظرفی ٹپکتی ہے۔ اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آجکل کی طرح اس زمانہ میں استاد کی پگڑی نہیں اچھالی جاتی تھی۔ اسکی پٹائی نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ فرض کفایہ کی طرف توجہ دلانے پر اس کے ادب و احترام کو ترجیح دی جاتی تھی۔

حسنِ قناعت

چار برس کی بیروزگاری سے تنگ آکر "غدر" کے بعد جب مولانا حالی تلاش روزگار کے سلسلہ میں پانی پت سے باہر نکلے تو دہلی کے رئیس نواب مصطفیٰ خان شیفتہ تعلقدار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے آپ کی شناسائی ہوگئی۔ آپ آٹھ برس تک ان کی صحبت میں رہے۔ اگرچہ اس زمانہ میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا ذوقِ شعر و سخن سرد پڑ چکا تھا۔ لیکن مولانا حالی کی آمد نے مہمیز کا کام کیا۔ جس سے ان کی شاعری میں پھر سے رعنائی آگئی اور دوسری طرف مولانا حالی کا طبعی میلانِ شعر و شاعری بھی چمک اٹھا۔ نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد، مولانا حالی پنجاب گورنمنٹ ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ جہاں آپ چار سال تک انگریزی کے اردو ترجمہ کی اصلاح کرتے رہے اور اس سے آپ کو انگریزی لٹریچر سے مناسبت پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد آپ دہلی میں اینگلو عربک سکول میں بطور مدرس تعینات ہوئے۔ اسی ملازمت کے دوران آپ کو ۱۳۰۵ھ میں بصیغہ امداد مصنفین نظام حیدر آباد دکن سے ۵۰/- روپے ماہوار کا وظیفہ ملا۔ جس میں چار سال بعد ۱۳۰۹ھ میں ۲۵/- روپے ماہوار کا اضافہ ہوگیا۔ اور اس کے بعد آپ نے ملازمت ترک کردی اور اسی

یکفیصد روپیہ ماہانہ کے وظیفہ پر قناعت کر لی کہ اتنی رقم میرے گزارہ کے لئے کافی ہے۔

تصنیف و تالیف مولانا نے چونکہ غدر کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس لئے اس نے آپ کی طبعِ سلیم پر گہرا اثر کیا۔ محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں کہ:-

"حالی کا کلام بظاہر قہقہوں سے خالی ہے۔ غدر ان کے لئے ایک ایسا نفسیاتی سانحہ تھا۔ جس نے ان کی سادہ زندگی کو خوشی سے محروم کر دیا۔ ان کے ہونٹوں پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں صرف افسردگی ہی نہیں ملتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنے آپ پر طنز کر رہے ہیں۔ یا اندرونی خلش یا دل کی ٹیس ہے۔ جو مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام" حالی کے کارنامے خونِ چمن ہیں۔ لیکن ان میں چمن کی رنگینی اور خون کی گرمی نام کو نہیں"

اس کے باوجود آپ نے تصنیف و تالیف۔ تنقید و تحقیق۔ طنز و مزاح۔ حقیقت نگاری اور مرثیہ گوئی میں بڑا کمال دکھایا۔ جس پر آپ کی مشہور مسدس مدوجزر اسلام۔ مجالس النساء۔ حیاتِ سعدی، مقدمہ شعر و شاعری۔ یادگارِ غالب۔ سرسید احمد خان کی حیاتِ جاوید۔ شاہدِ عدل ہیں۔ ان میں سے مسدسِ حالی کی مقبولیت کو تو کوئی کتاب نہیں پہنچی۔ جس کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ مجالس النساء پر کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن پنجاب نے چار سو روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا۔ جو دہلی کے ایجوکیشنل دربار میں خود وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک نے آپ کو پیش کیا۔ مسدس حالی کی اشاعت کے بعد کانپور میں مولوی فرید الدین سب جج کے ہاں محفلِ میلاد منعقد ہوئی جس میں مشاہیر شعراء جمع تھے۔ آپ نے جب مسدس سے محلِ ولادت کے مشہور بند پڑھ کر سنائے تو یہ نظم سن کر سب شعراء اسی طرح بدحواس ہو گئے۔ جسطرح دورِ جاہلیت میں عرب کے نامور شعراء قرآنِ پاک سن کر سر دھننے لگ جاتے تھے۔ ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ جو چھپ چکی ہیں۔ مولانا حالی نے

۱۸۶۸ء میں اصولِ فارسی کے نام سے فارسی صرف ونحو کے متعلق ایک بسیط اور مفصل کتاب اردو میں لکھی۔ جو پانچ حصوں پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب نہ مولانا حالی کی زندگی میں طبع ہو سکی اور نہ ان کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین مرحوم نے اس کی طباعت کی طرف کوئی توجہ دی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ خواجہ سجاد حسین کی لائبریری میں ۱۹۴۶ء تک موجود رہا۔ جسکا کچھ حصہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے وہاں سے خود نقل کیا۔ بعدازاں یہ قیمتی کتاب ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ اس قلمی نسخہ سے مولانا کے اردو رسم الخط کا پتہ چلتا تھا۔ آپ "چونکہ کو" جو کہ"۔ "اُنکی۔ اُسکی۔ اُس۔ اُن" کو" اونکی۔ اوسکی۔ اوس۔ اون" لکھا کرتے تھے۔ نون غنہ کا قطعاً استعمال نہ کرتے تھے۔ یعنی ہیں۔ نہیں۔ زبانیں کی جگہ ہین۔ نہین۔ زبانین لکھتے تھے۔ نون میں نقطہ ضرور دیتے تھے۔ یائے مجہول کو بالعموم یائے معروف لکھتے تھے۔ مثلاً نے۔ جتنے۔ ہے کو، نی۔ جتنی۔ ہی لکھا کرتے تھے۔ ٹ کو ٹ لکھتے تھے۔ گ کو ساری کتاب میں ک لکھا تھا۔ جیسے اگر کو اکر۔ گورنمنٹ کو کورنمنٹ پیچھے اور لکھی کو اسطرح پیچہے۔ لکہی لکھا ہوا تھا۔ ساری کتاب میں ڈیش۔ یا الگ الگ پیرے یا اضافت کی زیر کہیں موجود نہ تھی۔ مضمون مسلسل تھا۔ البتہ بعض مقامات پر جہاں نیا فقرہ شروع کرتے تھے وہاں سہ کی علامت بنا دیتے تھے۔

انوکھا مشاعرہ

کرنل ہالرائیڈ کی تحریک پر مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ایک نئی قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ یہ متحدہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا مشاعرہ تھا۔ جس میں مصرع طرح کی بجائے شاعروں کو کسی مضمون کا عنوان دیا گیا تھا تاکہ وہ حسبِ منشا اس مضمون پر طبع آزمائی کریں۔ اسی زمانہ میں مولانا حالی نے برسات۔ امید۔ انصاف اور حب الوطنی پر چار مثنویاں لکھیں۔

مولانا حالی اگرچہ لاہور میں چار سال رہے۔ مگر یہاں کی علمی ادبی فضا پر ابھی بہار نہیں آئی تھی۔ اسی لئے مولانا یہاں رہ کر خوش نہ تھے اور جاتے ہوئے لاہور کو یہ

سند دے گئے ؂

رہے لاہور میں، رہ کر سو جانے | یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام | کہ بلبل نا شناسائے چمن ہے

اسکے بعد دو تین مرتبہ آپ کو سرسید احمد خان کے ہمراہ لاہور آنا پڑا۔ اہلِ لاہور نے جس محبت اور خلوص سے سرسید کا خیر مقدم کیا تو اس کے متاثر ہو کر آپ کو یہ کہنا پڑا ؂

خدا کی رحمتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر
جنھوں نے ہر سفر میں تجھ کو آنکھوں پر بٹھایا

حالی اور شاعری

شاعر کو زیادہ تر قلبی اور ذہنی سکون اپنی شاعری سے ملتا ہے لیکن حالی اپنی ۲۱-۲۲ سالہ شاعری سے مطمئن نہ تھے۔ اسے بیکار سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس سے نہ قوم کی اصلاح ہوتی تھی۔ نہ قومی جذبہ یا ولولہ ابھرتا تھا۔ نہ انسان کو انسان بنانے کی غرض پوری ہوتی تھی۔ لیکن اس جذبہ اس تمنا کے پورا ہونے کی کوئی سبیل بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ صحیح راستہ کا تعین نہ ہو رہا تھا۔ کوئی مخلص، ہمدرد۔ مونس۔ دمساز نہ مل رہا تھا۔ جو آپ کو اس راہ پر چلا دیتا۔ جو ملک و ملت کے لئے مفید ہوتی۔ اس لئے آپ افسردہ و مایوس رہتے تھے۔ جبکا آپ نے خود مسدس حالی کے دیباچہ میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:-

"بچپن کا زمانہ جو حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے دلچسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا۔ جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے۔ نہ خار دار جھاڑیاں تھیں۔ نہ آندھیوں کے طوفان، نہ بادِ سموم کی لپٹ تھی۔ جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا، اس سے بھی زیادہ دلفریب نظر آیا۔ جس کے

دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا۔ اسی قدر وحشت خیز بھی تھا۔۔۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابلِ دید تھی۔ مگر دنیا کی مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی نہ وصل کی لذت اٹھائی۔ نہ فراق کا مزا چکھا ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔۔۔ بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے۔ وہیں ہیں۔۔۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدانِ وسیع نظر آیا۔ جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لئے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ آگے قدم بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں۔ مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین تک محدود رہی ہو۔ ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقتِ رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن پاؤں میں چکر تھا۔ اس لئے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا؛

مُرشدِ کامل

مگر چونکہ خالقِ کائنات نے آپ سے پاکستان ساز کام لینا تھا۔ اسلئے اس نے اسی وہم وگمان کے ایک انسان کو آپ کا دستگیر بنا دیا۔ جس نے چشم زدن میں آپ کو ایک ایسی راہ پر لگا دیا۔ جس سے بالآخر حالی کو وہ سکون واطمینان نصیب ہوا۔ جس کے وہ خواب دیکھ رہے تھے اور آپ کی حیات بے مایہ قوم کا سرمایہ بن گئی۔ وہ کون تھا۔ کیا کرتا تھا۔ اور کیا چاہتا تھا۔ اس کی تفصیل خود راہ نورد کے الفاظ میں لطف دے گی اور اس کی شناخت میں آسانی پیدا کر دے گی۔

مولانا حالی اپنے اس مُرشد کامل کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں :-

"ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے۔ ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے جو اس کے ساتھ تھے۔ تھک کر پیچھے رہ گئے بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں وخیزاں چلے جاتے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ پیروں میں چھالے پڑے ہیں۔ لیکن وہ اولالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے۔ اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اسے رستے کی تکان ہے۔ نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پرواہ ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کے جزن میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے۔ کہ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ وکوفتہ اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لئے سے

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے۔

قوم کا میلان

حالی کا یہ پیر کامل اپنے وقت کا قائدِ ملت تھا اور قائدِ اعظم کی طرح اس پر کفر کے فتوے لگ رہے تھے۔ وہ بھی کفرستان کو پاکستان میں بدلنے

کے لئے کوشاں تھا۔ وہ اسوقت "پاکستان" کے لئے تگ و دو کر رہا تھا۔ جب بقول حالی:-

"قوم کا میلان ایک عرصہ دراز سے روز بروز پستی کی طرف ہوتا جاتا تھا۔ ان کی تمام خوبیاں آہستہ آہستہ مٹتی جاتی تھیں۔ علم میں، دولت میں، اخلاق میں، درجہ میں وہ اپنے ہموطن قوموں سے گرتے جاتے تھے۔ مگر یہ پستی اور تنزل بہ ظاہر چنداں محسوس نہ ہوتا تھا۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء میں آندھی اٹھی۔ جس نے اس "ٹمٹماتے چراغ" کو بالکل بجھا دیا۔ یکایک مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چند گھرانے جو کسی قدر نام و نمود رکھتے تھے۔ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئے اور ہزاروں معرکۂ بغاوت میں مارے گئے اور ہزاروں جانیں دوسروں کے لئے عبرت کا سبق دینے میں کام آئیں۔ ہزاروں اپنا وطن اور شہر و دیار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے اور جو باقی بچے ان کا حال یہ تھا کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ گھر چھن گئے۔ جائیدادیں ضبط ہو گئیں۔ بڑے بڑے عالی خاندان فقیر ہو کر تکیوں میں جا بیٹھے۔ بہت سے بھیک مانگتے پھر رہے تھے۔ باورچی گیری اور خدمت گاری کر رہے تھے۔ مشکیں اٹھاتے تھے اور گاڑیاں ہانکتے تھے۔"

(مقالات حالی۔ جلد دوم صہ ۴۴)

اس وقت اس ناخدا نے حالی کو قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگانے، خوابِ غفلت میں سرشار قوم کو پھر سے جگانے، اس کے بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارنے اور گرے ہوئے اخلاق کو ابھارنے پر اکسایا، جب حالی کا دل شاعری سے بھر چکا تھا اور اب اسے غلط بیانی کرتے شرم آتی تھی تو اس وقت اس قائد نے، ملت کے اس بہی خواہ نے حالی کو غیرت دلائی کہ:-

"حیوانِ ناطق ہونے کا دعوٰی کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا، بڑے شرم کی بات ہے۔۔۔۔ ایسے وقت میں جبکہ عزیز ذلیل ہو گئے۔ شریف

خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے.... ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔ ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ اور لکھ چکے ہیں۔ مگر نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے۔ قوم کو بیدار کرنے کے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔"

مسدسِ حالی

اس ناصح۔ غمخوارِ ملت۔ قوم کے سچے خادم اور خیر خواہ سر سید احمد خان کی یہ جادو بھری تقریر اثر کر گئی۔ حالی کی باسی کڑھی میں ابال آیا۔ اس کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور اس کے افسردہ و پژمردہ دل و دماغ سے جو آہ نکلی۔ وہ اسلام کا مدوجزر بن گئی اور "مسدس حالی" ہر سوتے دروازے کو کھٹکھٹاتے اور ہر دلِ خوابیدہ کو جگانے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے سر سید کی دلی آرزو پوری کر دی اور اسے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی تقلید کرنی پڑی۔ جنھوں نے کہا تھا کہ اگر قیامت کے دن سوال ہوا کہ تو کیا لایا ہے۔ میں امیر خسرو کو پیش کر دوں گا۔ سر سید احمد خان نے حالی کی ذات و صفات پر فخر کرتے ہوئے یہی فقرہ دہرایا کہ :-

"بے شک میں مسدسِ حالی کا محرک ہوں اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں۔ کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا۔ تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور بس...."

مسدس حالی پر رام بابو سکسینہ نے حالی کو یوں خراج تحسین ادا کیا کہ :-

"یہ ایک الہامی کتاب ہے۔ اس کو تاریخ ارتقائے ادبِ اردو میں ایک سنگ

نشان سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایک تارا ہے۔ جو اردو کے افقِ شاعری پر طلوع ہوا۔
اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی"

(یادگارِ حالی صہ ۲۱۵)

وہ شاعری جو ایشیا میں صرف حسن و عشق کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس کو حالی نے مسلم خوابیدہ کے جگانے کے لئے استعمال کیا۔ جس نے اسلامیان ہند میں انقلاب عظیم پیدا کیا اور اس کے ذریعہ:۔

"اسلام کی تعلیم کے رخِ روشن پر زمانے کے تعصب، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہروی کی وجہ سے جو پردہ پڑ گیا تھا۔ حالی نے اس پردے کو اٹھا کر دکھایا کہ اسلام ایک مذہبِ امن ہے۔ جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالمگیر اخوت قائم کرنا تھا۔ اس نے فقیری میں خود داری اور جدوجہد اور ثروت میں فیاضی خدا ترسی اور خود شناسی سکھائی تھی۔ اس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اس کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر و عمل کو مسخر کر لیا تھا"

جسے بعد میں یہ امت بھلا بیٹھی تھی اور جس کی حالی نے پھر سے یاد دہانی کرا دی اور اس کے ذریعہ وہ فکری شعور پیدا کیا۔ جو تعمیر پاکستان میں کام آیا۔

عزت افزائی

حالی کی نظر بصیرت کے سامنے کوئی چیز چھپی ہوئی نہ تھی۔ وہ معاشرہ کے ہر گوشہ پر نظر غائر دوڑا رہے تھے اور قوم کی حالت زار پر نظم و نثر کے ذریعہ روشنی ڈال رہے تھے۔ آپ کی ہر تصنیف حبّ وطن اور فلاحِ قوم کے جذبہ کی مظہر تھی۔ جو انگریز کے تئیں محل نظر تھا۔ اسی لئے اس نے بغیر کسی تحریک کے مولانا حالی کو "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا۔ تاکہ اس جذبہ کو ٹھنڈا کیا جائے اور مولانا حالی کو

اپنے قریب لایا جائے۔ جیساکہ ہر حکومت کا دستور چلا آتا ہے۔ مگر مولانا حالی کے نزدیک ان خطابات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اگر یہ خطاب نہ بھی ملتا۔ تب بھی مولانا حالی فن شاعری کے مجدّد اور متمّم تھے۔ فی الواقعہ شمس الائمہ تھے۔ علامہ تھے۔ اسی لئے مولانا شبلی نے اس خطاب پر آپ کو یہ لکھا کہ:-

"میں آپ کو نہیں، لیکن خطاب شمس العلمائی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس خطاب کو اب جاکر عزت حاصل ہوئی۔"

اس سرکاری خطاب کو قبول کرنے کے بعد جب اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا وقت آیا تو آزاد منش۔ گوشہ نشین۔ تنہائی پسند حالی بڑا گھبرایا کہ یہ سرکار۔ دربار کی حاضری کا فریضہ کیسے ادا ہو؟ چنانچہ آپ نے اپنے فرزند خواجہ سجاد حسین کو لکھا کہ:-

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہیں ملتا تھا۔ اور ایسے مواقع پر ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا۔ یا کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آئے گا۔ لامحالہ وہاں جانا پڑے گا . . . . بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟"

مگر اس "طوق" کے باوجود بقول مولانا محمد علی جوہر" حالی نے کبھی بازار میں بکنا گوارا نہ کیا مولانا حالی کا یہ امتیازی کیریکٹر تھا جو ہماری قوم میں بہت ہی کم نظر آتا ہے"۔ اس خطاب کے باوجود مولانا حالی نہایت خاموشی سے علم و ادب اور ملک و ملت کی خدمت میں مصروف رہے اور ان کی زبان و قلم کی روانی یا اثر و تاثیر میں کوئی فرق نہ آیا۔ جو ایک قسم کی کرامت ہے۔

ترقی پسندی

دورِ حاضرہ کے "ترقی پسند" شعراء کے نزدیک اگرچہ مولانا حالی رجعت پسند تھے۔ لیکن فی الحقیقت اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق مولانا حالی ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ آپ نے قدامت پسندی۔ روایت پرستی۔ مادیت پرستی۔ نفرت و تعصب اور جہالت و بے عملی کے بت توڑے۔ شعر و ادب کے نئے سانچے تیار کئے۔ زمانہ کا ساتھ دینے والا ادب پیدا کیا۔ قوم کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ حق اور سچ کہہ کر ساری دنیا کا بَیر مول لیا۔ گالیاں کھائیں۔ طعنے سہے مگر کھری کھری سنانے سے باز نہ آئے۔ آپ جدید تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۰۷ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے خطبہ صدارت میں آپ نے برملا مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کا ان الفاظ میں مشورہ دیا کہ:-

"مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں۔ بلکہ ضرور ہے کہ تعلیم کے ہر شعبہ میں دست گاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں، جس میں ان کے ہموطن ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ وہ زمانہ قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر سے بلکہ اپنی بقاء اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا۔"

اس سے آپ کی رجعت پسندی کی تردید ہوتی ہے۔ آپ صرف یونیورسٹی کی تعلیم پر ہی زور نہ دیتے تھے بلکہ مسلمانوں کو صنعت و حرفت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تاکید کرتے تھے۔ جو زندگی کے اس شعبہ میں بھی ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ یہانتک کہ آپ نے "آلی نامہ" لکھ کر فرقہ بندی۔ تنگ نظری۔ حماقت۔ جہالت۔ تعصب وغیرہ کا مذاق اڑایا جیسا کہ مندرجہ ذیل الفاظ اور ان کے قائم کردہ معانی سے عیاں ہے:-

لفظ	معنی	لفظ	معنی
المذہب	اعلانِ جنگ	الامتحان	آزمائشِ لیاقت ممتحنان

لفظ	معنی	لفظ	معنی
الدین	تقلید آبا و اجداد	الیونیورسٹی	کارخانہ کلرک سازی
العلم	قسمے از جہل مرکب	الواعظ	آنکہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند۔
المولوی	آنکہ مسلماناں را از دائرہ اسلام خارج می کردہ باشد		

وغیرہ۔ اس سے بڑھ کر آپ کی ترقی پسندی کا ثبوت آپ کے خطوط سے ملتا ہے۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو ایک مثنوی کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"بہت عمدہ مثنوی ہے۔ اس میں کسی قسم کے تصرف کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ کہیں کہیں شعرائے ایران و ہندوستان کے مسلمات کے خلاف کیا گیا ہے۔۔۔ ۔ مگر میرے نزدیک اب ان قیود کو اٹھا دینا ہی بہتر ہے جن کے سبب شاعری کا میدان تنگ ہو گیا ہے۔"

(نقوش۔ ادب عالیہ نمبر)

الحاد کی وبا

متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کے ورود نامسعود سے ہی الحاد و دہریت کی وبا پھیل گئی تھی۔ انگریزوں نے اس ملک کے اخلاقی اور دینی نصاب تعلیم کو یکسر بدل کر لادینی نصاب جاری کر دیا تھا۔ جو آج تک نہیں بدلا گیا۔ اس نصاب کو بدلنے کی بدولت آج سے قریباً پونے دو سو سال پہلے الحاد و دہریت وبا کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ جو آج اپنے نقطہ عروج پر نظر آ رہی ہے۔ اس روز افزوں وبار کے خلاف نواب سید علی حسن نے "فطرت الاسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کی اشاعت کے بعد انہوں نے وہ مولانا حالی کی خدمت میں بھی بغرض تبصرہ بھیجی۔ جس پر مولانا حالی نے لکھا:-

"فہرست مضامین دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس زمانے میں جبکہ دہریت

اور الحاد وبائے عام کی طرح چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ ایسی کتابوں کا شائع ہونا نہایت ضروری اور مفید ہے۔"

دہریت والحاد کی وبائے عام کی بدولت اُسی زمانہ سے اربابِ دین و دانش کا قحط شروع ہوگیا تھا۔ جس کا تذکرہ مولانا حالی نے مولانا حبیب الرحمٰن خان کے نام اپنے خط مورخہ ۲۶ جون ۱۹۰۲ء میں یوں کیا:۔

"مسلمانوں میں اول تو قحط الرجال ہے۔ پھر خاص کر روسا طبقہ میں تو علمی ذوق بالکل مفقود ہوگیا ہے۔"

وسعتِ نظر

خواجہ الطاف حسین حالی، عظمتِ رفتہ کے مصنف ضیاء الدین احمد برنی کے والد منشی محمد دین کے دوستوں میں سے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی ضیاء الدین احمد بھی بدوران تعلیم دہلی میں مولانا حالی کے پاس چلے جاتے تھے۔ مولانا حالی ان کی اہلیت۔ صلاحیت اور رغبت کا اندازہ لگانے کے لئے ان پر اکثر سوال کرتے رہتے تھے۔ ایک دن آپ نے ان کے والد کو مشورہ دیا کہ:۔

"الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ ضیاء الدین احمد صاحب بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہوگئے ہیں۔ وہ دو تین دفعہ مجھ سے دہلی میں ملے ہیں۔ نہایت لائق اور ہونہار نوجوان ہیں۔ اب ان کو ایسا پیشہ سکھانا چاہیئے۔ جس سے ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت ہو اور جس کام کی ان میں کافی قابلیت ہو۔ اس کا فیصلہ وہ خود کرسکتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا میلان خود ان کا رہنما ہوگا۔"

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرتی حالات پر مولانا کی کتنی گہری نظر تھی۔ ان کے پیش نظر آجکل کی طرح زیادہ تنخواہ، یا یافت والی ملازمت، کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ بلکہ آپ کے پیشِ نظر یہ سنہری اصول تھا کہ دنیا میں وہی لوگ اپنے پیشہ میں چمک سکتے ہیں۔ جو اپنی افتادِ طبع اور صلاحیت کو رہنما بنا کر سفرِ زندگی شروع کرتے ہیں۔ مغربی دنیا میں یہی اصول

آج بھی کارفرما ہے۔

مشکلاتِ مصنّفین آجکل کی طرح اُس زمانہ میں بھی سنجیدہ تصانیف اور ان کے مصنّفین کو معاشرہ میں وہ مقام حاصل نہ تھا جو مغربی دنیا میں نظر آتا ہے۔

مولانا حالی نے حیاتِ سعدی اور مدوجزر اسلام (مسدس حالی) نظام حیدرآباد دکن کے اربابِ اقتدار کے اس ایماء پر لکھی چھپوائی تھیں کہ وہ یہ کتابیں خرید لیں گے۔ چنانچہ ان کے چھپنے پر آپ نے ان کے دو دو نسخے نواب محسن الملک کو بھیجدیئے۔ جواب باصواب نہ ملنے پر آپ نے انہیں ۲۶، مارچ ۱۸۸۶ء کو ایک یاد دہانی نامہ لکھا۔ جس میں انہیں تحریر کیا کہ:۔

"جو محنت اور زیر باری مجھ کو برداشت کرنی پڑی ہے۔ امید ہے کہ اس کا خاطر خواہ تدارک ہو جائے گا۔ اگرچہ ہندوستان میں مصنف کی وقعت ایک بُک سیلر سے زیادہ نہیں ہے اور نہ میرا آپ پر کوئی ایسا حق ہے۔ جس کے سبب سے میں آپ کو ایسی تکلیفیں دینے کا مجاز سمجھوں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ آپ کے ساتھ ہم لوگوں کو ایک حسنِ ظن ہے کہ جس امر کی تحریک کو ڈھائی برس سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ آج تک اس سے قطعی مایوسی تو نہیں ہوئی۔ خیر کامیابی تو بہت مشکل ہے۔ اگر یہ امید بھی قائم رہے تو غنیمت ہے۔"

یہ پیرا اس امر کا غماز ہے کہ برِعظیم ہند و پاکستان کے نامور اہلِ قلم کو آج کی طرح اس زمانہ میں بھی سینہ پر پتھر رکھ کر قلم اٹھانا پڑتا تھا اور ان کی دماغ سوزی کا برائے نام معاوضہ انہیں کتنی صبر آزما صورتوں میں بمشکل ملتا تھا۔

۱۲، دسمبر ۱۸۹۲ء کو آپ نے مولانا سیّد احمد دہلوی مصنف فرہنگِ آصفیہ کی سفارش کرتے ہوئے نظام حیدرآباد کے ایک اعلیٰ افسر کو جو چٹھی لکھی۔ اسکا مندرجہ ذیل اقتباس مصنفین کی کس مپرسی اور خودداری کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔

"جو مشکلات ان کو درپیش ہیں۔ ان کے حل کی توقع سرکار عالی کے سوا اور سرکار ممدوح میں آپ کے سوا کسی سے نہیں کی جا سکتی۔ پس بجائے اس کے کہ میں خدمت عالی میں ان کی سفارش کروں۔ میری یہ دعا ہے (نہ محض بمقتضائے فطرتِ انسانی بلکہ بہ امید استجابت) کہ ان کی پچیس سال کی محنت و جانفشانی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا ہو اور آپ کی عنایت و توجہ کی بدولت اسلام کی ایک لازوال نشانی یعنی زبانِ اردو ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے جڑ پکڑ جائے۔ یہ احسان صرف مولوی سیّد احمد پر نہیں بلکہ تمام ہندوستان پر عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں پر خصوصاً سمجھنا چاہیئے۔"

یہ زمانہ کی کتنی ستم ظریفی ہے کہ جس زبان اردو کے تحفظ و بقار کے لئے اس کے محسنین اتنے واسطے دیتے چلے گئے۔ پاکستان کے مسلمان اس کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کر رہے ہیں۔

اس زمانہ میں اولاً تو رئیس طبقہ میں علمی ادبی ذوق کم تھا۔ اگر کوئی صاحبِ ذوق اپنی علمی کاوش منصۂ شہود پر لاتا تو اسکی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوتی۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خان رئیس بھیکم پور نے "علمار سلف" کے نام سے اپنی نوعیت کی پہلی کتاب لکھی اور اس کی ایک کاپی بغرضِ تبصرہ مولانا حالی کو بھیجی۔ اس کے جواب میں مولانا حالی نے انہیں ۱۰ ستمبر ۱۸۹۸ء کو جو خط لکھا۔ اس میں یہ تحریر تھا۔ جس سے اس دور کے ذوق کا پتہ چلتا ہے:-

"مسلمان اور خاص کر پرانے خیالات کے مسلمان ایسی کتابوں کے خریدنے میں بہت ممسک ہیں۔ اس لئے مدارس اسلامیہ میں اس کو مفت تقسیم کرنا چاہیئے۔ آخیر میں دعا ہے کہ خدا تعالےٰ ہمارے عام رئیسوں اور رئیس زادوں کو اسی طرح زیورِ علم۔ لیاقت اور حسن اخلاق سے آراستہ کرے۔"

تصنیف کے بعد کتابوں کی فروخت کے سلسلہ میں بھی مولانا حالی کو بڑے صبر آزما حالات

سے دوچار ہونا پڑا ۔ سرسیّد احمد خان کی سوانح "حیاتِ جاوید" کے سلسلہ میں آپ نے مورخہ ۶-۷-۱۹۰۰ کو مولانا حبیب الرحمٰن خان کو لکھا کہ :-

"میں نے باوجود اپنی قابلیّت کے اس بارِ گراں کو اپنے ذمہ لیکر سرسیّد کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ہے ۔ اور اسلئے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سرسیّد کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے ۔ مگر آج تک کسی نے اسکی بات تک نہیں پوچھی ۔ بلکہ امداد کی بجائے بعض اصحاب متوقع ہیں کہ ان کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیۃً پیش کی جائے "

ں خط میں مزید شکوہ یہ کیا کہ :-

" جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ۔ ان کی طرف سے سرد مہری کے سوا میں نے اب تک کچھ نہیں دیکھا ۔ اگرچہ اس قلیل عرصہ میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں ۔ مگر ایسی قدر دانی سے وہی شخص خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا اور کوئی مقصد خیال نہیں کرتا "

دو قومی نظریہ

دو قومی نظریہ کوئی نیا نہیں ۔ یہ آج سے پون صدی قبل بھی ذہنوں میں کار فرما تھا ۔ جس کی موجودگی کا پتہ مولانا حالی کے اس خط سے چلتا ہے جو انہوں نے ۱۸ / اگست ۱۹۰۲ء کو مولوی بشیر الدین کو کانفرنس گزٹ کی اشاعت کے سلسلہ میں لکھا کہ :-

" کانفرنس گزٹ کا بطور ضمیمہ کے البشیر کے ساتھ شائع ہونا بہت مناسب ہے ۔ خدا کرے وہ مفید بھی ہو ۔ ایک صاحب نے یہ صلاح دی ہے کہ کانفرنس گزٹ کے اوپر ذرا خفی قلم سے یہ الفاظ اور لکھنے چاہئیں " ایم ۔ اے ۔ او

ایجوکیشنل" تاکہ اور قوموں کی کانفرنس اور مسلمانوں کی کانفرنس میں تمیز ہو۔
میں بھی اس رویے کو پسند کرتا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے"۔

سفرِ آخرت

۱۹۰۵ء میں آپ نے اپنے اہل وطن کے چندہ سے پانی پت میں ایک پبلک اورینٹل لائبریری قائم کی اور ایک ہائی سکول کی بنیاد رکھی۔ جسے حالی مسلم ہائی سکول کا نام دیا گیا۔ اسی سال کے آخر میں آپ میر محبوب علی خان نظام حیدر آباد کے جشنِ چہل سالہ کی روئیداد مرتب کرنے کیلئے حیدر آباد بلائے گئے۔ جون ۱۹۰۶ء میں وہاں سے واپسی کے بعد آپ کی ایک آنکھ میں پانی اتر آیا۔ جسکا ۱۹۰۷ء میں پٹیالہ میں اپریشن ہوا۔ اسی سال آپ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ کراچی میں آپ نے اپنا خطبہ صدارت پڑھا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کی دوسری آنکھ کا اپریشن ہوا۔ اور ۳۱، دسمبر ۱۹۱۴ء کی رات کو آپ اپنے مالکِ حقیقی کے حضور میں حاضر ہو گئے۔

(۶)

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح

تبحرِ علمی

ضعیف الجثہ، منحنی جسم۔ مشتِ استخواں۔ منکسر المزاج۔ جامع شریعت۔ جامع العلوم۔ ذہین و فطین۔ سلیم الطبع۔ مجاہد پیکر۔ نمونۂ سلف۔ صاحبِ قوت و شوکت۔ شہرت و عظمت۔ خلوص و ایثار۔ حافظِ قرآن و حدیث۔ مایۂ ناز فرزندِ اسلام شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیرِ مالٹا، مولانا ذوالفقار علی کے فرزند ارجمند تھے۔ جو متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی دینی یونیورسٹی دار العلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے بھی اسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر اسی میں مدرسِ اول لگے اور ۱۸۸۶ء میں صدر مدرس ہوئے اور ۳۲ سال تک اسی عہدہ پر نامزد رہے۔ آپ نے سند حدیث استاذہ الاساتذہ شاہ عبد الغنی دہلوی مہاجر مدنی سے حاصل کی۔ جن کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے ملتا ہے اور شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ رح مہاجر مکی کے ہاتھ پر بیعت کی سعادت حاصل کی اور انہوں نے آپ کو سندِ خلافت اور اجازتِ عام بیعت سے بھی ممتاز فرمایا۔ آپ کے بلاواسطہ ایک ہزار کے قریب فارغ التحصیل و عالم شاگرد تھے اور بالواسطہ شاگردوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کابل۔ قندھار۔ بلخ بخارا۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور یمن تک کے لوگ آپ سے فیضیاب ہوئے تھے۔ آپ ہمیشہ رضائے الٰہی اور خدمتِ دینِ متین کے طور پر دار العلوم کی خدمت کرتے رہے۔ کبھی ترتیب درجات یا مقدار مشاہرات پر نظر نہ رکھی۔ صرف بقدر ضرورت مشاہرہ قبول فرماتے تھے۔ بارہا مشاہرہ نہ لینے کا عزم کیا مگر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے ادب سے مجبور ہو کر کچھ لیتے رہے۔ اس میں جب اضافہ ہوا تو وہ آپ نے قبول نہ کیا اور کچھ عرصہ بعد مشاہرہ بالکل بند کر دیا اور فی سبیل اللہ بڑی دلسوزی اور پابندی کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۲۹۴ھ میں آپ نے

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ حضرت مولانا رفیع الدینؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ ایسے اکابر مشاہیر کے ہمراہ فریضہ حج ادا کیا۔ اتنے عظیم اور بلند پایہ علمار کا قافلہ نہ کبھی پہلے اس راہ سے گزرا تھا اور نہ بعد میں گزرا!

فہم وفراست متحدہ ہندوستان کے معروف جریدہ مدینہ بجنور نے آپ کا یوں تعارف کرایا ہے:۔

"حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ایسی کمائی تھی کہ جو علوم وفنون، افکار وخیالات میں اپنے استاد کے حقیقی جانشین اور چھوڑے ہوئے کاموں کے پورا کرنے والے تھے۔ یہ شیخ الہند تھے کون؟ ایک عالمِ ربانی وعارفِ یزدانی تھا۔ جو اپنے کام و دھن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا۔ نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم۔ اس نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی نہ روسو اور نہ مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ نہ گلیڈسٹون کے مجموعہ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن اسپنسر کے افکار و نظریات سے۔ اس نے نہ کسی دل کشی کا خط اٹھایا تھا۔ اور نہ عشرت کدۂ فرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی۔ ان سب چیزوں کے برعکس اس کا شیرازۂ حیات قال اللہ وقال الرسولؐ اور اس کی زندگی کا خمیر اتباع سنتِ نبویہ تھا۔ اس کے فکر و نظر کا تار و پود احکامِ الہٰی کے انوار سے بنا۔ اور شریعت اسلام کے آفتاب جہاں تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا۔ سینہ میں صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا۔ بظاہر وہ اپنے گوشہ منزلت میں سب سے الگ تھا۔ لیکن اس کی نظر جہاں بین میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں۔ نیشنل کانگرس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ لیکن شیخ الہند یہاں اس حکومت

کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے"

انقلابی ذہن

مولانا محمود الحسن چونکہ انقلابی ذہن رکھتے تھے اور دین کی سربلندی چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ہر مکتبِ فکر سے اس معاملہ میں تعاون کے عادی تھے۔ دیوبند اور علی گڑھ کے بانیاں ولی اللٰہی خاندان کے فیض یافتہ تھے۔ اگرچہ ان کا طریق کار مختلف تھا۔ لیکن مقصدِ حیات ایک تھا۔ یعنی مسلمانوں کو تنزل کے گڑھے سے نکالنا اور بامِ عروج پر پہنچانا۔ گو اس تک پہنچنے کے راستے اور سیڑھیاں الگ الگ تیار کی گئی تھیں۔ مگر اہلِ نظر چونکہ منزلِ مقصود پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اس لئے مولانا محمود الحسن اپنے شدید انقلابی خیالات اور اختلافات کے باوجود علی گڑھ تحریک کو بھی ضروری اور مفید سمجھتے تھے۔ کیونکہ علی گڑھ میں مذہب اور دینیات کے شعبے اربابِ دیوبند کے سپرد تھے۔ اور اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد اور مولانا مملوک علی کے نواسے علی گڑھ میں ناظم دینیات تھے۔ جو بزرگانِ دیوبند میں شمار ہوتے تھے۔ ان ہر دو مکتبِ فکر کے درمیان اختلاف صرف جہاد کے طریق کار پر تھا۔ مولانا شیخ الہند انگریزوں کی حکومت برداشت نہ کرتے تھے۔ اور سر سید احمد خان مسلمانوں کو انگریزوں کی حکومت میں کچھ حصہ دار بنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو کام باہر رہ کر احسن طریق سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ اندر بیٹھ کر بخوبی سرانجام دیا جا سکے گا۔ جس کی بعد ازاں تحریک پاکستان میں علی گڑھیوں کی پرجوش قیادت نے تائید کر دی۔ اس لئے حضرت شیخ الہند نے اپنی زندگی کا دوسرا انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان نظریاتی اختلافات کی جو خلیج وسیع تھی۔ اس کے پاٹنے کا انتظام کر دیا اور علی گڑھ کالج سے یہ معاہدہ ہو گیا کہ:-

"انگریزی خواندہ طلباء جو تبلیغ کا شوق رکھیں۔ وہ دار العلوم دیوبند میں جا کر علوم اسلامیہ حاصل کریں۔ جس کا دار العلوم خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ ان طلباء کو خاص اہتمام کے ساتھ انگریزی تعلیم دے گا۔ جو دار العلوم

دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج جائیں گے "

جس کا ذکر خیر خود حضرت شیخ الہند نے مورخہ ۲۹، اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بمقام علی گڑھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے موقعہ پر یوں کیا۔

" اے نونہالانِ وطن ۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی تھیں ۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں ۔ تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اسطرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا "

(موجِ کوثر صہ ۲۲۴)

شیخ الہند نے اس سلسلہ کا آغاز ۱۹۰۹ء میں جمیعۃ الانصار کے قیام سے کیا۔ جس کی بدولت علی گڑھ سے یہ معاہدہ ہوا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہند جب اپنی انقلابی تحریک کے سلسلہ میں ۱۹۱۵ء کے بعد ہندوستان سے باہر چلے گئے تو پھر علی گڑھ اور دیوبند کا یہ علمی اور روحانی رابطہ قائم نہ رہا۔

انقلابی منصوبہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرح حضرت شیخ الہند گو گھر یا دارالعلوم کی چار دیواری کے اندر رہنے کے عادی تھے۔ لیکن ان کی نظر سے ملک و ملت کا کوئی گوشہ پوشیدہ نہیں تھا۔ آپ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت جبکہ مسلمان ثریا سے تحت الثریٰ کی طرف بڑی تیزی سے گامزن تھے۔ ان کو کس طرح واپس لوٹایا جائے۔ تاکہ وہ پھر سے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت اور عظمت حاصل کر سکیں اس کے لئے کونسا طریقۂ عمل اختیار کیا جائے۔ اس سلسلہ میں کس کا تعاون حاصل کیا جائے کس پر اعتماد کیا جائے اور کن سے قربانی کا مطالبہ کیا جائے اور ایسی کون سی صورت پیدا کی جائے کہ اس منصوبہ میں رنگ بھی بھر جائے اور دارالعلوم پر حکومت کی طرف سے کوئی حرف

بھی نہ آئے۔ ابتدائی طور پر آپ نے یہی فیصلہ کیا کہ جو جو حضرات عملی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ متحدہ ہندوستان میں بالعموم اور "یاغستان" (آزاد علاقہ) میں بالخصوص دینی اور اسلامی درسگاہیں قائم کریں۔ لیکن اس وقت حالاتِ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:۔

"حضرت شیخ الہند کی گہری نظر واقعاتِ عالم بالخصوص ہندوستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے زہرہ گداز مظالم اور اندرونِ ہند میں انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ آرام وچین تقریباً حرام ہو گیا۔ گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر انہیں سر بکف اور کفن بر دوش میدانِ انقلاب میں نکلنا پڑا۔ زمانہ کی تاریکیاں موسم کی کالی کالی گھٹائیں احوال کی نزاکتیں اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور وخوض میں گزرا۔ مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اسلئے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادر مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا۔"

(نقوش حیات جلد دوم ص۲۶،۱۲۵)

ابھی آپ کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے نہ پائے تھے کہ جنگ یورپ شروع ہو گئی۔ جس میں ترکی انگریزوں کے خلاف سینہ ٹھونک کر میدانِ جنگ میں نکل آیا۔ ان حالات نے شیخ الہند کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں ہر ممکن عجلت سے کام لیں۔

انقلابی اقدام

اس وقت کے تمام اربابِ علم وفضل اور صلاحیت واستقامت شیخ الہند کی نظر میں تھے۔ جو آپ کے پاس تعلیم واستفادہ کے لئے آتے رہتے تھے۔ اس لئے آپ نے ان میں سے چند قابل اعتماد اور درد دل رکھنے والے حضرات کا انتخاب کر کے ان کو اعتماد میں لیا۔ جن میں کچھ ہندو بھی تھے۔ جو پہلے سے

انگریزی کے مخالف تھے اور غدر پارٹی میں کام کر رہے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ آچاریہ کرپلانی کے بھائی شیخ عبدالرحیم سندھی (نومسلم) مولانا ابوالکلام آزاد۔ رانا مہندر پرتاب مولانا عبدالرحیم رائے پوری۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ مولانا محمد علی جوہر۔ حکیم اجمل خان نواب وقار الملک و دیگر زعماء ہند اس منصوبہ میں شامل تھے اور پروگرام یہ بنا کہ جب تک انگریزوں کو یہاں سے بذریعہ تشدّد نہ نکالا جائے۔ اسلام کی یہاں خیر نہیں کیونکہ انگریز صرف حکومت ہی نہیں کر رہے تھے۔ مختلف مشنری ذرائع سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم بھی چلا رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب انڈین نیشنل کانگرس نے ابھی آزادی یا ڈومنین سٹیٹس یا عدم تشدّد کا خواب تک نہ دیکھا تھا۔ متحدہ ہندوستان کی آزادی کی یہ تحریک بھی سابقہ تحریکوں کی طرح چند مخلص اور محبِ وطن علماء کرام نے شروع کی تھی۔

حضرت شیخ الہند نے اتنی رازداری سے کام شروع کیا کہ ایک کارکن کو دوسرے کارکن کا نام و پتہ تک معلوم نہ تھا۔ اس غرض کے لئے آپ نے ایک خاص کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اس میں آپ کے ہم خیال غیر مسلم دوست اور رفقار انقلاب ٹھہرا کرتے تھے جو سکھ یا بنگالی انقلابی ہندو ہوتے تھے۔ وہیں حضرت تنہائی کے عالم میں رات کو ہر ایک سے ملتے اور ہر ایک کا کام اس کے ذمہ لگا دیتے۔ ان دنوں مولانا عبیداللہ سندھی جو آپ کے فدائی اور نومسلم شاگرد رشید تھے اور بڑی سوجھ بوجھ اور ہمت و استقلال کے مالک تھے۔ دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ آپ سیدھے دہلی ان کے پاس پہنچے اور ان سے فرمایا کہ:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ تعلیم قرآن کے ذریعہ نوجوانانِ اسلام کے عقائد و نظریات کو بے دینی اور الحاد کے زہر سے پاک اور ان کے اسلام کے متعلق شکوک و شبہات کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں پکے مسلمان بن جائیں۔ لیکن انگریزی حکومت اور اقتدار کی موجودگی میں جب

تک تم اپنی اس تعلیم اور مدرسہ سے دس بیس صحیح الخیال مسلمان تیار کر لو گے۔ اس وقت تک انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنا دیں گے۔ لہٰذا یہاں تعلیم سے زیادہ انگریزوں کو نکالنے کی ضرورت ہے"۔

شیخ الہند کے اس خیال کی بعد ازاں ہنٹر رپورٹ سے بھی تائید و تصدیق ہو گئی کہ جس میں درج تھا کہ:۔

"ہمارے کالجوں یا سکولوں سے پڑھا ہوا کوئی ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے۔ جس نے اپنے بزرگوں کے عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو"۔

مولانا عبید اللہ سندھی کو چونکہ اسلام کی محبت کفر کے دائرے سے نکال لائی تھی اسلئے وہ اسلام کی سربلندی کیلئے شیخ الہند کے ہمنوا و ہم خیال بن گئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا عبید اللہ سندھی کو حکم ہوا کہ وہ فوراً کابل پہنچیں اور امیر حبیب اللہ خان والئی افغانستان کو اس نازک وقت میں خدمت اسلام کے لئے جانبازانہ اقدام پر آمادہ کریں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون سے مالی امداد حاصل کی۔ جس میں سے پانچ ہزار روپیہ خرچ کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالے کر کے انہیں افغانستان بھیج دیا گیا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی سے گہرا رابطہ قائم کر کے انہیں انگریزی حدود سے نکل کر آزاد قبائل میں ہیڈ کوارٹر بنانے کے لئے بھیج دیا گیا۔ کیونکہ وہاں سے اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کے ملنے کی توقع تھی۔ علاوہ ازیں حضرت سید احمد شہید کی جماعتِ مجاہدین کے جو لوگ ابھی تک ستھانہ اور چمرقند میں رہ رہے تھے۔ ان کے ذریعہ اس علاقہ میں جوشِ جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کرنے اور قبائلی شکر رنجیاں دور کر کے ان میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے تھی کہ حضرت شیخ الہند ہندوستان میں بیٹھ کر

یہ کام کریں۔ مگر آپ نے ان سے اتفاق نہ کیا کیونکہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے استیصال کے لئے عالمِ اسلام کے فرمانرواؤں کی تائید و اعانت کی بھی ضرورت تھی۔ اس وقت تک ابھی ترکی کے سربراہ کو ہی خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اسلئے آپ ان کی طرف رجوع کرنے کے لئے دارالعلوم اور ہندوستان کو چھوڑ کر حجاز چلے گئے۔ تاکہ وہاں ترک وزراء اور اعلیٰ حکام سے رابطہ پیدا کر کے ایران و افغانستان کے راستے یاغستان واپس آجائیں اور یہاں بیٹھ کر تحریک چلائیں۔

ملاقات غالب پاشا

سرحدی علاقہ میں مجاہدین کی کارروائیاں انگریزوں کو سخت پریشان کر رہی تھیں۔ ترکی نے انگریزوں کے خلاف اپنے اتحادیوں سے مل کر اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ عین اس زمانہ حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز کو برطانوی حکومت نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ مگر عوام و خواص میں آپ کی محبوبیت و مقبولیت کے پیشِ نظر آپ پر فوری ہاتھ ڈالنے کی اسے جرأت نہ ہو رہی تھی اور وہ آپ کو ایسے ڈرامائی انداز میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ جس سے عوام میں ہیجان نہ پھیلے۔ حکومت کے کارپرداز بمبئی۔ عدن۔ جدہ تک آپکا تعاقب کر کے گرفتاری کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ناکام رہے اور حضرت شیخ الہند بعافیت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ جو لوگ آپ کی نگرانی اور گرفتاری کے لئے سایہ کی طرح ہمراہ تھے۔ انہیں ترکی پولیس نے گرفتار کر لیا اور بعد از حج انہیں واپس ہندوستان بھیج دیا۔ اس زمانہ میں مکہ معظمہ میں ہندوستانی تاجر بڑے پیمانہ پر کام کر رہے تھے۔ ان ہی میں ایک حاجی علی جان کا خاندان بھی اچھی شہرت کا مالک تھا۔ جسکا حضرت سیّد احمد شہید اور ان کے مجاہدین سے دیرینہ تعلق تھا۔ شیخ الہند اس خاندان کے معمر سربراہ حافظ عبدالجبار کو ملے اور انہیں اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کر کے اس بات کی استدعا کی کہ وہ کسی ذریعہ آپ کو گورنر حجاز غالب شاہ سے ملاقات کرا دے چنانچہ اس نے فوراً آپ کی ملاقات کا انتظام کرا دیا۔ آپ نے انہیں تمام کوائف

سے آگاہ کیا آپ کے حالات سننے کے بعد آپ کو دوسرے دن آنے کے لئے کہا اور اس درمیانی عرصہ میں غالب پاشا خفیہ ذرائع سے اس بات کی تصدیق کرتے رہے کہ ہندوستان میں یہ کس حیثیت اور شہرت کے مالک ہیں۔ جب ان کی تسلی ہوگئی۔ تو انہوں نے دوسرے روز حسبِ وعدہ شیخ الہند سے مل کر تمام حالات معلوم کئے۔ اس کے بعد آپ نے ترکیہ کے وزیر جنگ انور پاشا سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جس پر گورنر نے آپ کو تین خط لکھ دیئے جن میں سے ایک مسلمانانِ ہند کے نام۔ دوسرا البصری پاشا گورنر مدینہ کے نام تھا کہ یہ قابل اعتماد شخصیت تھے۔ اسکا احترام کرو اور اسے انور پاشا تک پہنچا دو اور تیرا خط غالب پاشا کے نام لکھ دیا کہ ان کے مطالبات پورے کئے جائیں اور شیخ الہند سے کہا کہ اگر ہندوستان کے تمام لوگ آزادی کامل کا مطالبہ کریں تو ترکی ہر قسم کی امداد دے گا۔ اس کے بعد بھی آپ کی غالب پاشا سے دو تین خفیہ ملاقاتیں ہوئیں۔

ملاقات غازی انور پاشا

اس زمانہ میں حجاز ریلوے جاری تھی۔ تار برقی آ جا رہے تھے۔ وزیر جنگ غازی انور پاشا اور نہر سویز و صحرا سینا کے کمانڈر جمال پاشا جو جنوبی محاذ کا دورہ کر رہے تھے، کا تار آیا کہ وہ شہنشاہِ دو جہاں کے دربار میں حاضری کے لئے مدینہ منورہ پہنچ رہے۔ ان کے استقبال کے لئے ان کے شایان جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ جب وہ ٹرین سے اترے تو جلوس کی روانگی کے وقت فٹن سواری پیش کی گئی تو انور پاشا نے اس پر سوار ہونے سے انکار کر دیا اور کہا کہ :۔

"ہم غلامانہ طریق سے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے پیدل چلیں گے"۔

اسی جلوس کے دوران حضرت شیخ الہند کی درخواست ملاقات آپ تک پہنچا دی گئی۔ نقیب الاشراف شامی اور مدینہ منورہ کے مذہبی اور دینی طبقات کے سردار کی مساعی

سے ہر دو حضرات نے شیخ الہند کو ملاقات کے لئے مغرب کا وقت دیا۔ جس پر آپ بمعہ مولانا خلیل احمد وہاں پہنچ گئے۔ ایک تنہا اور بند کمرہ میں ملاقات ہوئی۔ غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے اور بڑی ہمدردی و اطمینان سے سب باتیں سنیں۔ ان پر غور کیا اور فرمایا:۔

"تحریک مطالبہ آزادی اہل ہند کو متفقہ طور پر جاری رکھنا چاہئے۔ جب تک مقصود یعنی آزادی کامل حاصل نہ ہو جائے۔ ساکت نہ ہوں۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی۔ ہم اہل ہند کی آزادی کے لئے پوری جدوجہد عمل میں لائیں گے۔ تم مطمئن رہو۔ جس طرح ممکن ہوگا۔ ہم اہلِ ہند کی امداد و اعانت کریں گے۔ اس وعدہ اور عہد کے لئے ہم تحریر بھی دیدیں گے۔ مگر چونکہ یہاں وقت تھوڑا ہے اور مشاغل زیادہ ہیں۔ اس لئے ہم دمشق جاکر عربی۔ فارسی اور ترکی میں تحریر بھیج دیں گے۔ تاکہ اہل ہند سمجھ سکیں۔ باقی آپ کا افغانستان کے راستے ہندوستان واپس جانا ممکن نہیں۔ کیونکہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آباد تک پہنچ گیا ہے۔ اس لئے آپ جدہ کے راستے ہندوستان واپس جائیں اور اگر گرفتاری کا اندیشہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام فرمائیں۔"

(نقشِ حیات)

اس کے دو تین دن بعد مطلوبہ تحریر تین زبانوں میں بدستخطی انور پاشا و جمال پاشا گورنر مدینہ کی معرفت شیخ الہند کو پہنچ گئیں۔ جن میں اہل ہند کے مطالبہ آزادی کو سراہا گیا اور ہر ممکن امداد و اعانت کا وعدہ کیا۔

غالب نامہ غالب پاشا گورنر حجاز نے شیخ الہند کو اہل ہند کے نام جو مکتوب دیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ جنگ عمومی گذشتہ ایک سال سے ترکی کی اسلامی حکومت کا رخ کئے ہوئے ہے۔ روس۔ فرانس اور انگریز (دشمنانِ اسلام) ممالک عثمانیہ پر بری و بحری حملے کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین نے محض اللہ کی نصرت اور خاتم الانبیار وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانی طاقت کے بھروسہ پر جہاد مقدس کا اعلان کر دیا ہے۔ جس کے جواب میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمانوں نے لبیک کہا ہے اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین کی تعداد دشمنانِ اسلام کی تعداد سے بڑھ گئی ہے اور انہوں نے دشمنوں کی قوت کو مادی اور اخلاقی طور پر کمزور کر دیا ہے۔

چنانچہ روسیوں کی فوج کا ایک بڑا حصہ قفقازیہ میں تباہ کر دیا گیا ہے اور ایک لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوج اور ان کے جنگی جہاز درہ دانیال اور دوسرے مقامات پر برباد کر دیئے گئے ہیں۔ ترکوں۔ جرمنوں اور آسٹریلیوں نے مشرق میں روسیوں کو اور مغرب میں فرانسیسیوں اور بلجیکیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایک تہائی روسی اور فرانسیسی علاقے اور سارے بلجیم اور لاکھوں رائفلوں بندوقوں اور دوسرے سامان جنگ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہزاروں فوجیوں کو قیدی بنا لیا ہے۔ اب بلغاریہ بھی مرکزی قوتوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں شامل ہو گیا ہے اور اس نے سربیا کے علاقہ میں اندر تک گھس کر وہاں کے لوگوں کو شکست فاش دیدی ہے۔ اسلئے میرا یہ پیغام میرے سلام کے ساتھ ان مسلمانوں کو پہنچا دیا جائے۔ جو ان حکومتوں کی غلامی میں ہیں کہ وہ اب مکمل طور پر شکست کھا چکی ہیں اور اب بالکل لاچار د

بے یار و مددگار ہیں اور ان کے یعنی مسلمانوں کے سامنے جس قوت وطاقت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے وہ محض خیالی ہے۔

مسلمانو! آج تمہاری نجات کا دن ہے۔ اسلئے اب اپنی ذلت وخواری اور اپنی غلامی پر راضی وقانع نہ رہو۔ بلاشبہ آزادی۔ کامیابی۔ فتح ونصرت تمہارے ساتھ ہے۔ اب خواب غفلت سے بیدار ہو اور متحد ہوکر اپنے اندر تنظیم واتحاد پیدا کرو۔ اپنی صفوں کو درست کرو اور اپنے آپ کو ان چیزوں سے لیس کرو۔ جو تمہارے لئے ضروری اور کافی ہوں اور پھر اس ظالم اور جابر عیسائی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہو۔ جس کی غلامی کا کمزور طوق تمہاری گردنوں میں پڑا ہوا ہے۔ اس زنجیر غلامی کو اپنے مذہب کی طاقت اور دین کی تیز دھار سے کاٹ ڈالو۔ اسطرح اپنے وجود اور انسانی آزادی کے حقوق کو حاصل کرلو۔ ہم انشاء اللہ عنقریب مکمل فتح اور کامیابی کے بعد معاہدے کریں گے تو تمہارے حقوق کی پوری طرح حفاظت و مدافعت کریں گے۔

اسلیئے اب جلدی کرو اور پختہ عزم وارادہ کے ساتھ دشمن کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے منہ میں پہنچادو اور اس سے نفرت ودشمنی کا مظاہرہ کرو ہم تمہاری طرف بھروسہ اور اعتماد کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسلئے یہ اچھا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دو۔ بددل نہ ہو اور خداوند بزرگ وبرتر سے دلی مراد پوری ہونے کی توقع رکھو۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مولانا محمود الحسن صاحب (جو پہلے دیوبند ہندوستان کے مدرسہ میں تھے) ہمارے پاس آئے اور ہم سے مشورہ طلب کیا۔ ہم اس بارہ میں ان سے متفق ہیں اور ان کو

ضروری ہدایات دیدی ہیں۔ ان پر اعتماد کرو۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو روپیہ سے۔ آدمیوں سے جس چیز کی ان کو ضرورت ہو۔ اس چیز سے ان کی مدد کرو۔"

دستخط غالب (پاشا) والئ حجاز (تحریک شیخ الہند ص ۲۷۶)

خطوط کی تلاش

حضرت شیخ الہند کے لئے چونکہ ہندوستان واپس آنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اسلئے ترکی کے اعلیٰ افسران کے اصرار پر آپ نے وہاں بیٹھ کر تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے ذمہ تین کام تھے:

(۱) آزاد سرحدی قبائل کو آمادۂ عمل کرنا۔

(۲) ترکوں کو امداد پر آمادہ کرنا۔

(۳) ان قبائل کو ترکوں کی امداد کا یقین دلانا۔

حاجی ترنگ زئی کی مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ قبائلی علاقہ میں سرگرمیاں جاری تھیں۔ ترکوں کو امداد پر آمادہ کرلیا گیا تھا اور ان سے جو تحریری وعدے لئے گئے تھے۔ ان کا اپنے مراکز میں پہنچانے کا کام باقی تھا۔ ہندوستانی اور برطانوی سی۔ آئی۔ ڈی بھی تاڑ میں تھی اس لئے ان خطوط کو ہندوستان پہنچانے کے لئے ڈبل ڈھکنے کا ایک خصوصی صندوق تیار کرایا گیا اور ان ڈھکنوں کے درمیان خطوط رکھ کر ان کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کردیا گیا کہ اس پر کسی قسم کا شک وشبہ نہ گزرے اور وہ صندوق مولانا ہادی حسن اور حاجی شاہ بخش کے ذریعہ ہندوستان روانہ کردیئے گئے۔ تاکہ وہاں حاجی نور حسن رئیس موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر کو پہنچا دیئے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ ان خطوط کی احمد مرزا فوٹو گرافر دہلی سے فوٹو کاپیاں کراکر تمام مراکز میں بھیج دی جائیں تاکہ ان کو تسلی ہو۔

بمبئی میں برطانوی سی۔ آئی۔ ڈی اور ہندوستانی پولیس اور حضرت شیخ الہند کے معتقدین کی تلاش میں مصروف ہوگئے اور ایک آدمی چپکے سے مولانا ہادی حسن سے صندوق لیکر چلتا بنا۔

جہاز کی بڑی سختی کے ساتھ تلاشی لی گئی۔ مگر جب شیخ الہند کا کچھ پتہ نہ چلا تو آپ کے رفقار مولانا خلیل احمد اور مولانا ہادی حسن کو حراست میں لے کر تفتیش شروع کردی گئی۔ مگر وہ بڑے مستقل مزاج رہے۔ جب ہر قسم کی سختی اور طمع کے باوجود پولیس ان سے کوئی راز نہ اگلوا سکی تو بالآخر انہیں چند دنوں بعد چھوڑ دیا گیا۔ خان جہان پور میں مولانا محمد نبی نے اس صندوق سے کپڑے وغیرہ نکال کر دوسرے صندوق میں بند کئے اور اس صندوق کو توڑ کر ترکی وزرا کے خطوط نکال لئے۔ کوئی ڈیڑھ ماہ بعد سی۔آئی۔ڈی کو ان خطوط کا پتہ چلا۔ عین اس وقت جبکہ ان کے فوٹو ہوکر البم پانی میں پڑے تھے اور دوسری طرف محمد نبی ان خطوط کی گھر پر نقل کر رہے تھے۔ پولیس نے چھاپہ مارا۔ تو مولانا محمد نبی نے بڑی پھرتی سے وہ خطوط توڑ موڑ کر اپنی صدری کی جیب میں ڈال دیئے اور اسے کھونٹی پر لٹکا دیا اور دوسری طرف دہلی میں فوٹوگرافر کی دکان پر ان کے البم موجود تھے۔ پولیس نے پورے چھ گھنٹے بڑی سختی سے ایک ایک چیز کی تلاشی لی۔ مگر خدا کی قدرت اور شیخ الہند کی کرامت سے اسکی نظر نہ صدری پر پڑی اور نہ البم والی پلیٹ پر اور وہ ناکام واپس چلی گئی بعدہٗ ان کے فوٹو متعلقہ مقامات پر بحفاظت پہنچا دیئے گئے۔

جواب غالب نامہ

حضرت شیخ الہند کی زیر سرکردگی "حزب اللہ" کے نام سے جو مہاجرین و انصار یاغستان میں مصروف جہاد تھے۔ ان کے پاس جب غالب پاشا کے پیغام کی فوٹو کاپیاں پہنچیں تو انہوں نے اس کا مندرجہ ذیل جواب بتوسط حضرت شیخ الہند، خلیفۃ المسلمین خادم الحرمین شریفین سلطان محمد رشاد خاں خامس کی خدمت میں بھیجا۔

۱۔ "ہم خدام اسلام حضرت سلطان العلماء، مولانا محمود الحسن صاحب کی زیر سرپرستی مجتمع ہوگئے ہیں۔ ہم نے اپنا نام "حزب اللہ" رکھا ہے اور آتشِ ظلم کو سرد کرنا ہمارا نصب العین ہے۔

۲۔ ہندوستان اور افغانستان کی حدود کے درمیان ایک وسیع علاقہ جو وزیرستان سے الائی (کشمیر) تک پھیلا ہوا ہے۔ آزاد علاقہ ہے۔ بہادر اور غیرت مند حنفی المذہب افغانوں کا مسکن ہے۔ ان جری اور غیور بہادروں نے روز اوّل سے اپنے علاقہ کو حکومت انگریز کے تسلّط سے آزاد رکھا ہے۔ ہم نے ۱۳۳۱ھ سے مہمند سے الائی تک کے علاقہ میں اپنی جدوجہد کے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔

۳۔ جیسے ہی دربارِ خلافت سے انگریزوں کے مقابلہ میں جنگ کا اعلان ہوا۔ جمیعتہ حزب اللہ کے کچھ ارکان حضرت سلطان العلماء کے ایماء پر انگریزی حکومت سے ہجرت کر کے اس آزاد علاقہ میں پہنچے اور یہاں کے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف ابھارنے کا کام شروع کر دیا۔

برطانوی حکومت سے جو رپورٹ گزشتہ عیسوی سال کے گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ہماری جدوجہد کا اقرار موجود ہے۔ ہند اور افغانستان کی تحریک میں بھی ہم نے بھرپور کوشش کی ہے اور کرتے رہیں گے۔ اگرچہ ابتک اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

۴۔ ہم خدام اسلام میں انگریزوں سے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے اور خاص طور پر جنگ کے خاتمہ کے بعد اسلئے بعید آداب عرض گزار ہیں کہ:۔

(الف) صلح عمومی اور مختلف حکومتوں کے درمیان معاہدے کے وقت مذکورہ بالا علاقہ کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے طے کرا لیا جائے کہ یہ علاقہ سریر خلافت کے زیرِ اثر رہیگا۔

(ب) اس علاقہ کے انتظام اور اصلاح کے لئے دربارِ خلافت سے افسر بھیجے جائیں۔

(ج) اگر موجودہ جنگ کے دوران ہی کچھ افسر، تھوڑی فوج، سامان جنگ اور مصارف خوراک کے ساتھ یہاں بھیج دیئے جائیں تو یہاں سے لاکھوں جنگ آزمودہ غازی بلا تنخواہ اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور یہ اقدام افغانستان کو سرگرم کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔ انشاءاللہ اللہ تعالے ہمیں دربارِ خلافت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق و استطاعت بخشے۔

نوٹ:۔ غالب پاشا گورنر حجاز شریف کا فرمان، جس میں جنگ میں شریک ہونے والوں کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور جو ہم تک مولوی ابوالحامد انصاری ابوایوبی کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اس عرضداشت کے پیش کرنے کا محرک بنا۔" فقط۔

مورخہ ۱۷ شوال المکرم ۱۳۳۵ھ
تقریباً مطابق ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء

مہر جناب حاجی ترنگ زئی مہاجر غازی فی سبیل اللہ صدر جمیعۃ حزب اللہ
مہر غازی معروف جناب ملا صاحب باڑہ صدر انصار جمیعۃ حزب اللہ۔
مہر مولوی فضل ربی مہاجر رکن جمیعۃ حزب اللہ
مہر مولوی عبدالعزیز رکن جمیعۃ حزب اللہ

ریشمی خطوط

علمائے کرام اس تحریک آزادی کی کامیابی کے لئے مقدور بھر کوشش کر رہے تھے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کر رہے تھے۔ ان کی راہ میں حائل شدہ مشکلات میں سے ایک مشکل کام پیغام رسانی کا تھا تاکہ ہر محاذ کے سربراہ کو تازہ صورت حال سے آگاہ رکھا جائے۔ حضرت شیخ الہند تو خفیہ ذرائع سے حجاج کی معرفت پیغام یا خطوط ہندوستان بھیج دیتے تھے۔ جن کی تلاش میں سی آئی ڈی والے سرگردان رہتے تھے۔

سرحد اور افغانستان کے محاذ کے انچارج حاجی ترنگ زئی اور مولانا عبیداللہ سندھی نے وہاں کے حالات تین ریشمی رومالوں پر تحریر کئے۔ جو زرد رنگ کے تھے۔ ان میں سے پہلا خط پارچہ چھ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا تھا۔ دوسرا خط ۱۰" × ۸" اور تیسرا خط ۱۵ × ۱۰ ۔ انچ چوڑا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ریکارڈ کے مطابق پہلے اور تیسرے خط پر "عبیداللہ" کے دستخط تھے۔ تیسرے خط پر کاتب کے دستخط نہ تھے۔ مگر وہ پہلے خط کا جزو معلوم ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک خط شیخ عبدالرحیم سندھی کے نام تھا کہ انہوں نے دوسرا خط مدینہ منورہ حضرت شیخ الہند تک پہنچانا ہے اور شیخ الہند کے خط میں اس محاذ کے تمام کوائف درج تھے۔ مولانا عبیداللہ نے یہ رومال لپیٹ کر عبدالحق نامی ایک مہاجر طالب علم کو دیدئے کہ یہ سندھ میں شیخ عبدالرحیم کو پہنچا دینا۔ ریشمی خطوط کی ڈائریکٹری کے مطابق :۔

"ان خطوط کی تحریر بہت پختہ اور صاف ہے۔ ان میں نہ تو کسی لفظ کو مٹایا گیا ہے اور نہ ہی کسی لفظ کو کاٹ کر اس پر غلطی بنائی گئی ہے۔ صرف و نحو کی ایک معمولی سی لغزش کا پتہ چلتا ہے۔ زبان اگرچہ بعض مقامات پر مبہم ہے جیسا کہ سازشیوں کے خطوط میں ہونی چاہیئے۔ لیکن اچھے تعلیم یافتہ بلکہ اہلِ علم کی زبان ہے"۔

(ایضاً)

یہ عبدالحق پہلے ہندو تھا۔ میٹرک تک تعلیم یافتہ تھا۔ ۱۹۰۹ء میں اس نے سکول چھوڑ دیا۔ اور ۱۹۱۲ء میں مسلمان ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ ملتان کے خان بہادر رب نواز خان چترالی کے لڑکوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ بدوران ہجرت اسے خان بہادر کے لڑکے اللہ نواز نے کابل بھیج دیا۔ جہاں اس کے ذمہ بالآخر یہ خط پہنچانے کی خدمت لگی۔ وہ خط لیکر جب واپس ملتان آیا تو وہ خط کسی طرح خان بہادر کے ہاتھ لگ گئے۔ جو انہوں نے از راہِ وفاشعاری

کمشنر ملتان کے حوالے کردیئے۔ کمشنر نے انہیں کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر احتیاطاً وہ خطوط گورنر پنجاب مائیکل اڈواڈئر کے پاس بھیج دیئے جو سی۔ آئی۔ ڈی کے سپرد ہوئے اور اس نے ان خطوط اور عبدالحق مذکور کے ذریعہ اس تحریک کا سراغ لگایا اور خان بہادر ربنواز خان چترالی کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

اس سازش کا پتہ چلنے کے بعد ملک بھر میں متعدد گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ یہ ریشمی خطوط ۹۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو کابل سے لکھے گئے تھے۔ دو خطوط کا ذکر قبل ازیں گزر چکا ہے تیسرا خط ایک جدول کی شکل میں تھا۔ جس کے پہلے خانہ میں مقصد تحریک دوسرے خانہ میں حلقۂ اثر۔ تیسرے خانہ میں مناصب کی تقسیم۔ چوتھے خانہ میں افسران کی تنخواہوں اور پانچوں خانے میں ان کے ماہواری خرچہ کے اختیارات درج تھے۔

اسیری اور رہائی

امریکہ کے شریک جنگ ہونے سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ جرمنی اور ترکی کی فتحمندی کے بعد جب امریکہ میدانِ جنگ میں کودا تو اسکی بے شمار فوجیں اور لاتعداد اسلحہ انگریزوں اور فرانس کی مدد کو پہنچ گیا۔ ادھر شریف حسین نے ترکوں سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں سے ساز باز کر کے حجاز میں بغاوت کردی۔ جس میں مولانا حسین احمد مدنی۔ مولوی عزیز گل۔ وحید احمد اور حضرت شیخ الہند کو حکومت برطانیہ کے حکم سے شریف مکہ نے گرفتار کرلیا اور حکومت برطانیہ نے ان کو دیوبند۔ سرحد۔ یاغستان اور کابل کے تحریک آزادی چلانے کی پاداش میں جزیرہ مالٹا میں قید کردیا۔ جہاں ترکی کے صدر اعظم و دیگر اعلیٰ افسران بھی محبوس تھے۔ مجاہدین کے یہ میرِ کارواں ۲۰ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا میں لائے گئے اور قریباً تین سال وہاں مقید رہے۔ اس لئے اسیرِ مالٹا مشہور ہوئے اور ۸ جون ۱۹۲۰ء کو یہ سب رہا ہو کر بمبئی پہنچ گئے۔ آپ نے رہائی کی اطلاع حکیم محمد حسن کو دیوبند میں۔ ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں اور حکیم اجمیری کو بمبئی میں عدن سے ہی بذریعہ تار بھجوا دی تھی۔

بمبئی پہنچنے پر آپ کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔ ملک کے طول و عرض سے مشاہیر آئے ہوئے تھے۔ جن میں مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مرزا احمد فوٹو گرافر دہلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے بمبئی میں دو روز قیام کیا۔ جس کے دوران لکھنؤ سے مولانا عبدالباری فرنگی محل ملنے آئے اور آپ سے تنہائی میں سیاسیاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ احمد آباد سے مسٹر گاندھی آئے اور آپ سے مصروف گفتگو رہے۔ اسکے بعد آپ دہلی روانہ ہوگئے۔ راستہ میں ہر سٹیشن پر آپ کی شان کے شایان استقبال ہوتا رہا۔

عزت و احترام

حضرت شیخ الہند کے پرخلوص ارادوں۔ ان کی جلالت و عظمت اور استقلال و ہمت کا غیر ملکی بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ ویسے یورپین اقوام اور افسران کا تو ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ وہ ملک و ملّت کے فدائیوں اور خیر خواہوں کو بڑی عزت وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ خواہ سیاسی طور پر وہ مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ شیخ الہند کی اسیری کے زمانہ میں جو بڑے بڑے فوجی یا سولِ افیسر انگریز آتے تو وہ شیخ الہند کو دیکھتے ہی ہیٹ اتار کر سلام کرتے اور بڑے ادب و احترام سے آپ کے ساتھ گفتگو کرتے۔ اگر آپ ترجمہ قرآن میں مصروف ہوتے تو وہ باادب کھڑے رہتے۔ لیکن یہ تعظیم و تکریم کبھی ہندوستانی نوابوں۔ راجوں یا خطاب یافتگان کو نصیب نہ ہوئی۔ مالٹا میں جرمن کا شہزادہ بھی قید تھا۔ وہ بھی عید کے موقعہ پر آکر آپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا اور یہی حال ان جرمنی۔ آسٹرین۔ بلگیرین اور ترک افسران کا تھا۔ غرض کہ عالم قید میں بھی غیر ملکی فوجی اور سول اعلیٰ حکام آپ کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے۔ قوم نے بھی آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو شیخ الہند کا خطاب دیا۔ جو اتنا مقبولِ خاص و عام ہوا کہ آپ کے نام کا جزو بن گیا۔

اعترافِ خدمات سرکار انگریزی کے سی۔آئی۔ڈی کے محکمہ نے ریشمی خطوط کی تحریک میں حصہ لینے والوں کی جو ڈائریکٹری مرتب کی اور جو انڈیا آفس لندن میں آج تک محفوظ ہے۔ اس میں بھی حضرت شیخ الہند کا ذکر خیر نمبر ۱۲۷ پر ان الفاظ میں درج ہے :-

"مولانا محمود الحسن کو حضرت مولانا بھی کہا جاتا ہے۔ ریشمی خطوط کے مکتوب الیہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے صدر مدرس۔ پارسائی اور تقدس کے لئے مشہور۔ ان کے مرید جن میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں۔ ہندوستان بھر میں ہیں۔ عبیداللہ کے اثر میں آنے سے ان کے خیالات تبدیل ہوئے۔ دیوبند میں ان کا مکان اتحاد اسلامی کے سازشیوں کا گڑھ تھا۔ اس شخص نے سیف الرحمٰن۔ فضل الٰہی فضل محمود وغیرہ کو سرحد پار قبائلیوں کو جہاد پر بھڑکانے کے واسطے بھیجا۔ ایس۔ ایس اکبر جہاز کے ذریعہ وہ خود بھی تیرہ منحرف اشخاص کے ساتھ ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو ہجرت کرکے عرب کو روانہ ہوگیا۔ عرب میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے پے درپے اس بات کی کوشش کی کہ ہندوستان میں جہاد کے مقصد کے لئے حکومت ترکی کی ہمدردیاں حاصل کریں۔ انور پاشا۔ جمال پاشا اور غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں اور فرمان حاصل کئے۔ جن میں سے ایک فرمان محمد میاں عرف مولوی منصور کے ذریعہ ہندوستان اور آزاد علاقہ کے سازشیوں کو دکھائے جانے کے بعد کابل پہنچایا گیا۔

ہندوستان میں اتحاد اسلامی کی سازش میں مولانا کی رہنمایانہ قائدانہ شخصیت بڑی سرکردہ ہے۔ جنود ربانیہ (خدائی فوج) کی فہرست میں وہ جنرل ہیں۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۱۶ء کو شریف مکہ کے احکام سے ان کو گرفتار کر لیا گیا اور جدہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سے انہیں ۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ

کردیا گیا۔ (تحریک شیخ الہند صہ ۲۴۲)

(۲)

اسی سرکاری ریکارڈ میں اس امر کا بھی اعتراف موجود ہے کہ شیخ الہند کی تحریک کا طریق کار اور مقصد یہ تھا کہ:۔

(الف) ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی جذبات ابھارے جائیں۔

(ب) سرحدی قبائل اور افغانستان میں حکومت برطانیہ کے خلاف نفرت پھیلائی جائے۔

(ج) ان ممالک کے عوام کو برطانیہ کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا جائے۔

(د) حکومت ترکیہ سے جنگی امداد حاصل کی جائے۔

(ڈ) اہل ہند سے اسلحہ و رسد کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔

اور ان تمام وسائل کو جمع کر کے حکومت برطانیہ کے خلاف بغاوت برپا کر کے اسے ہندوستان پر اقتدار سے محروم کر دیا جائے۔

ان اغراض کے لئے اس زمانہ کی فضا بڑی سازگار تھی۔ کیونکہ اٹلی اور ترکی کی جنگ (ستمبر ۱۹۱۱ء تا اکتوبر ۱۹۱۲ء) کی وجہ سے اسلامیانِ ہند کے جذبات بہت مشتعل تھے۔ بلقان کی جنگوں (اکتوبر ۱۹۱۲ء تا اکتوبر ۱۹۱۳ء) اور برطانوی ڈپلومیسیوں کی وجہ سے مسلمان بڑے برانگیختہ تھے اور علماء کے لئے ترکوں کے واسطے چندہ جمع کرنا بڑا آسان ہو گیا تھا۔ چنانچہ بمقدمہ ملک معظم شہنشاہِ ہند بنام عبید اللہ وغیرہ بجرم ۱۲۱۔ الف تعزیرات ہند سازش کا جو استغاثہ مرتب کیا گیا۔ اس کے پیرا نمبر ۱ میں حضرت شیخ الہند کے متعلق تحریر تھا کہ

"مولانا محمود الحسن نے خود مشورہ دیا کہ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) بند کر دیا جائے۔ کیونکہ مدرسہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں ہو سکتا

مولوی مرتضیٰ نے جو مولانا کا معتمد تھا۔ بتایا ہے کہ مولانا کی اس تجویز کے پس پردہ یہ خیال چھپا ہوا تھا کہ یہ مسلمانوں کے لئے اعلانِ جہاد کا وقت ہے اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ مدرسہ کو بند کر دیا جائے۔ اس کے بعد واقعۃً مدرسہ کو مختصر مدت کے لئے بند کر دیا گیا اور بہت سے مولویوں نے گشت کرنا اور ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔" (ایضاً صد ۲۶۳)

ترکِ موالات

حضرت شیخ الہند جب اپنی تحریک آزادی کے سلسلہ میں حجاز روانہ ہوئے تو ہندوستان کا بحر سیاست بڑا پرسکون تھا۔ لیکن جب واپس آئے تو اس میں تحریک خلافت کا طوفان آچکا تھا۔ انگریزوں کی غداری کی وجہ سے لوگ سخت برہم نظر آتے تھے۔ ترکِ موالات کی تحریک جوش پر تھی اور اس بات کا تقاضا ہو رہا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی سرکار انگریزی سے اپنا رشتہ منقطع کرلے۔ مگر اسکے ٹرسٹیان اس قطع تعلق کے حق میں نہ تھے۔ اس لئے طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد مسلم یونیورسٹی سے الگ ہوگئی مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ہم خیال حضرات بھی یونیورسٹی ٹرسٹ سے مستعفی ہوگئے۔ جس کے نتیجے کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی اور حضرت شیخ الہند نے بھی کانگرس کی تائید میں ترک موالات کا فتویٰ دیدیا۔ اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے سر رحیم بخش اس فتویٰ کی واپسی لئے شیخ الہند کی خدمت میں بھیجے گئے۔ مگر آپ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آپکا فتویٰ ان نکات پر مبنی تھا۔

۱۔ سرکاری اعزازات اور خطابات واپس کر دیئے جائیں۔

۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شرکت سے انکار کیا جائے۔

۳۔ صرف اپنے ملک کی مصنوعات اور اشیاء کا استعمال کیا جائے۔

۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کیا جاوے۔

۵۔ اتباع شریعت کیا جائے۔ اور خلاف شرع فعل سے بچایا جائے۔

۶۔ جن امور میں فساد یا نقص امن کا اندیشہ ہو۔ ان سے احتراز کیا جاوے۔
۷۔ ہر کام میں افراط تفریط سے بچ کر راہِ اعتدال اختیار کی جائے۔
۸۔ اچھے کام میں شرکت اور برے کام سے نفرت کی جائے۔

یہی فتویٰ جمیعتہ علمار ہند کے متفقہ فیصلہ کی صورت میں پانچ سو علمار کے دستخطوں سے شائع بھی کر دیا گیا۔

انگریزی درسگاہیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کے لیے شیخ الہند کو جب دعوت دی گئی۔ ان دنوں آپ سخت علیل تھے۔ اور چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ مگر ارباب جامعہ نے صدارت کے لئے معذرت قبول نہ کی۔ کیونکہ یہ پودا آپ کی ہی تحریک پر لگایا جا رہا تھا۔ اسلئے چار و ناچار آپ نے یہ دعوت قبول کر لی اور آپکا صدارتی خطبہ ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ دیا۔ جو قبل از اجلاس طبع کرا لیا گیا تھا۔ اس خطبہ صدارت کے مندرجہ ذیل حصے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں:۔

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت کو اسلئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوا۔ بہت سے نیک بندے ہیں۔ جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ۔ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا۔"

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے

علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے۔ جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا حکومت کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کیلئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔"

"ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کی بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی احساسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں قوم و ملک کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا۔ جو گورنمنٹ کی اعانت اور اسکے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عملی اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو"۔

یادگار تصانیف

آپ کا یادگار قلمی کارنامہ ترجمہ قرآن کریم ہے۔ جس کے لئے آپ کو مالٹا بھیجا گیا تاکہ یکسوئی کے ساتھ خدمتِ قرآن کر سکیں سورہ مائدہ تک حواشی بھی تحریر فرمائے کہ آپ کی رہائی ہو گئی اور بقیہ حواشی و فوائد مولانا شبیر احمد عثمانی نے مکمل کئے اسکے علاوہ آپ عربی کی متعدد تصانیف بھی اپنی یادگار چھوڑ کر ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو سوئے عدم روانہ ہو گئے۔

(۷)

مولانا اشرف علی تھانوی رح

گوہرِ نایاب

اشرف العلماء، قطب الارشاد۔ حکیم الامت۔ مجدد الملت۔ علومِ ظاہری و باطنی کے مخزن۔ علم و فضل کے معدن۔ امورِ شریعت و اسرارِ طریقت کے دفتر۔ تقویٰ و طہارت۔ رشد و ہدایت کے پیکر۔ بے مثال فقیہہ۔ عدیم النظیر مفسّر۔ بلند پایہ محدث۔ بالبصیرت متکلّم۔ اتباعِ سنت کا درسِ مجسّم۔ گوشہ نشین درویش۔ حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا شیخ محمد تھانوی کی آخری یادگار حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ان علمارِ سلف میں سے تھے۔ جن کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی۔ جن کے قلم نے فقہ و تصوّف کی ہنگامہ آرائی کو ختم کر کے ہم آغوش کر دیا تھا۔ جو حضرت مجدّد الف ثانی رح اور حضرت سیّد احمد بریلوی شہیدؒ کی پشتوں میں سے تھے۔ جو اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے زائد از نصف صدی تک عوام و خواص کو مستفید و مستفیض فرماتے رہے۔ جنکا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا صاف و شفاف سرچشمہ تھا۔ جس سے ہزاروں تشنہ کام سیراب ہو کر جاتے رہے۔ جن کی زندگیاں معصیت کوش اور عصیاں آلود ہو چکی تھیں۔ وہ یہیں سے پاک و صاف ہو کر اور گوہرِ مقصود سے دامن بھر کر واپس جاتے رہے۔ آپ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے۔ جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں کے لئے سرمایہ عبر و بصیرت چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ کوئی "نئی دکان" لگانے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اس خفتہ بخت قوم کو دشتِ عرب کے ایک امی صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ ارشاد یاد دلانے آئے تھے کہ:۔

"حقیقت میں ترقی جس کی اس وقت دم بدم پکار ہے۔ اونچے محلوں۔ بھرے خزانوں۔ بیش قیمت لباسوں۔ گراں بہا سامانوں۔ بڑی بڑی تجارتوں۔

اعلیٰ ملازمتوں اونچی اونچی تنخواہوں ۔ شاہانہ احتراموں ۔ اعزازوں اور خطابوں کا نہیں ۔ بلکہ اللہ کے احکام کی تعمیل کے ساتھ بلند اخلاق ۔ شریف عادات اور پاک وصاف قلب کا نام ہے ۔ جو آب وگل سے وابستہ اور فانی کا طالب نہ ہو اور حبِ مال وحبِ جاہ کا گرویدہ نہ ہو ۔ جس میں اخلاص کے ساتھ خالق کی رضا کے لئے خدمت خلق کا جذبہ ہو"۔

(جامع المجددین صہ ۲۹)

آپ نے اپنی ساری عمر حضورؐ کے اسی پیغام کو عام کرنے میں لگا دی اور اس غرض کے لئے ایک دو نہیں ۔ دس بیس نہیں ۔ سَو دو سَو نہیں بارہ سو سے اوپر کتابیں لکھ کر چھوڑ گئے اور اپنا کوئی حق تصنیف و تالیف محفوظ نہ رکھا ۔ تاکہ جس کا جی چاہے ۔ انہیں چھپوائے اور لاکھوں روپے کمائے اور فی الواقع آپ کی کتابوں پر رائلٹی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے آپکی کتابیں چھاپ چھاپ کر لاکھوں کمائے ہیں اور جنھوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے ۔ اور ان کو اپنے دائرہ عمل میں داخل کر لیا ہے ۔ انہوں نے دنیا کے ساتھ آخرت کا بھی سرمایہ اکٹھا کر لیا ہے ۔ نہ ان کے چھاپنے اور بیچنے والا خسارہ میں رہا ہے اور نہ ان کے پڑھنے والا ۔ ہر ایک کا حصہ بقدر جثہ اسے برابر ملتا رہا اور مل رہا ہے ۔

مسلک ومشرب

ایک پولیس والے نے آپ کو بیعت کے لئے درخواست بھیجی تو آپ نے اسے اپنا مسلک ومشرب ذیل لکھ کر بھیج دیا ۔ تاکہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے اور بیعت کا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے ۔ تاکہ اسے بعد میں پچھتانا نہ پڑے ۔ آپ نے لکھا کہ :-

- "میں ایک خشک طالب علم ہوں ۔ اس زمانہ میں جن چیزوں کو درویشی کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے ۔ جیسے محفل میلاد شریف ۔ عرس ۔ گیارہویں ۔ نیاز فاتحہ ۔ قوالی وغیرہ ذالک ۔ میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو

بھی اسی خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔

- مَیں نہ صاحبِ کشف ہوں۔ نہ صاحبِ کرامت۔ نہ صاحبِ تصرف ہوں اور نہ عامل! صرف اللہ و رسول ؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں۔
- اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا۔ نہ اپنی حالت۔ نہ اپنی کوئی تعلیم نہ امورِ دینیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔
- عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔
- مَیں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں۔ نہ کسی کی سفارش۔ اسی لئے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک کہتے ہیں۔ میرا مذاق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں۔ خواہ حرفی ہی اذیت ہو۔
- سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے اس امر کا ہے۔ کہ کسی کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے۔ خواہ بدنی ہو۔ جیسے مارپیٹ خواہ مالی ہو۔ جیسے کسی کا حق مار لینا یا ناحق کوئی چیز لے لینا۔ خواہ آبرو کے متعلق ہو۔ جیسے کسی کی تحقیر۔ کسی کی غیبت۔ خواہ نفسانی ہو۔ جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار رنجیدہ معاملہ کرنا اور اگر غلطی سے کوئی بات ایسی ہو جاوے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔
- مجھے ان کا اس قدر اہتمام ہے۔ کہ کسی کی وضع خلاف شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے۔ مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس سے نجات دے۔ یہ ہے میرا کچا چٹھا۔ ورنہ لوگوں نے تو ے

منش کردہ ام رستم پہلواں ۔۔۔۔ وگرنہ یلے بود در سیستاں

عظمت کا راز

داناؤں کا قول ہے کہ "عظمت ایک فیصد ودیعت کی جاتی ہے۔ اور ۹۹ فیصدی محنتِ شاقہ سے حاصل ہوتی ہے"۔ حضرت تھانوی دنیا کے ان عظیم المرتبت انسانوں میں سے تھے۔ جن کی عظمت وجلالت، محنتِ شاقہ کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ خدا داد تھی۔ چنانچہ حضرت خود فرمایا کرتے تھے:۔

"میں نے پڑھنے میں کبھی محنت نہیں کی۔ جو کچھ اللہ نے عطا فرمایا استادوں اور بزرگوں کے ساتھ ادب ومحبت کا تعلق رکھنے کی بدولت عطا فرمایا اور الحمدللہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لئے بھی ناراض نہیں کیا اور جتنا میرے دل میں بزرگانِ دین کا ادب ہے آج کل شاید ہی کسی کے دل میں اتنا ہو"۔

یہ انہی آثار عظمت کا نتیجہ تھا کہ آپ پر اساتذہ کی خصوصی توجہ تھی۔ بلکہ آپ کے طالب علمی کے حالات وعادات ہی استادوں کو خود بخود آپ پر توجہ خاص رکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے۔ کہ ہزاروں میں کوئی تو ان کی جگہ لینے والا تیار ہو رہا ہے۔ آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہ کیا۔ ہر وقت پڑھائی میں لگے رہتے۔ اگر کسی وقت فرصت ملتی تو وہ وقت اپنے استادِ خاص مولانا محمد یعقوب مدرس اول کی خدمت میں بیٹھ کر گزار دیتے اور بڑی یکسوئی کے ساتھ طالبعلمانہ زندگی گزارتے۔ آپ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا فتح محمد تھانوی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ مولانا سید احمد دہلوی اور قاری محمد عبداللہ مہاجر مکی۔ ایسے یگانۂ روزگار اور فاضل اجل اساتذہ کرام کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ جو بڑے صاحبِ باطن ہونے کے علاوہ صاحبِ کشف وکرامات بھی تھے۔ انہی کے فیض اور نورِ علم نے آپ کو آسمان شہرت پر پہنچایا۔ علم الادیان کے ساتھ آپ نے علم الابدان بھی حاصل کر لیا۔ تاکہ دین لوجہ اللہ پڑھایا جائے اور مطب کر کے گزر اوقات

کی جائے ۔ مگر اسطرح چونکہ کما حقہٗ دین کی خدمت ممکن نہ تھی ۔ اسلئے مخلصین و محبین کے تقاضوں پر درس و تدریس کا سلسلہ اختیار کر لیا ۔ اور آپ کے شاگردانِ رشید بھی آسمانِ شہرت پر مہر و ماہ بن کر چمکے ۔ جن میں ایک مولانا ظفر احمد عثمانی بھی تھے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ دینیات اور دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار ضلع حیدر آباد سندھ میں شیخ الحدیث رہے اور جنگ پاکستان میں قائدِ اعظم کے خصوصی معاون کی حیثیت سے انہوں نے سلہٹ کا ریفرینڈم جیتا ۔ جس پر قائدِ اعظم نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا ۔

روحانی تربیت آپنے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی سے پائی اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری ۔ قطب العالم حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن مرادآبادی سے روحانی طور پر فیضیاب ہوتے رہے اور ان کی دعائیں لیتے رہے ۔

معاملت و معاشرت

آجکل عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلام صرف نماز ۔ روزہ ۔ حج ۔ زکوٰۃ کی تعلیم اور حشر و نشر ۔ جنت و دوزخ وغیرہ کی خبر دیتا ہے اور یہ کہ اسکا معاملات و معاشرت سے کوئی تعلق نہیں ۔ اسلئے جو چاہو کرو جسطرح چاہو رہو !! ہر طرح آزادی ہی آزادی ہے ۔ اگر کسی کو کسی معاملے میں کسی اصول کی پابندی ضروری محسوس ہوتی ہے تو وہ غیر قوموں کی تقلید شروع کر دیتا ہے اور اتنا معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم اور تقاضے کیا ہیں ۔ اور نہ ہی ہمارے ہاں کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ۔ مذہبی یا غیر مذہبی ادارے ہیں ۔ جہاں صحیح اسلامی اخلاق و آداب اور معاملات و معاشرت کی تعلیم و تربیت ملتی ہو ۔ حالانکہ یہ نصوص صریحہ سے ثابت ہے کہ معاملت اور معاشرت بھی اجزائے دین میں سے ہیں اور بعض اعتبار سے یہ بہت اہم جزو دین ہیں اور انہی میں سب سے زیادہ غفلت اور بے پرواہی برتی جاتی تھی ۔

متحدہ ہندوستان میں صرف آپ کا ہی واحد اور منفرد مکتبِ فکر تھا۔ جس میں اصلاحِ معاملت و معاشرت پر توجہ دی جاتی تھی اور مجددین میں بھی آپ پہلے مجددِ معاشرت تھے۔ آپکا ارشاد ہے کہ:-

"مجھے علم پڑھانے لکھانے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں ہے۔ جس قدر تہذیبِ اخلاق اور دیانت پر نظر ہے۔ کیونکہ پڑھنے لکھنے کا تو ہر جگہ انتظام ہوتا ہے، لیکن اخلاق کی طرف کسی کا خیال نہیں۔ اسطرح میں اپنے متعلقین یعنی جو لوگ میرے ذریعہ سے داخلِ سلسلہ ہیں۔ ان کے لئے اوراد و وظائف۔ اذکار و اشغال کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ جتنا اخلاق کی درستی کا خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ اخلاق کا سنوارنا زیادہ ضروری ہے۔ کوئی ذکر و شغل کرتا ہو تو مجھے اسوقت تک اس کی قدر نہیں ہوتی جب تک اس کے اعمال درست نہ ہوں"۔

(سیرتِ اشرف ص ۲۸۵-۲۸۶)

آپ ان میں سے نہیں تھے۔ جو صرف دوسروں کو نصیحت کرنا جانتے ہیں اور خود کو اس سے مستثنےٰ سمجھتے ہیں۔ چونکہ آپ جو کچھ دوسروں کو تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ خود بھی اس پر عامل رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ متحدہ ہندوستان کی یہ مثالی تربیت گاہ اور اس کے تربیت یافتگان کی مثالی زندگی، درسِ عمل بن کر رہ گئی تھی۔ اسکا ناظم الامور یعنی حضرت تھانوی جن اصول و قواعد کی دوسروں سے پابندی کراتا تھا۔ خود بھی ان کا پابند رہتا تھا۔ عوام تو کیا خواص بھی چونکہ معاملات و معاشرت کی تعلیماتِ اسلامی سے ناآشنا تھے اس لئے ان پر حضرت تھانوی کی تربیتی پابندیاں بہت گراں گزرتی تھیں اور وہ ان کی حقیقت و اہمیت معلوم کرنے کی بجائے ناحق آپ کو بدنام کرنا شروع کر دیتے تھے۔ حالانکہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اسلئے آپ کا یہ بیان بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:-

"کوئی یہاں رہ کر واقعات کو بنظرِ غور و انصاف دیکھے تو اس پر حقیقت منکشف ہو جائے۔ معترضین کا زیادہ حصہ اہل سماع ہیں۔ اہل مشاہدہ نہیں مشاہدہ میں تو ہر واقعہ کی ترتیب سامنے ہوتی ہے۔ جس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور میں فقط دوسروں کو ہی اصول صحیحہ کا پابند نہیں بناتا۔ بلکہ اپنے آپ کو بھی پابند کرتا ہوں اور بہ تکلف یا بہ تصنع نہیں بلکہ اللہ کا شکر ہے کہ اصولِ صحیحہ کی پابندی میرا اقتضائے طبعی ہو گیا ہے۔"

حسنِ اتباع

چونکہ آپ کا ہر قول و فعل کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تھا۔ اس لئے اس اتباع کامل کی برکت سے دیکھنے والوں پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا۔ اسی لئے آپکے مخالفین کو بھی اس امر کا اعتراف تھا کہ نہ صرف حضرت تھانوی بلکہ ان کے منتسبین بھی صحیح المعاملہ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر بدورانِ سفر ریل کسی ٹکٹ کلکٹر کو پتہ چل جاتا کہ یہ مسافر تھانہ بھون یا حضرت تھانوی سے تعلق رکھتا ہے۔ تو وہ اس کا ٹکٹ چیک نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ملک کے طول و عرض میں سب کو یہ بات معلوم تھی کہ حضرت تھانوی سے تعلق رکھنے والے بد دیانتی نہیں کرتے اور معاملہ کے صحیح ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک غیر مقلد کسی کام کے سلسلہ میں حاضر خدمت ہوا۔ جبکہ بہت سے خدام موجود تھے۔ وہاں کے حالات دیکھنے کے بعد جب واپس لوٹا تو یہ رپورٹ دی کہ:-

"ہم لوگوں میں تو اتباع سنت کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اتباعِ سنت کو ہم نے وہاں دیکھا۔ ایک کتاب کی ضرورت ہوئی تو اٹھ کر خود کتب خانہ سے لائے۔ کسی سے نہیں کہا کہ لے آؤ۔ اپنا کام خود کیا کہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ سبحان اللہ! کیا اتباع سنت ہے!! اور کتنی تواضع ہے کہ بلا تکلف خود اٹھ کر لے آئے۔"

(ایضاً)

اہلِ خانہ ۔ اقربا ۔ اہلِ خصوصیت ۔ مہمانوں ۔ مریدوں ۔ نوکروں ۔ طالب علموں اور عامۃ المسلمین غرض کہ ہر کس و ناکس کے ساتھ کتاب و سنت کے مطابق سلوک کر کے اسے درسِ عمل دیتے حسنِ انتظام بھی آپ پر ختم تھا ۔ جسکا احساس آپ یوں دلایا کرتے تھے کہ :۔

"مسلمانوں کے ہاتھوں سے جو سلطنت گئی ہے ۔ وہ بدنظمی ہی کی وجہ سے گئی ہے ۔ سلطنت کفر کے ساتھ تو جمع ہو سکتی ہے ۔ لیکن بدانتظامی کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہو سکتی ۔ اسلئے بوجہ شامتِ اعمال مسلمانوں کے اندر سے سلطنت کا مادہ ہی نکال لیا گیا ہے ۔"

اسی لئے آپ ذکر و شغل پر اتنی نظر نہ رکھتے تھے ۔ جتنی اصلاح اخلاق و معاشرت پر رکھتے تھے اور اسوقت تک کسی کو بیعت نہ کرتے تھے ۔ جب تک وہ صحیح معنوں میں کتاب و سنت کے سانچے میں اپنی زندگی نہ ڈھال لیتے اور جن کے حقوق ان کے ذمہ ہوتے ۔ وہ ادا نہ کرا دیتے ۔

حسن جمال و جلال مولانا عبدالماجد دریابادی جو مولانا حسین احمد مدنی کے مرید باتمیز ہیں ۔ آپ کے حسنِ جمال کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں :۔

مسن ، لیکن خوشرو ، نظریں نیچی ، چال متین ، نورانی چہرہ ، نورانی داڑھی زیادہ سفید ، کچھ سیاہ اور شاید اسی نورانیت کی مناسبت سے لباس بھی خوب سفید براق ، سر پر نازک سی گول ابھری ٹوپی ۔ جسم پر لمبا کرتہ ، نازک و نفیس ۔ غالباً تنزیب کا ۔ تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی ، نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقعہ نہ تھا ۔ کہنا چاہیئے صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی ۔ اس پر بھی دلکشی ۔ رعنائی ۔ زیبائی بہ حیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی ، دل بے اختیار آواز دے ہی اٹھا ؎

قربان یک نگاہِ تو عمر دراز ما

قریب آنے کے بعد کے مشاہدات:-

"بیٹھنے بٹھانے سب کے آداب قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ۔ ہر بات نظم و آہنگ۔ دائیں طرف مولانا حسین احمد مدنی بٹھائے گئے اور اس کے بعد ہم (مولانا عبدالماجد اور مولانا محمد علی جوہر) خوب باتیں ہوئیں۔ مخاطب روزنامہ ہمدرد کا ڈائریکٹر تھا۔ سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہوگئیں۔

مولانا کی مرتب و منظم زندگی کا نظارہ پہلی بار ہوا۔ مکالمت پر شفقت۔ نشست باوقار عام مہمانوں۔ دوستوں۔ ملنے جلنے والوں کے حق میں تو آپ خلق مجسم تھے۔ خشونت و تنگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی راحت و سہولت کے ایسے ایسے جزئیات تک کی رعایت رکھتے تھے۔ جہاں تک خود ان کی نظر بھی نہ پہنچ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد حضرت نے اپنے دوسرے معمولات پورے کرنے کے لئے ہم سے رخصت چاہی۔ اس لجاجت اور التجا کے لہجہ میں کہ گویا وہ چھوٹے ہیں اور ہم بڑے۔ یہ ہنستا ہوا چہرہ اور مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا کیسے ہو سکتا ہے؟

(حکیم الامت)

شفقت و رحمت کے باوجود آپ ہیبتِ حق کے مظہر تھے۔ بڑے بڑے ارباب علم و فضل آپ کے رعب اور ہیبت سے ڈرتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے چوٹی کے محققین بھی جب اس صاحب تعلیم و تبلیغ کے سامنے جاتے تو تسلیم و رضا کا [illegible] وہ خود لکھتے ہیں کہ جب حضرت کے سامنے جاتے تو ہونٹ خشک ہو

جاتے اور زبان میں لکنت سی آجاتی۔ مولانا مناظر احسن نے رعب و ہیبت کی کیفیت اپنے مشاہدہ کی بنا، پر ان لفظوں میں لکھی ہے کہ:۔

"فرطِ ادب نے حافظہ خراب کر دیا۔ بولنا چاہتا تھا۔ مگر نہ بولا گیا"

مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنی دوسری ملاقات کے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں:۔

"اب کے حاضری کے بعد معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے اور تقدس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے کرّوبیوں میں نہیں۔ آب و گل سے ترکیب پائے ہوئے، انسانی دل، بشری جذبات رکھنے والے انسان ہیں۔ بالمومنین رؤف رحیم کے سچے جانشین ضرورت کے وقت اور مصلحت کے ماتحت جتنے بھی سخت اور سخت گیر ہو جائیں لیکن اپنی عام طینت و خلقت کے لحاظ سے رحماء بینہم کے مصداق ہیں"

(حکیم الامت صہ۲۴)

تسخیر و تاثیر

آپ کی تحریر اور تقریر میں بڑی تاثیر تھی اور اس کے ساتھ حسن تسخیر بھی۔ ایک دنیا آپ کی طرف کھچی چلی آتی تھی۔ تقریر اتنی فصیح و بلیغ شستہ و برجستہ اور جامع و مانع الفاظ کا مرقع ہوتی کہ سننے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ جیسے آپ فرصت کے اوقات میں غور و خوض سے لکھا ہوا دقیق اور مفید علمی و عملی مضمون پر مبسوط و مربوط مقالہ گھر سے تصنیف کر کے لائے ہوں اور وہی پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ جس نے بھی آپ کی تقریر سن لی یا وعظ پڑھ لیا۔ اسکی کایا پلٹ گئی:۔

"سینکڑوں انگریزی دان جو دین سے بالکل آزاد اور فیشن کے بیحد دلدادہ تھے، مطالعہ مواعظ کی برکت سے پکے دیندار اور پورے ملّا بن گئے۔ نہ کوٹ پتلون رہا، نہ تصویر دا کمرہ رہا، نہ کرزن فیشن رہا۔ ایسے بہت سے حضرات کو خود احقر بھی جانتا ہے کہ جو کسی زمانہ میں سرتا پا انگریزی فیشن میں

رہتے تھے اور ملحدانہ عقائد رکھتے تھے ۔ لیکن اتفاق سے حضرت والا کا کوئی وعظ نظر سے گزر گیا تو پھر ایسا چسکا لگا کہ سینکڑوں کی تعداد میں دیکھ ڈالے اور حالت کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی ۔ یہاں تک کہ حضرت والا کے مجازِ طریقت ہو گئے ''

(اشرف السوانح)

دورِ مصائب

حضرت تھانوی نے بھی دورِ آلام و مصائب پایا تھا۔ آپ حیات المسلمین کے دیباچہ میں لکھتے ہیں جو وسط ۱۹۲۵ء میں لکھی گئی اور آغاز ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی ۔

'' اس وقت مسلمانوں پر عالم میں عموماً اور کشور ہند میں خصوصاً مصیبتوں پر مصیبتیں اور بلاؤں پر بلائیں نازل ہوتی چلی جا رہی ہیں ۔ مگر نہ ان کی طرف ان کے ذہن کو مطلق التفات ہوتا ہے ۔ نہ ان کی زبان پر ان کا نام آتا ہے ۔ نہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلتا ہے ۔ اگر کسی کو علاج و تدبیر کی طرف توجہ ہوتی ہے تو وہ نسخے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ جن کے متعلق بے تکلف یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ مرض کے خلاف ہوتے ہیں ۔ جو مزاج میں بجائے درستی کے نادرستی پیدا کر دیتے ہیں ۔ کیونکہ ان مصائب کی تشخیص میں ان کو نصوصِ الٰہیہ و نبویہ (قرآن و حدیث) کی پوری تصدیق حاصل نہیں ہوتی ''

صیانتہ المسلمین میں جو جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی ۔ آپ نے ان امراض کی تشخیص کرتے ہوئے لکھا کہ :-

'' ہمارے بھائیوں میں اجتماع ۔ اتفاق ۔ تنظیم قریب قریب مفقود ہے ۔ اس لئے ہر مسلمان بجائے خود اپنے کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے ۔ ورنہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہلِ حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں

ہو سکتا۔ اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراض دنیویہ مقصود ہیں۔ بلکہ اکثر تو دین کو ان اغراض میں مخل سمجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ ان کے دو طریق مشروع ہیں۔ ایک ضعفاء کے لئے کہ سکوت محض نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا اقرباکی حفاظت و مدافعت کی تدبیر کریں۔ اپنے لئے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی!"

علامہ اقبال کو ان مصائب کا بعد ازاں احساس ہوا۔ جس کا تذکرہ انہوں نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں کیا۔

تخیلِ پاکستان

لیکن ان مصائب کا حل حضرت تھانوی نے جون ۱۹۲۸ء میں اس وقت پیش کر دیا تھا۔ جب مولانا عبدالماجد دریا بادی پہلی دفعہ تھانہ بھون میں حضرت تھانوی سے ملے۔ اس ملاقات کے تذکرہ میں آپ نے لکھا:-

"پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔"

(نقوش و تاثرات صد ۲۳)

راقم الحروف کی درخواست پر مولانا دریا بادی نے مذکور الصدر "جزو" کی وضاحت کرتے ہوئے راقم کو لکھا:-

"حضرت تھانوی کو بعض معاصر علما کی طرح "جنگِ آزادی" "جنگِ حقوق" "آزادیٔ وطن" وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں۔ تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے

دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء، احکام شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال ہو۔ نظام زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں وقس علیٰ ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے اور اس کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔"

(اندازِ سخن ص ۲۱۰)

گویا دربار اشرفیہ میں حصول و بقا پاکستان کا مسئلہ اور نظامِ پاکستان کا پورا نقشہ اس وقت پیش ہو چکا تھا۔ جب پاکستان چاہنے والوں کو ابھی اسکا خواب وخیال بھی نہ آیا تھا۔ حضرت تھانوی نے نظامِ پاکستان کا جو نقشہ مولانا عبدالماجد کی مجلس میں پیش کیا۔ اس کی تائید اگست ۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظم نے اپنی حیدر آباد دکن کی تقریر میں یوں کر دی۔

"اسلامی حکومت کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی و پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔"

(حیاتِ قائدِ اعظم ص ۴۲۸)

آئینی سرگرمیاں

ہندوستان میں مسلمانوں کے قدوم میمنت لزوم پہنچنے کے بعد، ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے ہندو راجاؤں کے عہد حکومت

میں مسلمانوں کے مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مسلمان حاکم مقرر ہوتے تھے اور کسی کا فیصلہ مسلمان تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت تھانوی بھی یہاں مسلمانوں کے معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے تھے اور آپ نے ہی ہندوستان میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے شروع کی۔ حضرت حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند کے توسط سے ممبرانِ اسمبلی۔ کونسل۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اور سائمن کمیشن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا۔ آپ کے ایمار پر میرٹھ میں انجمن نصب القضار قائم ہوئی۔ اس نے رسالہ "القول الماضی" ماضی میں شائع کرکے لوگوں کی اس طرف توجہ مبذول کرائی۔ ۱۹۲۹ء میں اس غرض کے لئے دہلی میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں تمام ممبران اسمبلی۔ ممتاز علمار دیوبند و سہارنپور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری مولانا محمد علی جوہر اور دربار اشرفیہ کی طرف سے مولانا عبدالکریم گمتھلوی شریک ہوئے۔

اس کے بعد آپ نے پنجاب کا قانون رواج عام بدلوانے اور شرعاً وراثت دلوانے کی مہم شروع کی اس کے لئے خود لاہور آئے۔ "غصب المیراث" نامی رسالہ لکھ کر اپنی گرہ سے چھپوا کر شائع کرایا اور اپنے خلیفہ مولانا عبدالمجید بچھراؤنی کو مولانا عبدالکریم گمتھلوی کے ہمراہ پنجاب میں بھیج کر "تحریک عدل فی المیراث" چلائی اور پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء میں اس تحریک کی بنار پر وراثت کا شرعی قانون نافذ ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست الور کے اندر دینی تعلیم قطعاً بند کر دی گئی۔ بعد ازاں دہلی میں بھی جبری تعلیم کے قانون کے تحت دینی مدارس توڑ دیئے گئے۔ ان کی بحالی کے لئے بھی حضرت تھانوی نے تحرک فرمایا اور اس کے لئے انجمن خدام القرآن قائم کی گئی۔ آپ کی دعا اور مالی امداد سے اس تحریک کو اتنے زور سے چلایا گیا کہ تھوڑی مدت بعد حکومت کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور بفضلہ تعالیٰ تمام دینی مدرسے پھر سے جاری ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں نواب جمشید علی خان کے ہمراہ چند اعلیٰ طبقہ کے وکلار اور رؤسار

حافظ ہدایت حسین بیرسٹر کانپور کی زیر سرکردگی حضرت تھانوی کی خدمت میں اس امر کی تحقیق کے لئے حاضر ہوئے کہ آیا مسلمانوں کے اوقاف کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت کو دخیل بنانا جائز ہے یا نہیں تو آپ نے انہیں یہی فیصلہ دیا کہ چونکہ یہ مذہبی فعل ہے۔ اس کے اندر غیر مسلم کا دخل دینا مذہبی دست اندازی ہے۔ اور مذہبی دست اندازی کرنا یا اس میں کسی طرح مداخلت کرنا صاف جرم ہوگا اور اس کی نسبت آپ نے اس وفد کو ایک یادداشت بھی لکھ دی ہے۔ جس میں اپنے فیصلہ کے حق میں شرعی دلائل درج کئے۔ جس کی تائید میں علماء کے متعدد اجلاس ہوئے اور باقاعدہ ایک قانونی مسودہ قرارداد تیار ہوا۔ جس پر تیس ۳۰ علماء کے دستخط ہوئے۔ اور اس پر آخری غور تھانہ بھون میں حضرت کی موجودگی میں پانچ گھنٹے تک ہوتا رہا۔ جس میں خود مجوزہ مسودہ حافظ ہدایت حسین بیرسٹر ممبر کونسل آف سٹیٹ۔ نواب جمشید علی خان ممبر لیجسلیٹو اسمبلی۔ حاجی وجیہہ الدین ممبر اسمبلی شریک رہے۔ ترمیمی مسودہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع (حال مفتی اعظم پاکستان) نے تیار کیا تھا۔ جس پر حضرت تھانوی کے دستخط ہوئے تھے۔ قانون تنسیخ نکاح سے قبل مسلمان عورتیں عیسائی بن کر بعد حصول بپتسمہ اپنا نکاح تنسیخ کراتی تھیں۔ اس سلسلہ میں بھی حضرت تھانوی نے علماء، مدینہ منورہ۔ دیوبند اور سہارنپور سے بار بار فتاویٰ حاصل کر کے مسلمان عورتوں کو خاوند کے جبر و تشدد سے نجات دلانے کے لئے پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک رسالہ حیلۃ الناجزہ تصنیف کر کے اور ایک ہزار روپیہ کی لاگت سے چھپوا کر ارکان اسمبلی میں تقسیم کر دیا۔ جس پر دوسرے علماء کی بھی تصدیق ثبت تھی۔ جس کی بناء پر ۱۹۳۹ء میں ایکٹ نمبر ۸ قانون تنسیخ نکاح منظور ہوا۔ جس پر آج تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر گورنمنٹ ہند نے اسمبلی میں ہندوستان کی طرف سے فوجی امداد دینے کے لئے آرمی بل پیش کیا۔ جس کی کانگرس نے سخت مخالفت کی۔

مگر قائدِاعظم نے اسکی حمایت کی۔ جس پر کانگرس نے قائدِاعظم اور مسلم لیگ کے خلاف آسمان سر پر اٹھالیا۔ جس کی آواز تھانہ بھون تک پہنچی اور حضرت تھانوی نے حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے ایک وفد قائدِ اعظم کی خدمت میں دہلی بھیجا جو مولانا شبیر علی تھانوی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی۔ مولانا مفتی محمد شفیع (حال مفتی اعظم پاکستان) اور مولانا عبدالکریم پر مشتمل تھا۔ اگرچہ وفد کو ملاقات کے لئے آدھ گھنٹہ وقت دیا گیا تھا۔ مگر ارکان وفد کو جن امور کی وضاحت مطلوب تھی۔ ان کی وضاحت میں ڈیڑھ گھنٹہ تک بات نے طول کھینچا۔ ارکان وفد نے اجازت چاہی کہ آپ کا وقت ہرج ہو رہا ہے۔ قائدِ اعظم نے فرمایا:۔

”نہیں۔ دوسرے لوگ جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیا کہیں گے۔ لیکن آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ اس لئے آپ جس قدر چاہیں۔ شوق سے گفتگو کریں۔ میں برابر سنوں گا“

قائدِ اعظم نے وفد کو اس بل کی مخالفت اور موافقت کی وجہ یہ بتلائی کہ اس وقت فوج میں ستر فی صدی مسلمان ہیں۔ کانگرس چاہتی ہے کہ اس میں مسلمانوں کی تعداد گھٹا کر ۲۵ فیصد کر دی جائے تاکہ کل کو جب آزادی ملے۔ تو فوج ہماری ہو۔ لیکن اگر اس وقت مسلمانوں کو بے ہتھیار کر دیا گیا تو اس وقت مسلمان کی نہ عزت محفوظ ہو گی اور نہ جان و مال۔ اس لئے میں اس بل کی موافقت کر رہا ہوں تاکہ آزادی کے وقت طاقت مسلمان کے ہاتھ میں رہے۔ جب وفد نے حضرت تھانوی کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کی تو آپ نے بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے قائدِ اعظم کے مؤقف کی مجلس عام میں تائید کر کے مسلم لیگ کے مخالفین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

اس طرح یہ دور بین مرد درویش ایک دور افتادہ غیر معروف قصبہ میں بیٹھ کر ہندوستان میں پاکستان کی داغ بیل ڈال رہا تھا اور آپ کی تائید وحمایت پر قائدِ اعظم

فخر فرما رہے تھے۔ حضرت تھانوی کا تن واحد ہے۔ کوئی جماعت نہیں۔ چندہ نہیں جلسہ نہیں۔ جلوس نہیں۔ پریس نہیں۔ اخبار نہیں۔ سارے کا سارا ماحول مخالف ہے۔ حصولِ پاکستان کی ابھی باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوئی اور آپ دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے پاکستان کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ جس کی بنار پر آپ کو قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔

سیاسی نظریہ

ہندوستان کے طبقۂ علمار میں یہ شرف اور یہ سعادت صرف اور صرف حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے ہم مسلک و ہم مشرب حضرات کو حاصل تھا کہ انہوں نے کانگرس کے معاملہ میں علی الاعلان، کھلے بندوں قائدِاعظم اور مسلم لیگ کی حمایت و اعانت کی اور اس وقت کی۔ جب پورے ملک میں سیاسی طوفان آیا ہوا تھا۔ تحریکِ خلافت ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد بن چکی تھی۔ مسلمان گاندھی کی جے کے نعرے لگا رہے تھے اور ہندو محمد علی، شوکت علی کی جے پکار رہے تھے۔ اور اسوقت اکبر کے دین الٰہی کی طرح ایک ایسے مذہب کی بنیاد پڑ رہی تھی جو ہندو مسلمان کا سرے سے امتیاز ہی اٹھا دینا چاہتا تھا۔ اور جسے حضرت تھانوی نے اس دور کا ایک بہت بڑا فتنہ قرار دیا تھا۔ جس کی بنار پر آپ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور فی الواقعہ حضرت تھانوی کے اعلان کی اشاعت کے بعد آپ پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ مگر قاتل ہیبتِ حق کی تاب نہ لا کر الٹے پاؤں واپس دوڑ گئے اور پھر ساری تحریک مسلم لیگ کے دوران کسی کو ایسی جرأت نہ ہوئی۔ حضرت تھانوی

> "انگریز حکومت اور کانگرس کے درمیان رسہ کشی میں مسلمانوں کو بالکل غیر جانبدار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان اپنے اندر پوری قوت نہیں پیدا کر لیتے۔ ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصہ لینا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اور سارا زور اس پر دیتے تھے

کہ مسلمان پہلے اپنے اندر قوت و نظم پیدا کریں"۔

(حکیم الامت صہ ۲۷۶)

اسی لئے جب ارباب دارالعلوم دیوبند کانگرس کی حمایت میں میدان میں نکل آئے تو آپ نے دارالعلوم کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب مسلم لیگ کو جھانسی میں کانگرس کے مقابلہ میں الیکشن لڑنا پڑا اور کانگرس لیگ کے مقابلہ میں نامور علمار میدان میں لائی تو عوام نے مولانا شوکت علی سے مطالبہ کیا کہ ان جیّد علمار دیوبند کے مقابلہ میں آپ جب تک کسی بہت بڑے عالم کو میدان میں نہ لائیں گے۔ یہ الیکشن نہ جیت سکیں گے۔ اس پریشانی کے عالم میں آپ کی نظریں تھانہ بھون کی طرف دوڑیں اور آپ نے عوام سے پوچھا کہ کیا آپ کو حضرت تھانوی پر اعتبار ہے۔ تو سب نے کہا اعتماد ہے۔ مولانا شوکت علی نے کہا اب آپ ان کو تار دیکر پوچھ لیں کہ ووٹ کانگرس کو دیں یا لیگ کو۔ جب یہ سوال آپ کے سامنے آیا تو آپ نے مولانا شبیر علی تھانوی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو مشورہ کے لئے طلب فرمایا اور مسئلہ زیرِ سوال کے تمام پہلوؤں پر غور و مشورہ کے بعد آپ نے صرف یہ تار دیدیا کہ کانگرس کو ووٹ نہ دیا جائے۔ بس تار کے جواب جانے کی دیر تھی کہ حضرت کے جواب کے بڑے بڑے پوسٹر شہر کے در و دیوار پر نظر آنے لگے۔ کانگرس بڑی طرح ہار گئی اور مسلم لیگ کا بول بالا ہو گیا۔ مولانا شوکت علی نے تھانہ بھون پہنچ کر حضرت تھانوی کے تار کا شکریہ ادا کیا اور کہا:۔

"جھانسی کے میدان میں ہمارے پاس کانگرس کے برابر نہ لاریاں تھیں نہ روپیہ پیسہ تھا۔ آپ کے تار نے کچھ ایسا اثر کیا کہ کایا پلٹ دی۔ مسلمانوں میں یکا یک مسلم لیگ کے حق میں جوش پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے ہم کامیاب ہوئے"۔

(سیرتِ اشرف صہ ۵۸۳)

حقیقتِ کانگرس

حضرت تھانوی ہر بات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھتے اور قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کے عادی تھے۔ اگرچہ انگریز دشمنی کی وجہ سے ہندوستان کے بڑے بڑے علمار کانگرس کے ساتھ تھے۔ مگر حضرت تھانوی انگریزوں کی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کا صریحاً دشمن سمجھتے تھے۔ آپ کی نظر وقتی مصالح پر نہ تھی بلکہ اس ربّانی ارشاد پر تھی کہ :-

کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔
یہاں تک کہ اگر قابو پا دیں تو تم کو تمہارے
دین سے پھیر دیں۔ (بقرہ ۲۷/۲)

اسلئے آپ بھی سر سید احمد خان کی طرح مسلمانوں کے کانگرس میں شمولیت کے حق میں نہیں تھے۔ اگرچہ کانگرس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مگر کوئی کانگرس کا نام تک نہ جانتا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے ۵۰ سالہ مردہ کانگرس میں شرکت کرکے اس میں روح پھونکی تو کانگرس مسلمانوں کو ہڑپ کرنے کی سوچنے لگی۔ اسی لئے حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ :-

(۱) "جو آدمی بھی حدودِ شریعت سے گزر کر کام کرے گا۔ اس کا بُرا حشر ہوگا۔ اسی بنار پر ہم کانگرسیوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کانگرسی اصل میں بالشویک ہیں۔ یہ کسی طرح بھی مذہب کی حامی جماعت نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ جماعت ہندوستان میں برسرِ اقتدار آگئی اور خدا نہ کرے وہ دن آئے تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کریں گے۔ جو (روس میں) بالشویک کر رہے ہیں۔"
(الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص۸۸)

(۲) "مسلمانوں خصوصاً علمار کا کانگرس میں شریک ہونا میرے نزدیک مہلک ہے۔ بلکہ کانگرس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔

علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیئے۔ مسلمانوں کو کانگرس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔"

(ملفوظاتِ اشرفیہ صہ ۸۸)

(۳) "۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اس لئے ناکامی ہوئی کہ اس تحریک میں ہندو شامل تھے۔ دونوں شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ مگر ہندوؤں نے وقت پر دغا دی اب بھی ان سے وفا کی امید نہیں ہے۔ یہ وقت پر دھوکا دیں گے۔ مسلمان اپنے ہی پاؤں پر کھڑا ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے سہارے کبھی نہیں۔"

(سیرت اشرف ۶۱۳)

(۴) "جو جماعت کانگرس کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بھی سب وہی بالشویک خیال کی پارٹی ہے اور یہ سب اسلام کے مقابلہ پر سازش ہے۔"

(الافاضات الیومیہ جلد اوّل صہ ۹۰)

(۵) "کانگرس انگریز کو ہندوستان سے نکالنا ہی نہیں چاہتی۔ درحقیقت ان کی عافیت ہی اسی میں ہے کہ انگریز ہندوستان میں رہیں۔ تاکہ وہ ان کے زیر سایہ اپنی قوم کو پروان چڑھائیں۔" (اسعد الابرار صہ ۵۱)

(۶) "قیامت آجائے۔ ہندو کبھی مسلمانوں کے ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔۔۔۔ یہی ہندو تو تھے۔ جنہوں نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مخبریاں کیں اور ان کو پھانسی چڑھوایا۔ یہ قوم بڑی احساس فراموش ہے۔ یہ انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں اور اسلام کے دشمن ہیں۔"

(الافاضا الیومیہ جلد چہارم)

آپ گاندھی کو عیار۔ دجال۔ شیطان اور طاغوت کے الفاظ سے یاد کرتے تھے اور جمہوریت کو مغربی بدعت کہتے تھے۔

حمایتِ اردو

حضرت تھانویؒ نے ہندوؤں کی بد باطنی۔ احسان فراموشی۔ اسلام دشمنی اور مسلم کشی کے متعلق جتنے اندیشے ظاہر فرمائے تھے۔ وہ سب اس کانگرسی دور میں صحیح ثابت ہوئے جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء کے انتخابات جیتنے کے بعد کانگرس کو چھ صوبوں میں اپنی اکثریت کی بنا پر نصیب ہوا تھا۔ اپنے اس دو سالہ دورِ اقتدار میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن۔ ثقافت و مذہب کو مٹانے اور تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ کہیں اردو کو مٹانے کے ذریعے۔ کہیں ودیا مندر سکیم جاری کر کے اور کہیں دیہات سدھار تحریک کی آڑ میں! حالانکہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہ تھی۔ یہ اقوامِ ہند کا مشترکہ سرمایہ تھی۔ اردو کے خلاف مہم ۱۸۶۱ء میں شروع ہو گئی تھی۔ سرکاری دفاتر میں اردو کی بجائے ہندی کو جگہ دلانے کی برابر کوششیں جاری رہیں اور کانگرسی دور اقتدار میں یہ مہم تیز تر کر دی گئی۔ اس کی خبر بذریعہ خطوط جب حضرت تھانوی تک پہنچائی گئی تو آپ نے اردو کانفرنس کی تائید میں ایک فتویٰ جاری فرمایا جس میں تحریر تھا:۔

"اگر خدانخواستہ زبان ضائع ہو گئی تو مسلمانوں کا تمام اسلامی ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ جو تمام دینی کتابیں فارسی یا عربی زبان میں تھیں۔ اب ان کا اردو زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ اسلئے اگر یہ زبان ضائع ہو گئی تو مسلمانوں خاص طور عوام مسلمین کے لئے تو علم دین کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہے گا۔ تو کیا کوئی مسلمان اس کو برداشت کر سکتا ہے کہ یہ ذخیرہ ضائع ہو جائے۔ اسلئے اردو کی حفاظت اس وقت دین کی حفاظت ہے۔ اس لئے یہ حفاظت حسب استطاعت واجب ہو گی اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا موجبِ مواخذہِ آخرت ہو گا۔"

(امداد الفتاویٰ جلد چہارم صد ۶۱)

دستور العمل حضرت تھانوی ان قائدین ملت میں سے نہ تھے۔ جو اپنی "ملکی وملی خدمات" اور اپنے وقتی بیانات جب تک اخبار میں چھپے ہوئے نہیں دیکھ لیتے ان کو چین نہیں آتا۔ آپ نے کبھی بھی اپنی سرگرمیوں یا کارکردگیوں کی خبریں اخبارات کو نہ بھجوائیں۔ کیونکہ آپ جو کچھ کرتے تھے۔ عوام کی خوشنودی کے لیے نہ کرتے تھے۔ بلکہ خدا کی رضا جوئی کے لیے کرتے تھے۔ اسلئے ان ملی معاملات کو اپنے یا خدا تک محدود رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ اپنی سوانح حیات بھی چھپوانا پسند نہ کرتے تھے۔ مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں :-

"یہ مردِ درویش ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل۔ نیک و بد اور صحیح وغلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں۔ وہ ان کے درست کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے پوری زندگی اس امر میں صرف کر دی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس شبیہہ کے مطابق بنا دے جو دینِ حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔" (جامع المجددین صہ ۲۸)

حضرت تھانوی نے جو زمانہ پایا تھا۔ وہ آجکل کی طرح فتنوں کا زمانہ تو نہیں تھا۔ مگر انقلاب کا زمانہ ضرور تھا۔ یعنی امتِ محمدیہ پر دنیوی حیثیت سے نہیں دینی حیثیت سے ایک انقلاب عظیم آچکا تھا۔ کتاب وسنت کے آئینہ میں دیکھنے سے مسلمانوں کا کوئی قول و فعل خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق نظر نہ آتا تھا۔ دین کو صرف عقاید وعبادات تک محدود سمجھ لیا گیا تھا۔ ان پر بھی بدعات و رسومات کا رنگ غالب آچکا تھا اور اب نوبت ترک تک آپہنچی تھی۔ یہاں تک کہ اب فرائض کو فرائض ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر حکم

شرعی پر ذاتی رائے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ خلاف شرع اصولوں پر فخر کیا جاتا تھا اور خدا و رسولؐ کے احکام کا تمسخر اڑایا جاتا تھا۔ جو تمامتر انگریزی تعلیم کے اجراء اور دینی تعلیم کے فقدان کا نتیجہ تھا۔ اس لئے آپ نے خواص و عوام کے لئے علیحدہ علیحدہ ایسے دستور العمل تیار کئے۔ جن پر وہ اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے باآسانی عمل کر سکیں اور جسکے بہت ہی مفید نتائج برآمد ہوئے۔

آپ حتی الوسع سیاسی تحریکات میں کوئی دخل نہ دیتے تھے۔ آپ کی سیاست سے صرف اس حد تک وابستگی تھی کہ جس طرح بھی بن سکے مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جائے۔ آپ نے مسلم لیگ کی حمایت بھی کسی سیاسی غرض کے لئے نہ کی تھی۔ بلکہ اس غرض کے لئے کی تھی کہ مسلمان لیگ کے اندر داخل ہوکر اپنی تنظیم اور لیگ کی اصلاح کی فکر کریں۔ تاکہ یہ کانگرس کا مقابلہ کر سکے۔

مجلس دعوت الحق چنانچہ اس غرض کے لئے آپ کے ایماء پر مجلس دعوت الحق قائم ہوئی۔ جسکے مندرجہ ذیل مقاصد تھے :-

۱۔ تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

۲۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اس وقت مسلمانوں میں بڑی حد تک مرکزی شان حاصل ہے۔ اسکے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

۳۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان کے پاس ان کے جلسوں میں یا خاص اوقات میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا۔ جو یہ بات ان کے ذہن نشین کرائے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباع احکام الٰہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی ہوئی ہے۔ محض اسباب ظاہرہ یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کیلئے ہرگز کافی نہیں۔

۴۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو شعائر اسلامیہ کی پابندی کی تبلیغ کرنا اور ان سے

درخواست کرنا کہ مسلم لیگ کے ہر ممبر پر قانونی طور پر شعائر اسلامیہ کی پابندی کو لازم کیا جائے کہ اس پر کامیابی موقوف ہے اور قلوب اہل اسلام کا انجذاب بھی اسی سے ہوگا۔ جو تنظیم کی بنیاد ہے۔

چنانچہ نومبر ۱۹۳۷ء سے اس تبلیغی پروگرام پر عملدرآمد شروع ہوگیا اور اسکی ابتداء قائدِ اعظم کو تبلیغ سے ہوئی۔

کوہِ استقامت اس زمانہ کی سیاسی کشمکش کے دوران آپنے ہمیشہ انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ جن معاملات میں علمار کا اختلاف ہو۔ ان میں بدوں کسی مکمل تحقیق و تفتیش کے کوئی فتویٰ صادر نہ فرماتے تھے۔ کوئی ایسا اعلان جاری نہ فرماتے تھے۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علمار کے خلاف برسرِ پیکار آنے کا موقع ملتا ہو۔ اعلان کے بعد بھی قابل قبول چیزوں کے قبول کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے اور باہمی مفاہمت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے۔

سیاسی کشمکش کے دوران علمائے امت اور لیڈران کرام میں اکثر مسائل پر اختلاف رہا۔ ہر جماعت اپنے اپنے نظریہ کے مطابق پہلو بدلتی رہی۔ مگر حضرت تھانوی اس دورِ انقلاب میں اپنے مسلک پر قائم رہے۔ آپ کے ایک ارشاد کے مطابق آپ کا ہمیشہ یہ مسلک رہا:۔

"اعلانِ حق میں کبھی دریغ نہ کیا نہ عمل میں کبھی نمائش یا ہنگامہ آرائی کو دخل دیا۔ میری جماعت جس طرح شورش پسند نہیں۔ اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمانِ حق کرنے والی بھی نہیں۔"

(معاملۃ المسلمین فی مجادلۃ غیر المسلمین)

آپ چونکہ درویش طبع تھے۔ اس لئے سیاسی تحریکات میں عملی حصہ نہ لیتے تھے۔ مگر سیاسی تحریکات کے سلسلہ میں جب آپ کے پاس استفسار آتے تھے تو اس وقت

بحیثیت مجدد الملت وحکیم الامت آپ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح کر دیتے تھے اور بس۔ اسی لئے آپ نے مسلم لیگ کی تائید وحمایت کی۔ مگر اس میں شریک نہ ہوئے۔ غرض کہ اس دور کے سیاسی طوفان اس کوہ استقلال کو اپنے مقام استقامت سے نہ ہلا سکے جسکا بطور تحدثِ بالنعمۃ آپ نے یوں ذکر فرمایا:۔

"سب کو کچھ نہ کچھ اپنے مرکز سے ہٹنا پڑا۔ لیکن الحمدللہ میں جس مرکز پر اول روز تھا۔ اس مرکز پر آج تک بدستور قائم ہوں۔ مجھ کو بفضلہ تعالےٰ اپنی رائے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹنا پڑا۔ بلکہ تجربوں نے تو اور بھی مجھ کو اپنی رائے پر مستحکم کر دیا ہے۔"

(اشرف السوانح جلد سوم صہ ۱۶۰)

مسلم لیگ اور تبلیغ

کانگرس اور مسلم لیگ کی کشمکش کے دوران حضرت تھانوی نے اپنی چشم فراست سے دیکھ لیا تھا کہ پاکستان بہرصورت بن کے رہے گا۔ لیکن یہ صحیح معنوں میں اس وقت پاکستان کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اگر اس کا نظام حکومت کتاب وسنت کے موافق ہوا اور یہ تبھی ممکن ہے کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار خود کتاب وسنت کے مطابق عمل پیرا ہوئے۔ اسی سوچ بچار میں ماہ مئی ۱۹۳۶ء میں آپ نے ایک روز تھانہ بھون کے رئیس اعظم۔ دربار اشرفیہ کے سفیر۔ خانقاہ امدادیہ کے مہتمم اور اپنے برادر زادہ مولانا شبیر علی تھانوی کو اپنی سرورری میں بلا کر فرمایا:۔

"میاں شبیر علی! ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جائیں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی۔ وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی۔ جن کو آج سب فاسق فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ یہی لوگ دیندار بن جاویں اور آجکل کے حالات ایسے

ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل جاوے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات۔ ساری دنیا سے جوڑ توڑ۔ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیاداروں ہی کا کام ہے۔ مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا۔ اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت ان ہی کے ہاتھ میں رہی تو چشم مار وشن دلِ ماشاد کہ ہم خود سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو۔ وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔"

اس پر مولانا شبیر علی نے عرض کیا کہ تبلیغ نیچے کے طبقہ یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقہ یعنی خواص سے؟ تو حضرت تھانوی نے ارشاد فرمایا:۔

"اوپر کے طبقہ سے! کیونکہ وقت کم ہے۔ خواص کی تعداد کم ہے اور الناس علی دین ملوکھم۔ اگر خواص دیندار اور دیانتدار بن گئے تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔"

(سیرت اشرف صد ۵۵۹)

حسنِ خطاب

اس فیصلہ کے ساتھ ہی آپ نے قائدِ اعظم سے از راہِ تبلیغ مکاتیب شروع کر دی۔ قائدِ اعظم بھی اپنی مصروفیات کے باوجود بڑی عجلت سے جواب دیتے۔ جس کا حضرت تھانوی کو بہت احساس ہوا۔ جیسا کہ آپ کے مندرجہ ذیل خط سے ظاہر ہے۔ جو آپ نے ۲۸-۶-۱۱ کو قائدِ اعظم کے نام لکھا اور قائدِ اعظم پیپر سیل (Paper Cell) اسلام آباد میں محفوظ ہے:۔

"مکرم و محترم زاد مجدہم۔ السلام علیکم!

الطاف نامہ نے مسرور و ممنون اور غایت درجہ مطمئن فرمایا۔ دل سے

دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین اسلام کی قوت کا ذریعہ بنا دے۔ میں بکثرت دعا میں مشغول رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماویں۔ واقعی آپ نے جیسا تحریر فرمایا ہے۔ آپ کے بہت مشاغل ہیں اور نہایت اہم ہیں۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی گوارا نہیں کرتا کہ ان میں کسی درجہ کا بھی حرج ہو۔ اس بنا پر میں بلا کسی تکلف کے عرض کرتا ہوں کہ میری معروضات کا جواب دینے کا اہتمام نہ فرمایا جاوے۔ میں انتظار نہ کروں گا۔ صرف اس کی اجازت عطا فرما دینا کافی ہے۔ کہ کسی وقت کوئی مفید بات میرے ذہن میں آوے۔ تو اس کو عرض کر دیا کروں اور وہ آپ کے پیش نظر رہے۔ البتہ میرے لائق کوئی خدمت یا مشورہ کی غرض سے کوئی استفسار ابتداً ذہن عالی میں آجاوے۔ تو آپ کا الطاف نامے کو فخر سمجھوں گا۔ والسلام۔

اشرف علی عفی عنہ از تھانہ بھون
ضلع مظفر نگر۔

تبلیغی وفد

۴، جون ۱۹۳۸ء کو بمقام بمبئی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا۔ اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے حضرت تھانوی نے بغرضِ تبلیغ مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر سرکردگی ارباب مسلم لیگ کو تبلیغ کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے اخراجات کے لئے آپ نے اپنی جیب سے تین سَو روپے بھی عطا کئے اور اس امر کی اطلاع بذریعہ چٹھی مولانا شوکت علی کو اور محمد اسماعیل خان صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو۔ پی کو بھیج دی۔ تاکہ وہ اس وفد کی مسٹر محمد علی جناح اور دیگر اراکین مسلم لیگ سے ملاقات کا انتظام کرا دیں۔ مگر مولانا شبیر احمد عثمانی عین وقت پر اپنی والدہ کی شدید علالت کے باعث وفد کے ساتھ نہ جا سکے اور نہ کوئی دوسرا ایسا موزوں امیر وفد مل سکا۔ جو مسٹر جناح سے حضرت کی منشار کے مطابق گفتگو کر سکتا۔ اس لئے اس وقت

اس وفد کی روانگی روک دی گئی اور یہ وفد دسمبر ۱۹۳۶ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ کے موقعہ پر بھیجا گیا جس کے رئیس الوفد مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری مقرر ہوئے۔ اس وفد میں ان کے علاوہ مولانا شبیر علی تھانوی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی۔ مولانا عبدالجبار ابوہری مولانا عبدالغنی پھولپوری اور مولانا معظم حسین امروہوی شامل تھے۔

ہدایات برائے تبلیغ

مسٹر محمد علی جناح چونکہ بقول مورخِ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی۔ "بڑے قانون دان۔ بڑے مناظر اور اجتماعات کے بڑے نبض شناس تھے اور اپنے پیروؤں پر بلا کا اثر رکھتے تھے۔ ان کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی"

(یادِ رفتگان ص ۴۲۲)

اسلئے حضرت تھانوی نے ارکان وفد کو ارباب مسلم لیگ سے گفتگو کرنے کے لئے حسب ذیل ہدایات دیں۔

"گفتگو میں اس امر کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم لہجہ میں ہو۔ اختلافی مسائل درمیان میں بالکل نہ آویں۔ اگر مخاطب اختلافی مسائل درمیان میں لانا چاہے۔ تو بلطائف الحیل اس سے گریز کرنا اور دوسری گفتگو شروع کر دینا۔ اگر مخاطب کے کسی عمل کے متعلق کچھ تنقید کرنا ہو تو لہجہ تنقیدی اختیار نہ کرنا۔ بلکہ لہجہ ہمدردانہ اور تبلیغی ہو۔ الفاظ نرم ہوں اور کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جواب ایسا دینا۔ جس کو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے۔ جس میں ایک مثال دیتا ہوں کہ میں فتح پورہ سے الٰہ آباد جا رہا تھا۔ ریل میں کچھ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان ہم سفر ہو گئے۔ مجھے وہ پہچانتے نہ تھے۔ مگر صورت سے مولوی سمجھ کر پوچھنے لگے کہ مولانا شریعت نے کتا

پالنا کیوں منع کیا ہے۔ حالانکہ اس میں بہت سی صفات اچھی ہیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب قومی ہمدردی کا علی گڑھ میں بہت زور تھا۔ میں اگر ان کے سامنے شرعی مسائل بیان کرتا اور اللہ و رسول کے احکام بیان کرتا تو بحث کا دروازہ کھل جاتا اور وہ مقصد کہ ان کے دل میں کتے پالنے کی برائی بیٹھ جائے۔ حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے میں نے ان سے کہا کہ کتے میں ساری صفات مسلّم! مگر ایک عیب ایسا ہے کہ سب صفات پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انہوں نے کہا مولانا وہ عیب کیا ہے؟ تو میں نے کہا اس میں قومی ہمدردی نہیں۔ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے۔ تو فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس پر وہ سب نوجوان خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے واقعی یہ جنس پاس رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ ورنہ ہم میں بھی یہ اثر آوے گا تو یہاں اس کا لحاظ رہے کہ مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ لیکن مخاطب کے فہم کا بھی ضرور لحاظ رہے۔"

(تعمیر پاکستان و علماء ربانی ص۷۲)

قائدِ اعظم اور نماز

یہ ہدایات لے کر وفد ۲۴، دسمبر ۱۹۳۸ء کو پٹنہ پہنچ گیا۔ اسی روز لیگ کا بھی اجلاس شروع ہونا تھا۔ حضرت تھانوی نے ارکان لیگ کے نام اپنا ایک پیغام بھی طبع کرا کر وفد کو بغرض تقسیم دیدیا تھا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے وفد کی مسٹر محمد علی جناح سے ملاقات کا وقت مقرر کرا دیا۔ امیر الوفد نے مسٹر جناح سے گفتگو کی ذمہ داری مولانا شبیر علی تھانوی پر ڈال دی۔ جونہی یہ وفد مسٹر جناح کے کمرہ میں داخل ہوا۔ مسٹر جناح نے کرسی سے اٹھ کر ارکان وفد کا استقبال کیا۔ عبدالعزیز بیرسٹر نے جن کے مسٹر جناح مہمان تھے۔ ارکان وفد سے آپ کا تعارف کرایا اور ایک گھنٹہ تک حضرت تھانوی کی ہدایات کے مطابق مولانا شبیر علی

آپ سے گفتگو کرتے رہے۔ اس ایک گھنٹہ کی ملاقات میں بہت سے مذہبی امور کے علاوہ نماز کا بھی خاص طور پر ذکر آیا۔ مولانا شبیر علی تھانوی اپنی روئیداد ملاقات میں لکھتے ہیں کہ:-

"بدوران گفتگو میں نے جناح صاحب سے یہ سوال کیا کہ آپ ہزاروں روپیہ خرچ کرا کے پنڈال وغیرہ بنواتے ہیں اور لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں۔ اس میں نفع کیا ہے؟ جناح صاحب نے فرمایا کہ اس سے غیر اقوام پر رعب پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک اور تدبیر بتا دوں جس سے رعب زیادہ ہو گا۔ فرمایا کہ وہ کیا! میں نے کہا کہ جب دوران جلسہ میں نماز کا وقت آجائے تو اس سوا ڈیڑھ لاکھ کے مجمع کو لے کر باجماعت نماز ادا کریں۔ پھر آپ خود دیکھیں گے کہ کتنا رعب پڑتا ہے۔ اس پر جناح صاحب نے فرمایا کہ آپ فرماتے تو صحیح ہیں۔ مگر اس وقت اس پر عمل کرنے سے معذور ہوں۔ میں نے کہا آپ کو کیا عذر ہے؟ تو فرمایا کہ آپ باجماعت نماز پڑھنے کو کہتے ہیں۔ تو امام کس کو بناؤں۔ ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح ہو کہ اگر میں امامت کروں۔ سب نہیں تو بہت بڑی اکثریت میرے پیچھے نماز پڑھ لے مگر میں امامت کے قابل نہیں۔ مجھ میں اس کی اہلیت نہیں۔ اس لئے کسی دوسرے کو امام بنانا پڑے گا۔ اگر امام دیوبندی ہو گا۔ تو بریلوی اسکے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے۔ اگر بریلوی ہوگا تو دیوبندی نہ پڑھیں گے۔ اور الگ جماعتوں سے بجائے رعب پڑنے کے غیر اقوام کو مسلمانوں کا اختلاف نمایاں ہو گا۔ اب تو اپنی اپنی مسجد میں پڑھتے ہیں اور یہاں اگر کئی جماعتیں ہوئیں تو یہ زیادہ نمایاں ہو گا۔ اس لئے میں اس وقت تو معذور ہوں۔ آگے چل کر دیکھا جائے گا"

اس پر مولانا شبیر علی نے بحث کو سمیٹتے ہوئے فرمایا کہ :-

"خود آپ پڑھی تو نماز فرض ہے۔ آپ کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ جلسوں میں یہ معمول رکھیں کہ جب نماز کا وقت آوے۔ مصلیٰ بچھا کر آپ نیت باندھ لیں اور کوئی پڑھے یا نہ پڑھے! اس سوال کا جو جواب جناح صاحب نے دیا۔ اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ جن کو سن کر مجھے تو پسینہ آگیا تھا کہ ایک بے عمل مگر اتنا بڑا آدمی یوں مجمع کے سامنے اقرار خطا کرے۔ بڑی بات ہے۔ ہم جیسوں سے اس قسم کا سوال ہوتا تو شاید تاویل ہی کرتے۔ مگر اللہ تعالےٰ انہیں مغفرت کرے (آمین) کہ وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ میری بات سن کر وہ آگے کو جھک گئے اور نہایت ندامت کے لہجہ میں یہ الفاظ فرمائے:۔

"مَیں گنہگار ہوں۔ خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں۔ میرا فرض ہے کہ مَیں اسکو سنوں۔ مَیں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کرونگا"۔ چونکہ اس کمرہ میں ہمارے (ارکانِ وفد کے) علاوہ بارہ تیرہ اور حضرات بھی موجود تھے۔ جن میں سے مولوی منفعت علی صاحب وکیل سہارنپوری۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ۔ مسٹر عبدالعزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ کو میں جانتا تھا۔ باقی حضرات سے مَیں ناواقف تھا۔ ان سب کے سامنے ان الفاظ سے بغیر کسی تاویل کے اظہار ندامت اور اقرارِ اصلاح نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس تاویل سے فوراً سنبھل کر مَیں نے کہا کہ دیکھئے۔ یہ وعدہ جناح صاحب کا ہے۔ کسی چلتے پھرتے آدمی کا نہیں۔ اس وعدہ کو پورا فرمایا جاوے اس پر مرحوم سیدھے ہو کر تن گئے اور بار بار سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ:۔

"جناح کا وعدہ! جناح کا وعدہ! مَیں اس کو پورا کرنے کی کوشش کرونگا۔ آپ میرے لئے دعا کریں"۔ (مشاہدات وواردات صہ ۱۱۶ تا ۱۱۸)

اسکے بعد ارکان وفد نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں دربارِ اشرفیہ کی طرف سے بحیثیت نمائندہ شرکت کی۔ حضرت تھانوی کا مطبوعہ پیغام بنام ارکان مسلم لیگ وہاں تقسیم کیا اور واپس واکر اپنی پہلی کامیابی کی تھانہ بھون رپورٹ کی۔ جس سے حضرت نے خوش ہو کر دعا دی۔ اس کے بعد حضرت تھانوی نے قائدِ اعظم کے قول و کردار پر گہری نظر رکھی جب بھی حضرت آپ میں کوئی خلاف شریعت بات دیکھتے اسکی اصلاح کے لئے فوراً وفد بھیجتے یا خط لکھتے۔

مذہب و سیاست دسمبر ۱۹۳۸ء کے بعد قائدِ اعظم نے جو تقاریر کیں۔ ان سے پتہ چلا کہ قائدِ اعظم مذہب کو سیاست سے جدا سمجھتے ہیں اور الگ رکھنا چاہتے ہیں جس پر آپ نے مولانا شبیر علی تھانوی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان) پر مشتمل ایک وفد بھیجا۔ جس کی ۱۲- فروری ۱۹۳۹ء کو شام کے سات بجے قائدِ اعظم سے ملاقات ہوئی۔ جس میں وفد نے اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کی اور مذہب و سیاست پر افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی رکن وفد لکھتے ہیں :-

"وفد نے قائدِ اعظم سے کہا کہ مسلمان کسی تحریک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس تحریک کو شریعت کے مطابق نہ چلائیں۔ اس تحریک کے چلانے والے خود کو اسلام کا نمونہ نہ بنائیں اور ان کے پیرو شعائر اسلام کی پابندی نہ کریں۔ کیونکہ جب یہ سب خود کو احکام دین کا پابند بنالیں گے تو اس کی برکت سے نصرت و کامیابی خود بخود ان کے قدم چومے گی اور انشاء اللہ جلد کامیابی ہو گی۔

وفد نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی سیاست کبھی مذہب سے الگ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائد مسجدوں کے امام بھی تھے اور میدان کے جرنیل

بھی۔ خلفائے راشدین حضرت خالد بن ولیدؓ۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ
حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ سب مذہب و سیاست کے جامع تھے"
قائدِ اعظم نے فرمایا کہ میرا تو خیال یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ
رکھنا چاہیئے۔ وفد نے کہا کہ پھر اسطرح کامیابی کی توقع نہیں"

اس موضوع پر اڑھائی گھنٹہ تک وفد کی قائدِ اعظم سے گفتگو ہوتی رہی اور آخر یہ خانقاہ نشین علماء دنیا کے اس بہت بڑے اور کامیاب سیاستدان سے اپنا مؤقف تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے اور قائدِ اعظم نے ان الفاظ میں اپنا تاریخی فیصلہ سنایا:۔

"دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو۔ میری سمجھ میں اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے" (روئیداد ص۷)

اس کے بعد تبلیغی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ وفد کی ملاقاتوں کو قائدِ اعظم اتنی اہمیت دیتے تھے کہ ایک مرتبہ وفد کو گفتگو میں کافی دیر ہو گئی اور باہر ڈاکٹر ضیاء الدین آپ سے ملاقات کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ اس لئے وفد نے اجازت چاہی تو قائدِ اعظم نے فرمایا:۔

"نہ نہ! آپ اسکا ہرگز خیال نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب سے ہر وقت بات چیت ہوتی رہتی ہے اور اس وقت بھی وہ جس کام کے لئے آئے ہیں، مجھے معلوم ہے۔ مگر آپ تو کبھی تشریف لاتے ہیں۔ اور حضرت تھانوی کی باتیں مجھے سمجھاتے ہیں۔ علماء میرے پاس بہت آئے۔ مگر سب مجھ سے موجودہ سیاست میں بات کرتے ہیں۔ جس سے وہ حضرات ناواقف ہیں اور میں مذہب سے ناواقف ہوں۔ حضرت تھانوی نے آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی امر میں گفتگو کے لئے نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی

معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جو اور جگہ نصیب نہیں ہوتیں۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو تو بیٹھ جائیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا۔" (تعمیر پاکستان و علماء ربانی صہ ۸۵)

معاہدۂ تقلید تبلیغی وفود کی آمد و رفت کے دوران ایک روز مولانا شبیر علی تھانوی نے قائدِ اعظم سے عرض کی کہ:-

"ہم انگریزی سیاست سے ناواقف ہیں۔ اس لئے ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں۔ آپ انگریز کو تھپڑ مارنے کو کہتے ہیں تو ہم تھپڑ مارتے ہیں۔ آپ گھونسہ مارنے کو کہتے ہیں تو ہم گھونسہ مار دیتے تھے۔ غرض اس معاملہ میں ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں اور جتنے ہم سیاست سے ناواقف ہیں۔ شاید اس سے کچھ زیادہ یا اتنے ہی آپ مذہب سے ناواقف ہیں تو جس طرح ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں۔ مذہبی معاملات میں بھی آپکو ہماری تقلید کرنی چاہیئے۔"

اس پر قائدِ اعظم نے فرمایا دنیا میں کتنے لیڈر ہیں۔ تو مولانا نے جواباً کہا جتنے برسات میں مینڈک۔ جس پر قائدِ اعظم ہنسے اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔ پھر دریافت فرمایا۔ کیا آپ ہر لیڈر کا کہا مانتے ہیں؟ مولانا نے کہا نہیں۔ ایسی تقلید میں اعتماد شرط ہے۔ تو قائدِ اعظم نے فرمایا:-

"بس۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں بے چون وچرا آپ کا کہا مانوں۔ تو میں تیار ہوں۔ آج تک تو میں آپ سے سمجھنے کے لئے بحث بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن آج کے بعد میں خاموش بیٹھ کر سنوں گا اور مذہبی معاملات میں آپ جو ہدایات دیں گے۔ ان کو تسلیم کروں گا۔ کیونکہ مجھے حضرت تھانوی پر پورا پورا اعتماد ہے۔ کہ مذہبی معاملات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کی رائے درست ہوتی ہے۔" (ایضاً صہ ۸۶)

سلسلۂ خطوط وفود کے علاوہ حضرت تھانوی قائدِ اعظم کو تبلیغی خطوط بھی لکھتے رہے جنکا ذکر "اعلامِ نافع" میں بالفاظ ذیل موجود ہے :۔

"میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام مسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اسی کام کے لئے بھیجا۔ پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اس کام کے لئے دہلی بھیجا۔ غرض جتنا مجھ سے ہوسکتا ہے۔ لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر تبلیغ کر رہا ہوں"

"افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ" میں بھی حضرت تھانوی کا یہ ارشاد موجود ہے کہ :۔

"جس زمانہ میں کانگریس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے۔ اس لئے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں۔ بلکہ علمائِ محققین سے پوچھ کر عمل فرمائیں تو انہوں نے نہایت شرافت سے جواب لکھا اور اطمینا دلایا کہ اسی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔"

(صـ ۹۶)

اعترافِ قائدِ اعظم حضرت تھانوی کے خطوط کی فائل قائدِ اعظم کے پاس محفوظ تھی۔ چنانچہ جب مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے ارکان قائدِ اعظم کے پاس بسلسلہ تبلیغ گئے اور ان سے شکوہ کیا کہ جماعت علمائ آپ کی تائید میں نہیں۔ تو قائدِ اعظم فوراً اٹھ کر دوسرے کمرہ میں گئے اور ایک فائل لاکر ان کے سامنے کھولی اور فرمایا آپ پہچانتے ہیں یہ کس کی تحریر ہے۔ انہوں نے فوراً تحریر پہچان کر کہا کہ یہ

تو حضرت تھانوی کی تحریر ہے۔ اس پر قائدِ اعظم نے بڑے جوش سے فرمایا:۔

"ہاں یہی شخص اس زمانہ میں سب سے بڑا عالم ہے۔ تم کن کو علماء سمجھتے ہو؟ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی صاحب۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا نام لیا۔ قائدِ اعظم نے فرمایا مولانا حسین احمد عالم ہیں۔ مگر ان کی سیاست ایک ہی ہے کہ انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اس دشمنی میں وہ مسلمانوں کے مفاد کی بھی رعایت نہیں کرتے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب واقعی مفتی ہیں اور کچھ سیاستدان بھی۔ لیکن ابوالکلام نہ عالم ہے نہ سیاستدان ہے۔ مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے۔ جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک پلڑا میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اسکا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔ جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کی حمایت کافی ہے اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں"۔

(تعمیر پاکستان و علماء ربانی صد ۱۹۶)

تصدیق صدیق

باغپت ضلع میرٹھ کے رئیس اعظم نواب جمشید علی خان بڑے صاحبِ علم و ذوق بزرگ تھے۔ اپنے علاقہ میں اخلاص و ایثار کی وجہ سے اتنے ہر دلعزیز تھے کہ متواتر تیس برس یو۔پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے۔ ایک طرف آپ کا حضرت تھانوی سے اتنا خصوصی تعلق تھا۔ کہ حضرت نے ان کے سلسلہ میں جناب وصل بلگرامی کو جو کچھ فرمایا۔ وہ آپ نے انہی کے نام کی نسبت سے "بزم جمشید" نامی رسالہ بھی چھپوایا۔ دوسری طرف نواب صاحب کا قائدِ اعظم سے اتنا گہرا یارانہ تھا کہ قائدِ اعظم اکثر موسم سرما میں باغپت جاکر نواب صاحب کے پاس چھٹیاں گزارتے تھے۔ حضرت تھانوی کے خطوط اور ان کے وفود کی تبلیغ سے قائدِ اعظم کے مذہبی خیالات

سیاسی نظریات میں جو انقلاب آیا اور جو کایا پلٹ ہوئی۔ وہ سب اسی تبلیغ دین کا نتیجہ تھی۔ جس کے متعلق نواب جمشید علی خان نے راقم الحروف کو لکھا:

"یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائدِ اعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانویؒ کا فیضان تھا اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا کی بدولت تھا۔ مولوی شبیر علی صاحب تھانوی نے قائدِ اعظم کو حضرت والا کے قریب تر لانے میں بڑا کام کیا۔

قائدِ اعظم باغپت کے دورانِ قیام میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا بہت خلوص اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قائدِ اعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند در چند وجوہات کی بنا پر ان کی یہ آخری تمنّا پوری نہ ہو سکی۔ قائدِ اعظم پر آخر زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا۔ جس کو ہم سب نے دیکھا۔ وہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی جوتیوں کا صدقہ تھا۔"

(اندازِ سخن ص۲۹۲)

(۸)

مولانا ظفر علی خان

منفرد شخصیّت جذبۂ توحید سے سرشار۔ سردارِ دوجہاں کے جانثار۔ مسلمانانِ عالم کے غمگسار۔ دنیائے صحافت کے علمبردار۔ میدانِ سیاست کے شہسوار۔ روزنامہ " زمیندار" کے قلمکار۔ مولانا ظفر علی خان ان مشاہیر اسلام میں سے تھے۔ جنھوں نے تن۔ من۔ دھن، دین کی سربلندی اور اسلام کی سرفرازی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

- یہ ان بندگانِ خدا میں سے تھے۔ جو غیر اللہ کی دہلیز پر ناصیہ فرسائی کو انسانیت کی توہین سمجھتے تھے۔
- یہ ان خاصانِ خاص میں سے تھے۔ جن کا ذکر دنیائے اسلام کے مقتدر حکمرانوں کے ایوانوں میں مدتوں رہا۔
- یہ ان مقبولان خدا میں سے تھے۔ جنہیں عوام و خواص، دونوں میں محبوبیت و مقبولیت حاصل تھی۔
- یہ ان غازیانِ پاک و ہند میں سے تھے۔ جن کی ایک للکار سے قصرِ استعمار کی بنیادیں ہل جاتی تھیں۔
- یہ ان آتش بیان خطیبوں میں سے تھے۔ جو جمود و سکون کے عالم میں ہیجان و اضطراب پیدا کر دیتے تھے۔
- یہ ان شہرہ آفاق ادیبوں میں سے تھے۔ جن کا قلم بقول علامہ اقبالؒ مصطفےٰ کمال کی تلوار بن گیا تھا۔
- یہ ان قومی شاعروں میں سے تھے۔ جن کے اشعار دشمنانِ ملک و ملت کے لئے

ذوالفقار بن جاتے تھے۔

- یہ ان مخلص رہنماؤں میں سے تھے۔ جو خود ایک ہنگامہ تھے اور دیکھتے دیکھتے پرسکون ماحول میں ہنگامہ پیدا کر دیتے تھے۔
- یہ علی گڑھ کے ان ناموروں میں سے تھے۔ جنھوں نے آسمانِ شہرت پر مہر و ماہ بن کر دنیا کو حریتِ فکر اور آزادیِ رائے کا سبق دیا تھا۔
- یہ آزادیِ ہند کے ان قافلہ سالاروں میں سے تھے۔ جنکی قربانی ہمیں ایک اسلامی سلطنت کے مالک و محافظ بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔

ابتدائی دور

مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال سے پانچ سال قبل ۱۸۷۳ء میں، ان کے مولد سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر سیّد محمود۔ مولانا ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا عبدالحلیم شرر۔ ڈاکٹر سیّد حسن بلگرامی۔ نواب عماد الملک۔ نواب وقار الملک۔ نواب مرزا خان داغ دہلوی۔ مولوی محفوظ علی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صحبت پائی۔ ابتدا" آپ نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ وہاں سے حیدر آباد دکن کے دار الترجمہ پہنچے اور ترقی کرتے کرتے اس کے اسسٹنٹ رجسٹرار ہوئے۔ وہاں سے میر عثمان علی خان کے اتالیق بنے۔ پھر ہوم سیکرٹری کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ لیکن اس آزاد مرد کو یہ ملازمتیں اور یہ نوکریاں راس نہ آئیں اور آپ نے واپس وطن کی راہ لی۔

گھر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد ماجد منشی سراج دین احمد نے وزیر آباد سے ہفت روزہ " زمیندار" نکال رکھا ہے۔ آپ نے اس کی ادارت کے فرائض سنبھال لئے اور اسے وزیر آباد سے لاہور لے آئے۔ جہاں جنگِ طرابلس و بلقان کی خبروں نے اسے ہفت روزہ سے روزنامہ بنا دیا اور بہت جلد یہ اخبار میدانِ صحافت پر چھا گیا۔

مولانا ظفر علی خان کی منظومات۔ مقالات اور فکاہات نے "زمیندار" کو اچھالا۔ اور "زمیندار" نے مولانا ظفر علی خان کو بامِ شہرت پر پہنچایا۔

دورِ ادبار

زمیندار کی زمین بڑی زرخیز تھی۔ جس نے بھی اس وادی میں قدم رکھا۔ وہی کامیاب و کامران نکلا۔ عبداللہ العمادی۔ وحیدالدین سلیم پانی پتی نیاز فتح پوری۔ غلام رسول مہر۔ عبدالمجید سالک۔ مرتضےٰ احمد خان میکش۔ چراغ حسن حسرت حسین میر کاشمیری۔ ابوالعلا چشتی معروف حاجی لق لق۔ نصراللہ خان عزیز اور محمد اشرف عطا، سب اسی ارضِ علم و ادب کی پیداوار ہیں۔ ان میں سے اکثر نے وہاں سے نکل کر منفرداً یا مشترکاً "زمیندار" کے مقابلہ میں اپنی اپنی دکان لگائی۔ کہیں "انقلاب" آیا کہیں "آزاد" نکلا۔ کہیں "شہباز" اڑا۔ کہیں "احسان" ہوا۔ غرضیکہ وقتاً فوقتاً کئی اخبار "زمیندار" کے مقابلہ میں نکلتے رہے اور مات کھاتے رہے۔ مگر مولانا ظفر علی خان کا اشہبِ قلم میدانِ صحافت میں یکہ و تنہا، ان سب کا مقابلہ کرتا رہا اور میدان جیتتا رہا۔ جیسا کہ مولانا نے خود لکھا ہے کہ ؎

"زمیندار" ایک، آپ اتنے، مگر اوجِ صحافت پر
یہ اک کنکّل لڑے گا۔ آپ کی ساری پتنگوں سے

غرضیکہ جسے بھی ان کے خوانِ ادب سے ریزہ چینی کا موقع ملا۔ وہی صاحبِ سخن بن بیٹھا۔ اسی لئے مولانا نے کہا تھا ؎

ادب کا ذوق ہے جن کو مرے اشعار سن کر
سخنور بنتے جاتے ہیں۔ سخنداں ہوتے جاتے ہیں

اکرام قمر لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا ظفر علی خان جس دور میں پیدا ہوئے۔ وہ اس برِصغیر میں ایک مہیب ذلت و ادبار کا دَور تھا۔ فرنگی اقتدار اپنی پوری قہرمانیوں کے ساتھ پورے

عروج پر تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں اس کے پنجے آگے بڑھ رہے تھے اور اپنی گرفت کو مضبوط کر رہے تھے۔ برعظیم کا ہر تعلیم یافتہ فرد اِلاّ ماشاء اللہ غیر ملکی اقتدار سے لازوال وابستگی کو سُرخروئی کا سامان سمجھتا تھا۔ مغربی تہذیب موج در موج اس خطۂ ارضی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سیاسی محکومیت کے ساتھ ساتھ ذہنی مرعوبیت بھی آگئی تھی"۔

(نوائے وقت ۲۵ نومبر ۱۹۶۴ء)

مولانا ظفر علی خان ان ناموافق حالات اور ناموزوں فضا میں دندناتے ہوئے میدانِ عمل میں نکلے۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں جبکہ بقول اکرام قمر:۔

"ذہنوں پر غیر ملکی مرعوبیت بڑی سرعت سے طاری ہو رہی تھی اور اسکی پشت پر غیر ملکی اقتدار کی سب قوتیں اور انعامات کارفرما تھے۔ اس دور میں غیر ملکی تہذیب کو روکنا۔ اور للکارنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی تہذیبِ مغربی کے منہ پر تھپڑ بھی رسید کیا اور اسے حرام زادی بھی کہا۔ اگر ظفر علی خان اور ان کے ہمعصر ہم نوا، عوام میں تہذیب مغربی سے نفرت پیدا نہ کرتے تو پاکستان کی تحریک کے لئے زمین ہی ہموار نہ ہو پاتی۔ ان راہنماؤں نے ایسا ذہن تیار کیا۔ جس نے پاکستان کا تصوّر نہایت آسانی کے ساتھ قبول کر لیا"۔

(بحوالہ صدر)

سیاسی اکھاڑے

تحریکِ خلافت کے آغاز سے لیکر مقامِ پاکستان تک کانگرس۔ احرار۔ نیشنلسٹ۔ نیلی پوش۔ خاکسار۔ اتحادِ ملّت۔ اور مسلم لیگ وغیرہ جتنی بھی جماعتیں میدانِ عمل میں آئیں۔ مولانا ان سب میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے اپنے سفینہ اور سفینہ دونوں سے ہر ایک کی مدد کی۔ ان کے ہنگامی دور کی تحریروں

اور تقریروں کا جائزہ لینے سے بآسانی پتہ چلتا ہے کہ وہ تقریباً ہر تحریک کے روحِ رواں رہے۔ مگر کہیں استقلال کے ساتھ ٹھہر نہ سکے۔

اس مرحلہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی بات تھی۔ جس کی وجہ سے مولانا ظفر علی خان ایسا مخلص رہنما اور نڈر سیاست دان ان معرکوں سے کنارہ کش ہو جاتا تھا؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ ان، سیاسی اکھاڑوں میں بعض ایسی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ جو توحید پرستی اور رسول دوستی کے منافی ہوتی ہیں، اور ان کی وجہ سے بعض حساس مسلمان ان سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خان جسے حق پر پاتے۔ اس پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے اور اس کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ لیکن اگر کسی سے کوئی ناحق بات سرزد ہو جاتی تو ع

چل مرے خامہ بسم اللہ

کہہ کر اس کے پیچھے رہوارِ قلم دوڑاتے۔ اسے دستارِ فضیلت سے پکڑ کر چاروں شانے چت گراتے اور یہ قطعاً نہ دیکھتے کہ وہ مسٹر گاندھی ہیں یا جواہر لعل نہرو۔ ابوالکلام آزاد ہیں یا مولانا محمد علی جوہر۔ علامہ اقبال ہیں یا قائدِ اعظم! ان کی شان ہیں، مولانا کے کلام میں جہاں مدحیہ اشعار کی کمی نہیں۔ وہاں ہجویہ اشعار بھی موجود ہیں۔ ان کے حق کوش قلم نے اس معاملہ میں نہ عمر بھر کے دوستوں کو معاف کیا۔ نہ رفیقوں کو۔ نہ تخت نشینوں کو چھوڑا۔ نہ گوشہ نشینوں کو۔ نہ کسی فرد کی رعایت کی۔ نہ کسی جماعت کی۔ نہ اپنوں کی کاسہ لیسی کو برداشت کیا۔ نہ غیروں کی ڈپلومیسی کو۔ نہ مہاشوں کے بنیا پن کو بخشا۔ نہ قادیانیوں کی نبوت سازی کو۔ یہاں تک کہ اگر لالے (ہندو) زیرِ قلم آئے۔ تو للائنوں کو بھی نہ چھوڑا ؎

پوچھا جو میں نے لالہ! للائن کہاں گئی   نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی چو گئی

میں نے دیا جواب، انہیں ازراہِ مذاق   کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چڑ گئی

شہنشاہِ قافیہ اگرچہ بسا اوقات ان کی نثری اور شعری طنز و مزاح میں بشری کمزوریوں کے باعث ذاتیات کا رنگ غالب آجاتا تھا۔ لیکن اکثر و بیشتر ان کی طعن و تضحیک سیاسی حادثات کا نتیجہ ہوتی تھی۔

مولانا کا اندازِ بیان و کلام بھی جداگانہ تھا۔ ان کا لب و لہجہ شگفتہ۔ تیز اور شاہانہ تھا۔ زبان بڑی پاکیزہ۔ محاورات بکثرت۔ مگر صحیح استعمال۔ الفاظ اکثر نئے۔ بندش بالکل اچھوتی۔ قافیئے قطعاً انوکھے۔ طبیعت میں ہر وقت آمد۔ حقہ کے ہر کش پر ایک شعر کہتے۔ زمین خواہ کتنی ہی سنگلاخ اور بنجر کیوں نہ ہو۔ مگر دماغ اتنا زرخیز اور قدرت بیان اتنی غیر معمولی تھی کہ اس شہنشاہِ قافیہ کے سامنے مشکل سے مشکل زمین بھی ہموار ہوتی چلی جاتی تھی۔ اوزان و بحور کے میدان میں آج تک کوئی شاعر ان سے بازی نہیں لے جا سکا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ :-

"اس مزاج و انداز کا قادر الکلام اردو شاعر اور نثر نگار، اس صدی میں اب تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کی پیروی کرنے والے چالیس پچاس سال میں جس کثرت سے پنجاب میں پیدا ہوئے اور ان پر جتنی گہری چھاپ ظفر علی خان کے لب و لہجہ اور تیور اور تحریر کی ملتی ہے۔ ہندوستان کی شاید ہی کسی اور زبان کی صحافت یا صحافیوں کے ہاں مل سکے۔ مغربی پاکستان سے بالعموم اور مشرقی پاکستان سے بالخصوص اردو کے جتنے اخبار شائع ہوتے ہیں۔ ان سب کے معتبر و مستند لکھنے والے اسی قبیلۂ جنوں سے تعلق رکھتے ہیں"۔ (بحوالہ صدر)

بہترین مترجم مولانا ترجمہ کرنے میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ ترکیبوں۔ سائنسی لفظوں اور اصطلاحوں کو اتنی خوبی سے اردو

کا جامہ پہناتے تھے کہ ان پر ترجمہ کا گمان تک نہ ہوتا تھا۔ مترجم کی حیثیت سے آپ کی شہرت کا آغاز، "سیرِ ظلمات"۔ "فسانہ لندن"۔ "سنہری گھونگا" اور لارڈ کرزن کی تالیف "خیابانِ فارسی" کے اردو ترجمہ سے ہوئی۔ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی مشہور کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" کے ترجمہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی درخواست پر علامہ اقبال نے انگریزی میں ایک لیکچر دیا تھا۔ جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے اپنے ماہنامہ "پنجاب ریویو" میں شائع کیا۔ جو ان کے تراجم کا شاہکار ہے۔ اسے شروع سے آخیر تک پڑھ ڈالیں۔ آپ کو کسی مقام یا کسی مرحلہ پر بھی خیال نہ گزرے گا کہ یہ ترجمہ ہے۔ بلکہ آپ اسے بالیقین اصل لیکچر سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ ایک ٹکڑہ ملاحظہ ہو۔

> "انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو لوٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقار کی الم ریز جھلملیوں سے چھنتی ہوئی، ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے۔ تو کسی خواب کے گریز پا نظاروں کی طرح ہم گزری ہوئی قوموں سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈروں کو پے بہ پے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں۔ جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوت کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے! نہ اقوام کی منزلت!! اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزلِ مقصود بہت ہی دور ہے۔ جسے مقاصدِ انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں"۔

اس ایک ٹکڑہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کہ وہ اپنے اندر صحیح ترجمانی کی کتنی قدرت رکھتے تھے۔

قومی شاعر جنگِ آزادی کے ساتھ ساتھ قومی شاعری کا بھی آغاز ہوا۔ "قومی شاعری کے سَو سال" میں ان کو چھ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک، ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک، ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۱ء تک۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک۔ یہ گویا جنگِ آزادی کی چھ منزلیں ہیں۔ جن سے ہم گزر کر اس مقام تک پہنچے ہیں۔ ان ادوار کے قومی شاعروں کی طویل فہرست پر نظر دوڑانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اگرچہ مولانا ظفر علی خان سے بعد میں آئے لیکن قومی شاعری کے میدان میں انہوں نے ان سے پہلے قدم رکھا۔ ترانۂ ہندی۔ ہندوستانی بچوں کا گیت۔ اور نیا شوالہ، علامہ اقبال کی پہلے دور کی تخلیق ہیں۔ مولانا ظفر علی خان دوسرے دور میں یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء میں قومی شاعری کے میدان میں نمودار ہوئے۔ اس دَور کی آپ کی چار نظمیں "مارشل لا"، "فریادِ جرس"، "فانوسِ ہند کا شعلہ" اور "ہندوستان" مشہور ہیں۔ لیکن قومی شاعروں کی طویل فہرست میں مولانا ظفر علی خان اس لحاظ سے سرِ فہرست ہیں کہ:۔

(۱) انہوں نے حق گوئی وحق کوشی کی پاداش میں سب سے زیادہ قید کاٹی۔ جس کا مجموعہ بارہ سال ہوتا ہے۔

(۲) ڈیڑھ لاکھ روپیہ سے زائد جرمانہ ادا کیا۔

(۳) ان کا مؤقر جریدہ "زمیندار" قریباً پندرہ دفعہ بحکم سرکار ضبط ہوا۔

(۴) ان کی دو سَو کے قریب نظمیں ضبط ہوئیں۔ جو ان کے مطبوعہ مجموعہ بہارستان۔ چمنستان۔ نگارستان۔ حبسیات اور ارمغان قادیان میں موجود ہیں۔ اسکے علاوہ

(۵) ان کے کئی پریس ضبط ہوئے۔ مگر دنیا کی کوئی طاقت انہیں حق گوئی سے باز نہ رکھ سکی۔

ضبطی کا دَور آپ جب بھی کوئی سیاسی نظم کہتے۔ ایوانِ حکومت میں زلزلہ آجاتا۔ دہلی کے وائسرائیگل لاج سے لیکر لندن کی ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ

تک کے ارباب اقتدار تھرا اٹھتے۔ آپ کا ایک ایک شعر قصرِ افرنگ کیلئے ایٹم بم ثابت ہوتا۔ مولانا کے صرف اس شعر سے ؎

چار چیز است تحفۂ لندن
خمر و خنزیر و روزنامہ وزن

لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر دماغی توازن کھو بیٹھا اور اس نے ”زمیندار“ کا دس ہزار روپیہ زرِ ضمانت بمعہ پریس ضبط کر لیا۔ یکے بعد دیگرے ضبطیوں۔ قرقیوں کی کچھ ایسی آندھی چلی کہ مولانا کو نومبر ۲۷ء میں فی البدیہہ کہنا پڑا ؎

دل ضبط، زبان ضبط۔ فغاں ضبط۔ قلم ضبط
دنیا میں ہوئے، ہوں گے۔ یہ سامان کہیں ضبط
برطانیہ کا شیوہ رہا، گر یہی۔ کچھ روز ؁
سن لو گے۔ عزیزو کہ ہوئے دیر و حرم ضبط

ضبطیوں کا یہ طوفان جب ۱۹۳۲ء تک نہ تھما تو آپ نے پھر یہ نظم لکھ ماری:۔

دل ضبط۔ جگر ضبط۔ زباں ضبط۔ فغاں ضبط
سب سازِ عیاں ضبط۔ سب سوزِ نہاں ضبط

مظلوم کو فریاد بھی کرنے نہیں دیتے ؁
ڈر ہے کہ نہ ہو جائے یہ سب امن و اماں ضبط

اٹھتی ہے جو سینہ سے۔ تو ہو جاتی ہے ضبط آہ
آئے جو دہن پر۔ وہیں ہوتا ہے گماں ضبط

روکیں وہ کیوں کہ مرے مضمون کی روانی
تنکے سے بھی ہوتا ہے۔ کہیں سیلِ رواں ضبط

وہ ضبط کریں میری دوات اور قلم کو
ہو جائیں گے خود ان کے تفنگ اور سناں ضبط

تم ضبط "زمیندار" کے نمبر نہیں کرتے
کرتے ہو حقیقت میں محمدؐ کا نشاں ضبط

بس اسکا چھپنا تھا کہ نظم بھی ضبط اور پریس بھی ضبط۔

عاشق رسول مقبولؐ

مولانا عقیدۃً اہل حدیث تھے۔ یعنی عرفِ عام میں "وہابی" انبیاء و اولیاء کے معاملہ میں اس طبقہ کی تنگ نظری مشہور ہے۔ لیکن مولانا اس معاملہ میں بڑے باادب اور وسیع القلب تھے۔ سیاسی لیڈروں کی طرح ان کا قال حال سے مختلف نہیں تھا۔ بلکہ ان کا حال و قال ہمیشہ یکساں رہا۔ جس کا ان کے نعتیہ کلام سے پتہ چلتا ہے۔ ان کے سوز و گداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جسم تو یہاں رہتا تھا۔ مگر ان کی روح سرکارِ مدینہ کے دربار کی دربانی کرتی تھی۔ وہ جب بھی اسلام یا مسلمان پر ذرا بھی آنچ آتی دیکھتے۔ فوراً دربارِ رسول میں دہائی دیتے ؎

تمہارا قافلہ کچھ لٹ چکا ہے اور کچھ ہے لٹنے کو
رسول اللہؐ کو اس کی خبر بادِ صبا کر دے

کبھی ان سے یوں خطاب کرتے کہ ؎

تم بھی اگر مدینہ میں ہم کو اماں نہ دو
پھر یا نبیؐ۔ بتاؤ کہ ہم رُخ کدھر کریں

ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ ع

بن جائیں خاکِ پاک حریمِ رسولؐ کی

اور اکثر یہ دُعا کرتے تھے کہ ع

مری پلکوں کو جاروبِ حریمِ مصطفےٰ کر دے

نورِ فراست

یہ محبوبِ خدا کی محبت کی برکت تھی کہ حق تعالےٰ نے مولانا کو نورِ فراست سے بھی نوازا تھا۔ جو ایک مومن کی میراث ہے۔ اور جس

کی وجہ سے وہ گاہے گاہے حال میں مستقبل کا نقشہ بھی کھینچ دیتے تھے۔ فروری ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس برہانپور کے خطبۂ صدارت میں عالمی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ہمارے وزراء کچھ دودھ پیتے بچے نہیں۔ بڑے زیرک۔ بڑے فطین اور بڑے دقیقہ سنج ہیں۔ کیا انہیں اس نئی قوت کا علم نہیں۔ جو کردستان اور آذربائیجان۔ اناطولیہ اور قفقاز میں نشوونما پا رہی ہے۔ کیا وہ بالشویکوں کے روز افزوں اقتدار، ان کی فاتحانہ پیش قدمی اور ان کی عالم سوز نیتوں سے ناواقف ہیں۔ کیا انہیں ترکستان کے نئے جذبۂ ملت پرستی کا علم نہیں۔ کیا وہ افغانستان کی نوزائیدہ سیاسی تمناؤں سے بے خبر ہیں"۔

اس ٹکڑہ تقریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے روس کے آمروں کے عزائم اور افغانستان کے وزیرِ اعظم سردار محمد داؤد خان کا کردار اس وقت ان کے عین سامنے تھا۔ جو پختونستان کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح نئی تہذیب و تمدن کے متعلق انہوں نے جس نظریہ کا اعلان آج سے چوّن سال قبل کیا۔ وہ آج بھی حقیقت کا درجہ رکھتا ہے کہ:۔

"مسلمانوں کو اس تمدن کے ساتھ ہرگز کوئی وابستگی نہیں ہو سکتی۔ جس نے بجلی اور بھاپ۔ شراب اور کباب۔ سنگین اور توپ ہی کو معیارِ ارتقاء قرار دے رکھا ہے"۔

مولانا کی ساری زندگی مسلمانوں کو صرف ایک نکتہ سمجھانے میں گزر گئی کہ ؎

جبتک رہے تم دستِ نگر اپنے خدا کے ۔۔۔ ہونے نہ دیا اس نے تمہیں غیر کا محتاج
جو ہو گئے اس کے۔ وہ ہوا ان کا نگہبان ۔۔۔ اس کی ہے جنھیں شرم۔ انکی بھی اسے لاج

دادِ دشمن

کہتے ہیں جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے۔ پنجاب کا خونخوار گورنر سر مائیکل اڈوائر جس نے جلیانوالہ باغ میں گولی چلوا کر سینکڑوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ لیکن جو ضبطیوں۔ قرقیوں اور نظر بندیوں کے باوجود مولانا کی آوازِ حق

کو نہ دبا سکا۔ آپ کے متعلق ایک رپورٹ میں لکھتا ہے کہ:۔

"ظفر علی خان اور مولانا محمد علی (جوہر) ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لیکر نکلے ہیں۔ انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ کوئی عام منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا لازمی ہے۔"

سرکاری طور پر اپنے ماتحت حکام کے نام یہ ہدایت جاری کرنے کے علاوہ سر مائیکل اڈوائر نے مولانا کا جو "ہسٹری شیٹ" تیار کیا۔ جیسے ہر لیڈر کا ہر زمانہ میں تیار کیا جاتا رہا ہے اور اب تک تیار کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں:۔

"پین اسلام ازم پر اعتقاد رکھنے والے طبقہ کا ترجمان، ایک آتش بار اخبار زمیندار ہے۔ جس کا ایڈیٹر ایک آتش مزاج رسوائے عالم ظفر علی خان تھا۔ اس نے ۱۹۱۲ء میں ترکوں کے لئے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا یہ رقم پیش کرنے کے لئے خود قسطنطنیہ گیا۔ ترکی سے واپسی کے بعد اسکا انداز بیان اور سخت ہو گیا۔ کئی بار پریس ایکٹ کے تحت اسکی ضمانت ضبط کی گئی۔ متعدد بار تنبیہہ سے کام لیا گیا۔ مگر زمیندار پھر نکلا۔ اندازِ بیان پہلے سے زیادہ شوخ اور باغیانہ تھا۔ اسی لئے اس بنا پر اس کی ضمانت کے ساتھ پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ اس نے اسلامی اتحاد کے علمبردار طبقہ سے عرب۔ ترکی۔ جرمنی اور افغانستان کے ساتھ سازشیں جاری رکھیں اور مسلمانوں میں بغاوت پھیلانے اور فوجوں میں غدر کرانے کی کوشش کی۔ جب تمام منصوبے ناکام ہو گئے۔ تو ہندوؤں کے ساتھ مل کر برطانوی اقتدار کو زک پہنچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں پنجاب اور ۱۹۲۱ء میں موپلوں کی بغاوت اس کی کوششوں کے مظاہرے تھے۔ جنگ کے دنوں میں ظفر علی خان کو اس کے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ مگر نظر بندی سے رہائی پاتے ہی

اس نے پھر پرانی روش اختیار کرلی۔ ۱۹۲۰ء میں اسے بغاوت کے الزام میں پانچ سال قید کی سزا دی گئی"۔

(علی گڑھ کے تین نامور فرزند)

جس پر مولانا ظفر علی خان نے کہا افسوس کہ یہ ستمگر ایک بات بھول گیا ؎

نہ کی روزی قرق اس نے میری سرکشی پر بھی
خداوندانِ لندن سے میرا پروردگار اچھا

اس ضمن میں دوسرا شعر ؎

کاش دیتے وہ سزا مجھ کو باندازۂ جرم
جسم سے قطع نہ کیوں روح کا پیوند کیا

آپنے اپنی استعمار کش روش نہ بدلنے کی وجہ بھی بتلادی کہ ؎

نہ یزید کا وہ ستم رہا۔ نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

یہ مردِ حق نہ صرف انگریز کا انجام دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اسے اپنا بھی مقام صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ؎

کٹایا جس نے راہِ حق میں سر، جنت میں جا پہنچا
بشارت یہ سنی میں نے، بزرگوں کی زبانی ہے
روایاتِ سلف کو زندہ رکھنا اس زمانے میں
نشانِ کامگاری ہے۔ دلیلِ کامرانی ہے

طبعی تقاضے

ملک میں جن دنوں سیاسی طوفان آیا ہوا تھا۔ اور بڑے بڑے علماء فضلاء۔ سخندان و سخنور کانگرسی سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے جارہے تھے۔ اور اسلام سے دور ہوتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر سیف الدین

کچلو اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم کانگرس کے عشق میں یہ نعرے لگا رہے تھے کہ:-

"ہم پہلے کانگرسی ہیں اور پھر مسلمان"

تو مولانا ظفر علی خان نے فوراً یہ نعرہ بلند کیا کہ:-

"میں سب سے پہلے مسلمان ہوں اور پھر کچھ اور!"

یہ تھی قوتِ ایمانی کہ جوش کے عالم میں بھی ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ مولانا کی اسلام دوستی اور انگریز دشمنی کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا۔ جس دن آپ نے میدانِ صحافت و سیاست میں قدم رکھا تھا۔ چونکہ آپ انگریز کو اسلام کا ازلی دشمن سمجھتے تھے۔ اس لئے آپ اس کے ناپاک قدوم سے اپنے وطن کی سرزمین کو پاک کرنے کے لئے روزِ اوّل سے اس کے خلاف صف آرا تھے۔ انکے دم قدم نے۔ ان کے لوح و قلم نے پاکستان کی تعمیر کے لئے جتنا کام کیا۔ اس کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے۔ سرسید احمد خان نے اپنی فکر و بصیرت سے مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدہ ہونے کا جو مشورہ دیا تھا۔ وہ علی گڑھ کے اس فرزند نے بھی قبول کیا۔ قائدِ اعظم اور مولانا محمد علی جوہر کی طرح آپ نے بھی کانگرس سے علیحدگی اختیار کی۔ مگر جتنا عرصہ کانگرس کے ساتھ رہے۔ اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ کیونکہ یہ آپ کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جس تحریک میں شامل ہوتے! اسکا پورا پورا ساتھ دیتے۔ مسلم لیگ کے بھی آپ بہت کام آئے۔ طبعاً چونکہ انتہا پسند تھے۔ اس لئے کئی بار ان سے قائداعظم اور مولانا حسرت موہانی کا اختلاف پیدا ہوا۔ مگر اس کے باوجود قائدِ اعظم آپ کا احترام کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کی وطن دوستی اور انگریز دشمنی شک و شبہ سے بالا تھی اور آپ راہِ حق میں گھر بار لٹانے اور سر کٹانے کے لئے سب سے پیش پیش رہتے تھے اور ہر وقت یہ دہائی دیتے رہتے تھے ؎

تجھے کیا بتاؤں ہم نشین مرے غم کا قصہ طویل ہے ۔۔۔ میرے گھر کی لٹ گئی آبرو ہوا جب سے غیر دخیل ہے

پیشین گوئیاں

مولانا ظفر علی خان کی نظر بڑی دور رس تھی۔ آپ کو حکومت برطانیہ کا انجام صاف نظر آتا تھا کہ جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اب خود اس کے اقتدار کا سورج ڈوبنے والا ہے۔ اور متحدہ ہندوستان کی سونے کی چڑیا اب اس کے پنجہ سے چھٹکارا حاصل کرنے والی ہے۔ جس کا آپ نے اپنے متعدد اشعار میں برملا اظہار کیا مثلاً :-

زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہے جن کو ٹکرانا " "
مکافاتِ عمل سے گر یہ غافل ہیں تو بیشک ہوں
ہمارا کام ہے۔ نیک اور بد کا ان کو سمجھانا "

جب گوجرانوالہ سیتہ گرہ کانفرنس میں تقریر کرنے کی پاداش میں آپ کو دو سال کی قید بامشقت دی گئی تو آپ نے برطانوی عدالت کے سامنے برطانوی ملوکیت کے متعلق یوں پیشین گوئی کی :-

قسم ہے جذبۂ حبِ وطن کی بے پناہی کی — ہمارا ملک غیروں کا غلام اب رہ نہیں سکتا
ہمیں زنداں میں بھجواؤ یا تم پھانسی پہ لٹکاؤ — مگر قائم تمہارا یہ نظام اب رہ نہیں سکتا
ہم اپنے عزم کے سانچے میں تقدیروں کو ڈھالیں گے — مسلط گردنِ مشرق پہ ٹام اب رہ نہیں سکتا
پشاور کی شہادت گاہ سے پیغام آیا ہے — کہ بن جھکے مسلمانوں کا نام اب رہ نہیں سکتا

چنانچہ اب خدا کے فضل سے مسلمانوں کا ستارہ پھر بام عروج پر پہنچا چاہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مغربی دنیا لرزہ براندام ہو رہی ہے۔ اور وسیع برطانوی سلطنت سمٹ کر اب صرف جزیرہ برطانیہ تک محدود رہ گئی ہے۔ اہلِ نظر نے تو اس انجام کا اسی دن اندازہ لگا لیا تھا جب ۱۹۱۲ء میں جارج پنجم شہنشاہ ہند کی آمد کے موقعہ پر دربار منعقد ہوا۔ جس میں بحیثیت ایک صحافی کے مولانا ظفر علی خان بھی مدعو اور موجود تھے تو عین نماز عصر کے قریب جب

شہنشاہ معظم کی سواری کے آنے کا وقت تھا۔ آپ نے وہاں اذان دے کر اس کی انتظار کرنے والوں کو فرمایا :-

"بادشاہ مجازی کے ماننے والو۔ شہنشاہِ حقیقی کے دربار میں بھی سر جھکاؤ"۔

جسے سرکاری درباری لوگوں نے اچھا شگون نہ سمجھا۔ اس کے بعد جب شہنشاہِ ہفتم کی موت پر علماء سولاہور کی شاہی مسجد میں اس کی دعائے مغفرت کے لئے جمع ہوئے تو مولانا ظفر علی خان بھی عین وقتِ دُعا پر مسجد میں پہنچ گئے اور اعلان کر دیا کہ عیسائی کے لئے اسلام میں دعائے مغفرت جائز نہیں۔ اس کا بھی یار لوگوں نے برا شگون لیا جو بالآخر سچ نکلا اور عظیم سلطنت سکڑ کر ایک گوشہ میں محدود ہو گئی۔

جداگانہ تنظیم

مولانا ظفر علی خان ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ بایں ہمہ ہندو پریس جس نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا رکھا تھا اور خواہی نخواہی مسلم زعماء پر تعصب کا بہتان تراشنے سے باز نہ آتا تھا۔ مولانا کو متعصب قرار دیتا رہا۔ اس معاملہ میں ہندو اخبارات پرتاپ۔ ملاپ۔ تیج۔ وِیر بھارت مولانا کے خلاف زہر اگلنے میں پیش پیش تھے۔ اور انہوں نے ہی پنجاب کی فضاء کو مکدر کیا اور اس کے امن میں آگ لگائی اور جب پورا ملک فرقہ پرستی کی آگ میں جل رہا تھا تو اس وقت مولانا ظفر علی خان نے امرتسر میں خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ہندوؤں کی اس سازش کا یوں پول کھولا :-

"یہ اشتعال انگیزیاں ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم کے لئے شروع کی گئی ہیں۔ جداگانہ تنظیم ہی مسلمانوں پر بے اعتمادی کا قطعی ثبوت ہے۔ لوگوں کے جذبات قومی تحریک نے خاصے مشتعل کر رکھے تھے۔ سول نافرمانی کے التواء اور گاندھی جی کی قید کے باعث قومی تحریک کا کام رک گیا ہے۔ برانگیختہ جذبات کسی نئے راستے کے لئے مضطرب تھے۔ جن میں ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم

کا غلغلہ بلند ہوا ۔ ہندو نہایت آسانی سے اس کی رو میں بہہ نکلے اور ہندوؤں کے تفرد و تجرد اور انقطاع و علیحدگی کی یہ تحریک خاص تیزی سے ترقی کرنے لگی ۔ چونکہ اس کی بنیاد ہی مسلمانوں کے خلاف تعصب و عناد کے جذبات پر موقوف تھی ۔ اس لئے اس کی ترقی کے ساتھ ہی ہندو مسلم تصادم کے اسباب بڑھنے لگے ۔ آج ہم ایک ملتان کا نہیں بلکہ بیسیوں ملتانوں کا ماتم کر رہے ہیں "۔ (بحوالہ صدر)

ہندوؤں کی یہی جداگانہ تنظیم تقسیم کا باعث بنی ۔ ہندو کی ہر ٹھوکر مسلمان کو خوابِ غفلت سے جگاتی رہی اور جب اس نے ایک انگڑائی لی تو سردار پٹیل نے پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کی جھولی ڈال کر اطمینان کا سانس لیا ۔

اسلامی بازار

اس جداگانہ تنظیم کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا ظفر علی خاں نے اس بنیا ذہنیت سے تنگ آکر اسلامی بازار کی تحریک شروع کر دی ۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت مضبوط کرنے کے لئے انہیں تجارت کی طرف راغب کرنے لگے ۔ اور تحریر و تقریر میں مسلمانوں کو اس امر کی تلقین اور ترغیب دینے لگے کہ مسلمان مسلمان سے سودا خریدیں اور ہندو سے نہ خریدیں ۔ اس غرض کے لئے آپ نے لاہور میں دہلی دروازہ کے پاس اسلامی بازار بھی لگوا دیا ۔ جس سے مسلمانوں میں تجارت کا شوق بڑھا اور وہ ہندوؤں کی اقتصادی گرفت سے نجات پانے لگے ۔ اس تحریک کی وجہ سے ہندو آپ کے جانی دشمن بن گئے ۔ مگر آپ کا کچھ بگاڑ نہ سکے ۔ البتہ ہندوؤں کی روز افزوں اسلام دشمنی کی بدولت "زمیندار" کی اشاعت بیس ہزار سے تجاوز کر گئی ۔ اسلامی بازار تحریک کی وجہ سے اب اسے ہر مسلمان دکان دار خریدتا ۔ ہر بازار میں زمیندار ہی زمیندار نظر آتا اور اگلی صبح کے زمیندار کا بڑی بے تابی سے انتظار کیا جاتا ۔ علاوہ ازیں سستا ہونے کی وجہ سے بھی اسے ہر وہ شخص خریدتا ۔ جو ذرا پڑھ لکھ لیتا ۔ اسطرح یہ اخبار مسلم لیگ

کا پیغام عوام و خواص تک پہنچانے میں بڑا معاون و مددگار ثابت ہوا۔

مجاہدین کی تلوار

مولانا ظفر علی خان کے دیرینہ رفیق کار اور نامور اہلِ قلم مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:-

"مولانا ظفر علی خان اپنے رفیقوں کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی میں فرد فرید تھے۔ اس بارے میں سوائے مولانا شوکت علی مرحوم کے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مولانا اپنے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ رفیق کی سبکی گوارا نہ کرتے تھے۔ سب سے محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے رہے۔ ان کی اپنی زندگی نہایت سادہ اور بے تکلف تھی۔ کھانا پینا بھی سادہ، لباس بھی سادہ، بود و باش بھی سادہ۔ ابتدا ہی تڑکے اٹھنے کے عادی تھے۔ جب تک جسم مساعد رہا۔ سیر نہ چھوڑی بہت تیز چلتے اور لمبی سیر کرتے۔ تنہا ہوتے۔ تو قرآن مجید پڑھتے۔ اپنی ذات پر کبھی خرچ نہ کیا۔ روپے پیسے ہوتے تو دوسروں پر خرچ کر دیتے۔"

علامہ ڈاکٹر اقبال نے فرمایا:-

"ظفر علی خان غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ ان کی ہمت بہت بلند ہے۔ ان کا قلم اپنی روانی میں دنیا کے بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں۔ مذہبی۔ ادبی۔ سیاسی لحاظ سے انہوں نے بہت خدمت کی ہے۔ نثر میں مولانا نے جس سلاست نگاری کی پیروی کی۔ اس کی بنیاد اردو ادب میں سرسید نے رکھی۔ سرسید کا اصلاحی رنگ و روپ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان میں ملتا ہے۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خان نے جب قدم رکھا تو یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ظفر علی خان۔ آزاد اور جوہر کے انداز

میں یہ فرق ہے کہ ظفر علی خان نے قدیم و جدید ادبی وجاہت اور مذہب و سیاست کی وحدت سے براہِ راست عام مسلمانوں کو خطاب کیا۔ (مولانا) آزاد ایک داعی کے لہجہ میں اٹھے۔ اور محمد علی جوہر ایک انگریزی جریدہ نگار کی طرح دل میں اتر گئے۔ اسی لئے مولانا ظفر علی خان ہیرو بنے رہے۔"



(۹)

مولانا محمد علی جوہر

آغازِ زندگی

نامور رہنما۔ افسانہ نگار۔ شاعر۔ صحافی۔ مقرر۔ مورخ۔ انشاپرداز رئیس الاحرار بین الاقوامی شہرت کے مالک مولانا محمد علی جوہر ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ مطابق ۲۶ر نومبر ۱۸۷۸ء کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید پڑھنے سے آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ خود ہی بین السطور اردو ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کی۔ بعدازاں بریلی اور علی گڑھ کے مدرسوں میں تعلیم پائی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے گریجویٹ بنے۔ وہاں آپکی کیسے گزری۔ اس کی نشاندہی انہوں نے خود اپنے ایک خط میں یوں کی۔ جو آپ نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کو لکھا تھا:۔

"کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہیں تھی مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی۔ تاہم طبیعت کا میلان، خلافِ دستورِ عام زہد و تورع کی طرف تھا"

ریاست رامپور میں ہندوستانی یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی تھے اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے رامپور میں سب سے پہلے گریجویٹ یہ مولانا محمد علی جوہر تھے۔ وطن واپسی کے بعد آپ کو سب سے پہلے سر مائیکل اڈواٹر کے توسط سے نواب صاحب جاورہ نے وزارت کی پیش کش کی۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے چیف سیکرٹری کا منصب پیش کیا۔ مگر آپ نے یہ قبول نہ کیا۔ البتہ ریاست رامپور اور بڑودہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ جو ان کی حریت پسند طبیعت کو راس نہ آئے اور آپ نے نوکری چھوڑ کر میدانِ صحافت میں قدم رکھا اور ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو آپ نے کلکتہ سے ہفت روزہ انگریزی اخبار "کامریڈ" جاری کیا۔ متحدہ ہندوستان

کے دارالخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد کامریڈ بھی دہلی سے شائع ہونے لگا۔ یہ اتنی اہمیّت کا حامل تھا کہ پارلیمنٹ کے ارکان سے لیکر وائسرائے اور گورنر تک اُسکے پڑھے بغیر چین نہ آتا تھا۔

عالمی حالات

مولانا محمد علی کی تاریخ ساز شخصیت پر روشنی ڈالنے سے قبل اس امر کی وضاحت اشد ضروری ہے کہ انہوں نے جب میدانِ عمل میں قدم رکھا تو اس وقت عالمِ اسلام کن حالات سے دوچار تھا۔ ان سے مولانا نے کیا اثر لیا۔ اس کے کیا تقاضے تھے اور مولانا محمد علی نے ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے کیا کچھ کیا؟ اس دور کی تاریخ کی رو سے مولانا محمد علی نے بڑا پُر آشوب زمانہ پایا تھا۔ بقول ضیاء الدین احمد برنی :۔

"جنگ طرابلس۔ جنگِ بلقان اور پہلی جنگِ عظیم ان کے زمانہ میں ہوئیں اس سے قبل روسیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں ایران کا گلا گھونٹنے کی کوششیں جاری تھیں۔ مصر انگریزوں کی غلامی میں تھا۔ طرابلس پر دولِ عظمیٰ نے اٹلی کا غاصبانہ قبضہ تسلیم کرلیا تھا۔ افریقہ کی دیگر شمالی ریاستیں فرانس کے پنجۂ استبداد میں تھیں۔ تھریس میں بلقانی ریاستیں ترکوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھیں۔ اہلِ نجد و حجاز انگریزوں کے پٹھو شریف مکّہ کے ظلم و استبداد سے کراہ رہے تھے :"

اور اہلِ ہند انگریزوں کی غلامی کا جُوا اتارنے کے لئے پَر تول رہے تھے۔ غرض کہ پورا عالمِ اسلام مصائب و ابتلاء کا شکار تھا۔ مولانا محمد علی جہاں ہر اجنبی مسلمان کی مصیبت اور موت سن کر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ وہ عالم اسلام کا یہ ابتلاء کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ اس لئے مولانا محمد علی نے عالم اسلام کو اغیار کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے کا مورچہ متحدہ ہندوستان میں لگانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انگریز

اہلِ ہند کی عسکری امداد سے عالم اسلام پر قابض ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا۔ تو مرکزِ اسلام حرمین شریفین بھی آزاد ہو سکیں گے۔

تحریکِ خلافت تحریکِ خلافت زیادہ تر اسی غرض کے لئے چلائی گئی تھی اور اس انداز سے چلائی گئی تھی کہ ہندو اور سکھ بھی اس مہم میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ہمنوا ہو گئے اور گاندھی جی ان کی جیب میں نظر آنے لگے۔ یہ دونوں بھائی اس زمانہ میں علی برادران کے نام سے مشہور تھے۔ علی برادران نے جب گاندھی جی کو ہمراہ لیکر تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں ملک بھر میں دورے کئے۔ تو متحدہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ مسلمانوں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے اللہ اکبر۔ گاندھی کی جے۔ محمد علی شوکت علی کی جے کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس وقت فی الواقعہ ملک کی حکومت ان ہی تین بے تاج، تاجداروں کے ہاتھ میں تھی۔

محبوب مشغلہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب ترکی بھی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابلہ میں آگیا۔ تو لندن کا نامور جریدہ "ٹائمز" اس پر بڑا سٹ پٹایا۔ اور ترکی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار کامریڈ میں Chois of the Turks کے زیرِ عنوان ٹائمز کو ایک طویل اور دندان شکن جواب دیا اور ترکی کو اس اقدام پر معذور قرار دیا۔ یہ مقالہ قصرِ استعمار پر بم ثابت ہوا۔ اور انگریزوں نے فی الفور کامریڈ کو بند اور مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا۔ قید و بند میں لیڈروں کا عام طور پر محبوب مشغلہ تصنیف و تالیف یا شعر و شاعری یا مکاتبت و مراسلت ہوتا ہے۔ اس نظر بندی کے دوران مولانا عبدالماجد دریا بادی نے مولانا محمد علی کو کوئی کتاب لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کا آپ نے جو جواب دیا۔ وہ تاریخ میں سنہری حرف میں لکھا جائے گا۔ آپ نے لکھا:۔

"یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں۔ تاریخ سازی کا ہے۔ اغیار تاریخ بنا

رہے ہیں اور آپ مجھے تاریخ لکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ عالم اسلام کی بربادیوں نے دل و دماغ میں وہ سکون ہی کب قائم رہنے دیا ہے۔ جو میں تصنیف و تالیف پر توجہ کروں"۔

(ذاتی ڈائری)

مولانا محمد علی کا یہ جواب اس بات کا شاہد عدل ہے کہ مولانا موصوف عالم اسلام کی بربادی سے بے حد متاثر تھے۔

ملّی مفاد

ملّی مفاد آپ کو کتنا عزیز از جان تھا۔ اس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں پانچ سال کی قید و بند کے بعد آپ جب جیل سے رہا ہوئے تو آپ بیوی بچوں کی خبر گیری کی بجائے سیدھے امرتسر پہنچے۔ جہاں آل انڈیا نیشنل کانگرس مسلم لیگ۔ خلافت اور جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ اجلاس جلیانوالہ باغ میں ہو رہے تھے۔ اسی باغ میں انگریزی حکومت نے ہندو۔ مسلمانوں اور سکھوں پر اندھا دھند فائرنگ کر کے سینکڑوں نہتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ انگریزی حکومت کی اس حماقت نے ہندو مسلم اتحاد میں روح پھونک دی تھی۔ ایسا اتحاد ہندوستان کی تاریخ میں پھر کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ علی برادران کا کانگرس کے پنڈال کے دروازہ پر مسٹر گاندھی۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور دیگر رہنماؤں نے بڑھ کر استقبال کیا اور پنڈت موتی لعل نہرو صدر کانگرس نے ہر دو کا تعارف کرایا۔ کانگرس کے اجلاس کے بعد انہوں نے مسلم لیگ وغیرہ کے اجلاسوں میں شرکت کی۔

امرتسر کی ایک تقریر میں آپ نے اپنا مطمح نظر ان الفاظ میں پیش کیا۔ جس کے دوران خود بھی زار و قطار روتے رہے اور دوسروں کو بھی رلاتے رہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"کعبۃ اللہ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا اور آخری فرض ہے۔ اسکے بچانے کے لئے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنا ہیں۔ جب اس پر حملہ کی تیاریاں

ہو رہی ہیں اور ہمارا قبلہ ہی خطرہ میں پڑ رہا ہے ۔ تو ہم سب یہاں سے ہجرت کر کے گرتے پڑتے اس کی حفاظت کو جا پہنچیں گے ۔ اپنے گھروں کو ویران کر دیں گے ۔ تاکہ اللہ کا گھر محفوظ رہے ۔ یہاں کی عبادت گاہیں سونی کر جائیں گے ۔ تاکہ اس معبد اعظم کی رونق اور بہار میں فرق نہ آئے "

جامعہ ملّیہ اسلامیہ سر سید احمد خان نے علی گڑھ سکول اس لئے قائم کیا تھا کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں فلسفہ بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہوگا ۔ مگر علی گڑھ میں مادیت پرست ۔ ظاہر پسند اساتذہ نے سر سید کا یہ خواب پورا نہ ہونے دیا ۔ اور نہ ہی انگریزی حکومت اس سکول کو وہ اہمیت دینا چاہتی تھی ۔ اس لئے مولانا محمد علی نے اپنے وقت کے تقاضوں کے تحت سرکاری اثر سے آزاد جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی ۔ خود ہی بڑی محنت سے اس کا نصاب تیار کیا ۔ اس پر مضامین لکھے ۔ ان کی نشر و اشاعت کی ۔ کلاس قائم کئے ۔ خود ہی پڑھائی شروع کر دی ۔ کیونکہ آپ کو علم سے زیادہ مذہب عزیز تھا ۔ آپ نے خلافت کمیٹی کی رکنیت کی شرط ہی نماز باجماعت تجویز کی تھی کہ آئندہ اس کے وہی ممبر بن سکیں گے ۔ جو نماز باجماعت ادا کرنے کے پابند ہوں گے ۔ وہ اس عقیدہ کے مالک نہ تھے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے ۔ اسی لئے آپ جب جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے لئے اساتذہ کا انتخاب کرتے تھے ۔ تو سب سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ اس کا مذہب کی طرف کتنا رجحان ہے ۔ آپ اپنے دور کے ترقی پسند تھے اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ اسی ترقی پسند رجحان کی پیداوار تھا ۔

خلافت کانفرنس اوائل ستمبر ۱۹۲۱ء میں آپ نے کراچی خلافت کانفرنس کی صدارت کی ۔ آپ کی اجازت سے مولانا سیّد حسین احمد مدنی نے مندرجہ ذیل قرار داد پڑھ کر سنائی :-

"حکومت برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا۔ کسی کو بھرتی کرانا۔ کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین اور ہر قسم کی اعانت کرنا ازروئے شریعت حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے"۔

کیونکہ فوج میں شریک لوگوں کو اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر گولی چلانا پڑتی تھی۔ مولانا محمد علی نے اپنی صدارتی تقریر میں اس قرارداد کی تائید میں قرآن وحدیث کے وہ احکام سنائے۔ جو قتلِ مسلم کی وعید میں ہیں۔ پیر غلام مجدّد۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا نثار احمد کانپوری نے اس قرارداد کے حق میں تقریریں کیں۔ جنھیں باغیانہ قرار دیکر حکومت نے ان سب کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیا—— کراچی میں ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ جس کی سماعت کے دوران مولانا محمد علی نے طویل بیان دیا۔ اس میں یہ بھی فرمایا کہ:۔

"اسلام صرف ایک شہنشاہی کو تسلیم کرتا ہے اور وہ شہنشاہی خدا کی ہے۔ جو سب سے عالی و رفیع قطعی اور غیر مشروط حکمرانی ہے۔ اور جس میں کسی قسم کے اختلاف یا مخالفت کا دخل نہیں .... مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے دنیاوی حکمرانوں کے صرف وہی احکام مان سکتے ہیں۔ جن کی تعمیل میں خدا تعالےٰ کے احکام کی نافرمانی کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو.... بقول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مخلوق کی اطاعت واجب نہیں۔ جبکہ اس کی اطاعت میں خالق کی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو..... ہم صرف خدا کے حکم کی تعمیل کرسکتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان کی نفرت و محبت کا مرجع خدا کی خوشی اور ناخوشی ہے"۔

قید و بند

اس حق گوئی کی پاداش میں سب ۲-۲ سال کے لئے قید کر دیئے گئے۔ کہتے ہیں دل سے جو بات نکلتی ہے۔ اثر رکھتی ہے۔ قائدِ اعظم

محمد علی جناح کی طرح مولانا محمد علی بھی چونکہ اپنے مقصدِ حیات میں مخلص اور بے غرض تھے۔ اس لئے جب کانگرس میں آئے تو پوری قوم کو ساتھ لائے اور ــــ کل تک ــــ گورنروں۔ لفٹیننٹ گورنروں۔ راجوں۔ مہاراجوں۔ ایگزیکٹو کونسلروں حتیٰ کہ خود وائسرائے بہادر تک کو ملنے والے مولانا محمد علی جب جیل بھیجے گئے۔ تو وہ اکیلے نہ گئے۔ بلکہ سینکڑوں نہیں ہزاروں مسلمانوں۔ اچھے اچھے خاندانوں ذی رتبہ لوگوں۔ گریجوایٹوں۔ وکیلوں۔ بیرسٹروں۔ ڈاکٹروں۔ عالموں۔ فاضلوں نے ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوتے انکے اتباع میں ملک کی جیلیں بھر دیں۔

مولانا محمد علی قید و بند سے چھوٹنے کے بعد دار و رسن کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے اور کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"بولتے بولتے گلا پڑ پڑ جاتا ہے۔ لیکن اسکا کوئی علاج نہیں ہے۔ اب یہ گلا تو جب خاموش ہو گا۔ جب اس میں پھانسی کا پھندا پڑے گا۔ یوں تو یہ نہ مانے گا"

آپ لیگی اور کانگرسی دونوں حلقوں میں مقبول تھے۔ ۱۹۱۷ء میں جب آپ قیدِ فرنگ میں تھے۔ آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا اور اس کے سالانہ اجلاس میں کرسیٔ صدارت پر آپ کی تصویر رکھدی گئی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد ۱۹۲۳ء میں آپ کو آئندہ سال کے لئے آل انڈیا کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس قومی اعزاز نے گو آپ کو ملک کا سب سے بڑا سردار بنا دیا۔ مگر آپ کی نظر میں ان دنیوی اعزازات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کیونکہ آپ کی محبت آپ کی عداوت۔ آپ کا جینا۔ آپ کا مرنا سب کچھ اللہ کے لئے تھا۔ اپنے ذاتی مفاد یا وجاہت و وقار کے لئے نہ تھا۔ اسلئے اس قومی اعزاز پر آپ نے فرمایا کہ میں اس عزت افزائی کے لئے ملت کا مشکور ہوں۔ مگر میری نظر میں اسکی جو حقیقت ہے۔ وہ اس شعر سے واضح ہے

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے ؎

مذہبی جنون

مولانا محمد علی اگرچہ بظاہر سیاسی لیڈر تھے اور سر پھرے سیاسی لیڈر مشہور تھے۔ مگر فی الواقعہ آپ ایک مذہبی لیڈر تھے۔ آپ کی مذہبیت جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ پہلی نظر بندی کے اختتام پر رہا کرتے وقت گورنمنٹ ہند نے آپ کو اس امر کے ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے کو کہا کہ آپ آئندہ غیر آئینی اور متشددانہ طریقوں سے محترز رہیں گے تو آپ نے اس عہد نامہ میں ان الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا:۔

"سب سے پہلے مجھ پر اللہ کی اطاعت فرض ہے اور بادشاہ وقت سے میری وفاداری اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر دنیاوی قوانین خدائی احکام سے ٹکرائیں گے تو اس صورت میں، میں صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کروں گا"۔

حکومت نے یہ عہد نامہ صرف مسترد ہی نہ کیا۔ بلکہ دونوں بھائیوں کو حکومت کے احکام پر خدا کے احکام کو ترجیح دینے کی پاداش میں دو سال کی مزید قید و بند دیدی۔

آپ کو اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب اور رفقاء کار سے بڑی محبت تھی۔ لیکن ان سب کی محبت پر اللہ اور اس کے دین کی محبت آپ پر غالب تھی۔ اسی لئے آپ کو والذین امنوا اشدُّ حبًا لِلّٰہ کی عملی تفسیر کہتے تھے۔ آپ کا مذہبی جنون کس حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا اندازہ آپ کے ایک تاریخی خطاب کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"ہم بھی کوئی مسلمان نہیں۔ جو حکومت سے ڈر رہے ہیں۔ اس سے ڈر رہے ہیں۔ اس سے ڈر رہے ہیں۔ مسلمان کے لئے مخلوق بھی کوئی چیز

ڈرنے اور خوف کھانے کی ہے۔ مسلمان کو تو صرف ایک اور اکیلے خالق ذوالجلال سے ڈرنا چاہیئے۔ نہ کہ اس کی مخلوق سے۔ اور مخلوق بھی کون؟ اسکی باغی! اس کی نافرمان!!۔ اس کی اطاعت، اطاعت سے خارج!!!

ذکرِ خدا

مولانا محمد علی جب ۱۹۲۴ء سنہ کے لئے آل انڈیا نیشنل کانگرس کے صدر بنے تو آپ نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے انکار کے باوجود ان کو اپنا جنرل سیکرٹری بنا لیا۔ پنڈت جواہر لعل اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ:-

"میرا شمار محمد علی کے محبوبوں میں تھا۔ محبت باہمی اور ہم خیالی کا رشتہ ہم دونوں کو جوڑے ہوئے تھا۔ ان کی مذہبیت بے پناہ تھی۔ اور میرے خیال میں حدود عقل و علم سے متجاوز اور میں مذہب سے کورا۔ ..... جس موضوع پر ہماری آپس میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ وہ خدا تھا۔ محمد علی کو عجیب ملکہ حاصل تھا کہ وہ خدا کا ذکر کانگرس کے ریزولیوشنوں تک میں لے آتے تھے۔ کہیں یہ کہ خدا کا شکر ادا کیا جائے۔ کہیں یہ کہ خدا سے دعا کی جائے میں ہمیشہ مخالفت کرتا اور اس وقت محمد علی میرے الحاد پر برس پڑتے ..... میں محمد علی سے مذہبی بحث و مباحثہ کرنے کو ٹال ہی جاتا تھا۔ اس لئے کہ میں خوب سمجھتا تھا کہ اس سے فریقین کو بس غصہ ہی آ کر رہے گا۔ اور ممکن ہے۔ انہیں میری کسی بات سے دکھ پہنچے۔ مذہب کوئی سا بھی ہو۔ اس کے پختہ پیرووں سے مذہب کے موضوع پر گفتگو کرنا ہے نازک اور مسلمانوں سے مخاطبت میں تو یہ نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ انہیں تو دائرہ سے باہر ہونے کی اجازت ہوتی نہیں۔ عقائد کے لحاظ سے ان کا سیدھا راستہ تو ایک ہی ہے جو تنگ بھی ہے اور مومن کو

داہنے بائیں۔ کسی طرف ذرا بھی ہٹنے کی اجازت نہیں۔ ہندوؤں کی حالت اس سے ذرا مختلف ہے۔ گو ہمیشہ یہاں بھی نہیں ..... اس لئے میرے اور محمد علی کے درمیان مذہبی گفتگو نہیں آنے پاتی تھی۔ لیکن وہ چپ رہنے والے کب تھے۔ کچھ ہی روز بعد (یہ شاید ۱۹۲۵ء ہو یا شروع ۱۹۲۶ء) ان کے لئے ضبط کرنا ناممکن ہوگیا۔ ایک دن وہ ابل ہی تو پڑے۔ دہلی میں ان کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے گھیر گھار کر مذہب کے موضوع پر مجھے لانا چاہا۔ میں نے ٹالنا چاہا اور عرض کیا کہ ہمارے نقطۂ خیال اتنے مختلف ہیں کہ ایک دوسرے کو قائل کرنا مشکل ہی ہے۔ لیکن وہ بھلا ٹالے بالے میں آنے والے تھے۔ بولے "صاف صاف کہہ ڈالو۔ تمہارے خیال میں، میں مذہب کے معاملہ میں دیوانہ سا ہوں تو آج اسی کو خوب اچھی طرح صاف کرلو"۔

اس کے بعد مولانا محمد علی نے فرمایا:۔

مطالعۂ مذہب

"میں نے مذہب کا مطالعہ کیا ہے۔ اور مطالعہ بھی عمیق و وسیع ادھر دیکھو۔ وہ سامنے الماریاں جو کتابوں سے بھری ہیں۔ وہ مذہب ہی سے متعلق ہیں۔ خصوصاً اسلام اور مسیحیت کے متعلق اور ان میں جدید ترین کتابیں بھی ہیں۔ مثلاً ویلز کی God, the invissible King پھر دورانِ جنگ میں طویل نظر بندی کی جو مہلت ملی۔ یہ وقت میں نے قرآن مجید کے مطالعہ میں صرف کیا اور تفسیریں اور ترجمے دیکھے اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ قرآن میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں ۹۷ فیصد تو ایسی ہیں۔ جو بالکل عقل میں آجاتی ہیں۔ اب رہیں ۳ فیصدی عقل بشری سے ماورا امور سے متعلق ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ جبکہ ۹۷ فیصدی

باتیں بالکل دلنشین ہو گئیں۔ اسکی بقیہ تین فیصدی پر ایمان لانے سے کون سا امر مانع ہو سکتا ہے"؟ یہ استدلال تو کچھ ایسا قوی نہ تھا۔ لیکن بحث و مباحثہ سے بہر حال میں بچنا چاہتا تھا۔ میرے لئے حیرت کی چیز وہ نہیں جو میں نے اب تک کہی۔ بلکہ وہ ہے جواب کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی اس کے بعد محمد علی نے کہا کہ "قرآن جو کوئی بھی انصاف اور بے تعصبی سے پڑھے گا۔ وہ اس پر ایمان لے آئے گا اور یہ میرے علم میں ہے کہ گاندھی جی اسے خوب پڑھ چکے ہیں۔ اس لئے دل ہی دل میں اسلام کی صداقت کے تو لامحالہ قائل ہو گئے ہوں گے۔ کسرِ نفسی کی بنار پر اس کا اعلان نہ کریں تو اور بات ہے"

(صہ ۱۱۸ - ۱۱۹)

خدا۔ رسولؐ اور اسلام سے اسی والہانہ محبت کی بنار پر ایک دن آپ کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محل نے کہا تھا کہ یہ دونوں بھائی اگر عہد نبوی میں ہوتے تو ان کی مسلسل فداکاریاں تو ایسی ہیں کہ جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مخصوص صحابیوں کے نام لیکر ایک صحبت میں انہیں جنت کی بشارت دی تھی۔ ایسے ہی ان دونوں کے لئے بھی کیا عجب کہ نام لے کر ارشاد فرماتے کہ محمد علی فی الجنۃ۔ شوکت علی فی الجنۃ۔

انگریز دشمنی

مولانا محمد علی کو انگریزوں سے ہمیشہ بڑی نفرت رہی۔ اگرچہ اس کا آغاز آپ کی نظر بندی کے بعد ہوا۔ ورنہ پہلے آپ کے اعلیٰ انگریز افسروں سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اب آپ تہیہ کر چکے تھے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال کر دم لیں گے۔ بمبئی کے محلہ مدن پورہ میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے یہاں تک فرما گئے کہ "گلیڈ اسٹون ترکوں کو یورپ سے بوریہ بستر سمیت نکال دینے کا حامی تھا۔ لیکن ہم انہیں نکالتے وقت، ان سے بوریا بستر یہاں رکھوالیں گے کہ یہ ہمارا مال ہے" انگریز

دشمنی کے باوجود حب الوطنی کے تقاضوں کے تحت آپ نے عین علالت کے عالم میں ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ آپ کو اسٹریچر پر لٹا کر جہاز تک لے جایا گیا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ لندن کیوں جا رہے ہیں تو آپ کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ مرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ گول میز کانفرنس میں لارڈ ریڈنگ جیسا باجبروت وائسرائے بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔ جسکی قہرمانی سے ایک عالم لرز رہا تھا۔ مولانا محمد علی ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیر کی طرح گرجے کہ:۔

"ہم دونوں بھائی وہ پہلے دو شخص ہیں۔ جنھیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں ڈال دیا تھا۔ لارڈ ریڈنگ سے مجھے انتقام لینا مقصود نہیں۔ لیکن اپنے ملک کی آزادی کا میں اس وقت قائل ہوں گا۔ جب مجھے یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ میں جب چاہوں۔ لارڈ ریڈنگ کو ان کے کسی جرم پر جیل بھجوا دوں ...... برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنا دیا ہے۔ لیکن ۳۲ کروڑ کی جس آبادی نے خود اپنے میں مرجانے کی ہمت پیدا کرلی ہے: اسے مار ڈالنا کچھ آسان نہیں .... اب میں اس وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا۔ جب تک کہ اپنے ہمراہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں۔ اگر آپ نے یہ نہ دیا۔ تو میرے لئے اپنے ہاں قبر کی جگہ دیجیے"۔

افضل الجہاد

اس باہمت اور صاحبِ ایمان رہنما نے لندن روانہ ہونے سے قبل جو اعلان کیا تھا وہ یہ تھا:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جائر اور رعایائے جائر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں۔ تا آنکہ اس کام میں مر جاؤں"۔

چنانچہ آپ نے جیسا کہا ویسا ہی کر دکھایا اور گول میز کانفرنس میں بیٹھ کر انگریزوں کو للکارا کہ "یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہندوستان پر سے برطانوی تسلّط نابود ہو کر رہے"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ کو وہیں وفات نصیب ہوئی اور اس کے سولہ سال بعد ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کو ہندوستان بدر ہونا پڑا۔ آپ نے وہیں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی اور غلام ہندوستان میں آخری نیند سونے کی بجائے بیت المقدس میں دفن ہونے کی سعادت حاصل کی۔ جس کی آپ خود ہی یوں پیش گوئی کر گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

بھلا جس نے اسلام۔ دین اور مذہب کے تقاضوں پر نہ امان اللہ خان کو معاف کیا نہ مصطفےٰ کمال پاشا کو بخشا۔ سلطان ابن سعود کے منہ پر کھری کھری سنا دیں یہاں تک کہ اپنے مرشد تک سے بھی اختلاف کیا اور اپنے رفقاء کار تک کو ناراض کر لیا۔ وہ غاصب انگریزوں سے کب دبنے والے تھے۔ انہوں نے مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اور مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ تقریر کر کے انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ جب وقتِ نماز آیا تو برطانوی ایوانِ پارلیمنٹ کے برآمدہ میں جانماز بچھا کر کھڑے ہو گئے اور اس فرنگی ایوانِ حکومت میں پہلی بار رکوع و سجود کے نشان چھوڑے۔ اس لئے یہ کہنا صرف آپ کو ہی زیب دیتا تھا کہ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے ٭ یہ بندہ دو عالم میں خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ٭ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

مشاہیر ہند کی تاریخ میں ایسی مثال شاذ ہی ملے گی کہ مولانا محمد علی جب بیجاپور جیل

میں اپنے ایام اسیری کاٹ رہے تھے تو آپ کو اپنی جواں سال دختر آمنہ کی شدید علالت کی خبر ملی۔ آپ کو اپنی اولاد سے بے پناہ محبت تھی۔ لیکن جب آپ نے اپنی دختر نیک اختر کی بیماری کی خبر سنی تو بڑے صبر و قرار سے مولا کی رضا پر راضی رہتے ہوئے اپنی پیاری کو چند شعر لکھ کر بھیجدیئے۔ جن کا ماحصل ان کے ایک شعر میں یہ تھا:۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

رضاء الٰہی مولانا جوہر کو خدا کی رضا کا کتنا خیال تھا۔ اسکا اندازہ ان کے آل انڈیا خلافت کانفرنس کلکتہ ۱۹۲۸ء کے خطبہ کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ:۔

"میں دنیا کے آزادوں کی طرح حرّیت کا دعویدار بن کر آپ کے سامنے نہیں آیا ہوں۔ میں عبدیت کا طوق گلے میں ڈال کر خدا کا بندہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکِ پا بلکہ اس سے کمتر ذرہ بن کر آیا ہوں اور آپ کو بھی اس رشتہ میں منسلک کرنے آیا ہوں چاہے وہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو...... اگر آپ مجھ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں وہی کہوں گا جو آپ کی اکثریت کی پسند ہو تو سُن لو۔ میرا بھروسہ نہ مسلم اکثریت پر ہے۔ اور نہ ہندوستان کی اکثریت پر۔ میرا بھروسہ اگر کسی پر ہے۔ تو وہ توحید ہے۔ میں اللہ کا غلام ہوں۔ میں جو کچھ بھی عرض کروں گا۔ اس کی خوشنودی کے لئے ہو گا۔ چاہے آپ مجھے ماریں۔ دھتکاریں۔ گالی دیں۔ لیکن آپ کی خوشنودی کے لیے خدا کی رضامندی نہیں چھوڑ سکتا"

مولانا جوہر آجکل کے لیڈروں کی طرح نہ اقتدار چاہتے تھے۔ نہ اختیار۔ آپ نے اپنے مقصد حیات کی خود ہی ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:۔

"میں ایک گدائے بے نوا ہوں۔ بے سروسامان ہوں۔ میرے پاس اگر کچھ پونجی ہے تو صرف اس قدر کہ دل میں چند ارادے اور دماغ میں چند افکار ہیں۔ جن کی تکمیل کا بھروسہ خداوند کریم کی توفیق فرمائی پر ہے...... میں نے ساری عمر کے لئے اپنے لئے تجویز کیا ہے کہ پہلے مسلمانوں میں۔ پھر ساری دنیا میں فکر اسلامی پیدا کروں اور ہندوستان کو آزادی دلاؤں"

(کامریڈ ۱۹۲۹ء)

توکل علی اللہ آپ کی نظریں ہر وقت خدا پر لگی رہتی تھیں اور اسی کی ذات پر آپ کو ہر لمحہ بھروسہ تھا۔ آپ کی ہر تحریر اور تقریر کی تان اسی پر آکر ٹوٹتی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے ایک تقریر کے درمیان اسکا ان الفاظ میں واشگاف اعلان کیا کہ:-

"حضرات آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ سمندر نے جہاز کو ڈبو دیا اور طیارے کو ہوا نے گرا دیا۔ کبھی یہ بھی سنا کہ جہاز نے سمندر کو ڈبو دیا اور طیارے نے ہوا کو گرا دیا۔ اے انگریزو! تمہیں اپنے جہازوں اور بمبار طیاروں کی طاقت پر گھمنڈ ہے اور ہمارا اس خدائے قادر و قیوم پر بھروسہ ہے۔ جس کے قبضۂ قدرت میں سمندر کا پانی اور فضا کی ہوائیں ہیں۔ وہ اپنے سمندر کو حکم دے تو جہازوں کو غرق کر دے۔ وہ ہواؤں کو اشارہ کرے تو طیاروں کو زمین پر دے ماریں۔ تمہارے جہاز اور طیارے سمندر اور ہوا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مگر خدا کا سمندر تمہارے جہازوں کو اور اس کی ہوا تمہارے طیاروں کو آن کی آن میں فنا کر سکتی ہے۔ ہمارا اعتماد تمہارے گھمنڈ سے کہیں زیادہ وزنی ہے"

مقصدِ حیات

مولانا محمد علی جوہر نے ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں اپنی ملّی اور سیاسی زندگی کا خود ہی ان مختصر الفاظ میں خاکہ کھینچا تھا:-

"ملک وملّت کی خدمت کا آغاز اپنے پرانے کالج مدرسۃ العلوم کو مسلمانانِ علی گڑھ کے جامعہ ملیہ بنانے کی کوشش اور مسلم لیگ کی بنیاد ڈالنے سے کیا تھا۔ پھر جریدہ نگاری شروع کی۔ کامریڈ۔ ہمدرد جاری کیا۔ جب عالمِ اسلام پر مصیبتوں کا نزول شروع ہوا تو "خدامِ کعبہ" کی بنیاد ڈالی۔ جنگِ طرابلس کے موقعہ پر ترکوں کی امداد کے لئے فنڈ کھولا۔ جنگِ بلقان پر طبی وفد روانہ کیا۔ جنگِ عمومی میں پہلے اپنے پریس کی وہ ضمانت ضبط کرائی جو کانپور کی مسجد کے شہید کئے جانے اور اس پر صدائے احتجاج بلند کرنے پر طلب کی گئی تھی۔ پھر خود نظر بند ہوا اور بعد میں قید ہوا"

اور اپنا مقصدِ حیات پر اپنے جریدہ ہمدرد ۲۷ر جنوری ۱۹۲۷ء میں یوں روشنی ڈالی:-

"الٰہی اگر تو نے بے کس اور بے سروسامان غازیانِ اسلام کی مدد نہ کی تو کفر کی تاریکی سارے اقصائے مغرب کو گھیر لے گی۔ اسلئے شہدائے بدر و تبول کے صدقے میں اپنے جانفروش بندوں کو فتح و نصرت عطا فرما۔ اور ان کے دشمنوں کو جو فی الحقیقت حق و صداقت کے دشمن ہیں، مغلوب و مفتوح بنادے"

اسی لئے آپ کی وفات پر مورّخ اسلام علامہ سیّد سلیمان ندوی نے لکھا کہ:-

"وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمان کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا۔ اور اوروں کو بے تاب کر دیتا تھا۔ آج قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا ہے"

قومی مماثلت

قائداعظم محمد علی جناح اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر میں بڑی مماثلتیں تھیں:۔

۱۔ دونوں کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید پڑھنے سے ہوا۔

۲۔ دونوں نے تکمیل تعلیم انگلستان میں کی۔

۳۔ جوانی میں دونوں اعلیٰ درجہ کا انگریزی لباس زیب تن کرنے کے عادی تھے۔

۴۔ قومی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد دونوں شلوار اور شیروانی میں اکثر ملبوس رہتے۔

۵۔ دونوں کے چہرہ پر ذکاوت اور بشرہ پر ذہانت ٹپکتی تھی۔

۶۔ گھن گرج بے خوفی۔ بیباکی اور حق طلبی میں دونوں یکساں تھے۔

۷۔ انگریزوں کو ہندوستان بدر کرنے میں دونوں کوشاں رہے۔

۸۔ دونوں کی ذہانت وفطانت کا عوام وخواص پر سکہ بیٹھا ہُوا تھا۔

۹۔ دوست دشمن سب ان کی جادو بیانی اور انگریزی پر کمانڈ کے قائل ومعترف تھے۔

۱۰۔ دونوں ہندو مسلم اتحاد کے شیدائی تھے اور انہی کی کوششوں سے الٰہ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔

۱۱۔ دونوں نے جب ہندوؤں کے ہاتھوں مسلم مفاد خطرہ میں دیکھا تو دونوں انڈین نیشنل کانگرس سے الگ ہوگئے۔

۱۲۔ دونوں کو خدمتِ ملک وملت کے عوض قریب قریب ایک جیسی ڈگریاں ملیں۔ یعنی مولانا محمد علی جوہر پر "گاندھی پرست" ہونے کا اور قائداعظم محمد علی جناح پر کافراعظم ہونے کا فتویٰ لگایا گیا۔

۱۳۔ قادر مطلق نے دونوں کو نوازا۔ ایک کو بے غرضانہ اور مخلصانہ کے عوض سرزمینِ انبیاء میں آخری آرامگاہ ملی۔ اور دوسرے کو ایک سلطنت عطا ہوئی۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فتنہ انگیزی

مولانا محمد علی جوہر کی تحریک خلافت ہندو مسلم اتحاد کی بدولت پروان چڑھی تھی۔ اور وہ اتنے عروج پر پہنچ گئی تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے بستر گول کرنے کا یقین ہو گیا تھا۔ اور عالم اسلام میں احیاء خلافت کا جذبہ پھر سے ابھر آیا تھا۔ جو استعماری اور سامراجی طاقتوں کے لئے سوہانِ روح بن رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لئے فرقہ وارانہ فساد شروع کرا دیئے۔ جنکا آغاز ۱۹۲۲ء میں ملتان سے ہوا اور دیکھتے دیکھتے اس آگ نے سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوسری طرف ملک میں شدھی اور سنگھٹن کی آگ بھڑکا دی گئی۔ جنکا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو بنانا یا ختم کرنا تھا۔ جن کے دفاع کے لئے مجبوراً مسلمانوں کو بھی تبلیغ و تنظیم کی مہم شروع کرنی پڑی۔ خلافت اسلامیہ کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے یورپ کے "مردِ بیمار" کو ایسا ٹیکہ لگایا کہ اس نے کمال اتاترک کی صورت اختیار کر کے خلافت اسلامیہ توڑ دی۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو وہاں لادینی حکومت قائم کر دی۔ عربی کی جگہ لادینی رسم الخط رائج کر دیا گیا۔ اور قرآنِ کریم جمع کر کے لائبریریوں میں ڈھیر لگا دیئے گئے۔ سرزمین نجد و حجاز کو انگریزوں کے پٹھو شریف حسین سے نجات دلانے کے بعد ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو وہاں ابن سعود نے اپنی بادشاہت قائم کر دی۔ اسطرح مولانا محمد علی جوہر کا خواب احیاء خلافت شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن اسلام میں ثمرہ چونکہ نیت پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام کے اس خادم کو مرنے کے بعد اسلام کے پیغامبروں کے زمرہ میں جگہ دی گئی۔ یہ ایسی سعادت ہے جو آج تک کسی لیڈر کو نصیب نہیں ہوئی۔

شعرو شاعری

مولانا محمد علی جوہر رام پور کے اس زمانہ کی پیدوار تھے۔ جب وہاں گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ خود مولانا کے الفاظ میں" داغ۔ امیر۔ تسلیم عروج۔ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان پر نورافشانی کر رہے تھے" انہی کی بدولت آپ کو بھی شعرو شاعری کی دولت ملی۔ آپ کا تخلص جوہر تھا۔ آپ کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی کا تخلص گوہر تھا۔ اسی نسبت سے یار لوگوں نے ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کا تخلص شوہر تجویز کیا تھا۔ مولانا محمد علی کیسے شاعر بنے۔ اسکی کہانی ان کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ میں نہ صرف شعرو سخن کی گود میں پلا ہوں۔ بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اسکو ہاتھی بنا کر اسکی پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی اور گستاخی باقی نہیں رہی۔ جو میں نے شعرو سخن میں نہ کی ہو۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے"

قید و بند نے آپ کی شاعری کو بہت جلا بخشی۔ یہ شعر جو آج ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپکے عرصۂ قید کی ایک نظم کا ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

آپ کا زیادہ تر کلام دورِ زندان کی پیداوار ہے۔ جہاں رات کے طول طویل حصے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتے گزر جاتے تھے۔ اور آسی غازی پوری کا یہ شعر وردِ زباں رہتا تھا ؎

وہاں پہنچ کے یہ کہیو صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

جیل میں ان کی کیسے گزرتی تھی۔ اسکا نقشہ انہوں نے خود ان اشعار میں کھینچا ہے سہ

تنہائی کے سب دن ہیں۔ تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفّی ہے ہر آن تسلّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے۔ ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

بہترین اصول کلکتہ کے الہلال اور لکھنؤ کے مسلم گزٹ کے بعد مسلمانوں کے عام طبقوں میں پہلی بار جن اخباروں نے مسلمانوں میں بیداری اور خودداری کا احساس پیدا کیا۔ وہ دہلی سے شائع ہونے والا مولانا کا کامریڈ اور ہمدرد تھا۔ ان اخبارات کی سب سے بڑی خصوصیّت یہ تھی کہ ان میں اخلاق سوز یا فحش قسم کے اشتہار شائع نہیں ہوتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ "زمیندار" لاہور میں مدتوں حکیم غلام محمد کا اشتہار بعنوان "اسکے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" شائع ہوتا رہا۔ لیکن مولانا نے اپنے اخبار میں اسکے چھپنے کی بھی اجازت نہ دی۔ روزنامہ "خلافت" کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر نے اس اشتہار کے چھاپنے کے لئے یہ وجہ جواز پیش کی کہ اس سے آمدنی کی کمی پوری ہو گی تو مولانا نے انہیں ڈانٹ کر فرمایا:۔

"میں فاقے کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن سوقیانہ اشتہاروں کو کبھی قبول نہ کرونگا"

لیکن آجکل تو اخباروں کی زندگی کا زیادہ تر دارومدار ایسے سوقیانہ۔ فلمی اور جنسی اشتہاروں پر ہے۔ جو قوم کو تباہی کے گڑھے میں لے جا رہے ہیں۔

اگر بغور دیکھا جائے تو قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تحریکِ پاکستان، مولانا محمد علی جوہر کی تحریک خلافت کی صدائے بازگشت تھی۔ آج پورے عالم اسلام کی نظریں پاکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ اسے حصارِ اسلام سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے یہاں عالم اسلام کے سربراہوں کی تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جسے اگر مولانا محمد علی کے خواب کی تعبیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

نوحۂ غم مولانا محمد علی کی موت پر علامہ سیّد سلیمان ندوی نے یوں غم کے آنسو بہائے :۔

" تو ملت کا عزادار تھا۔ حق تھا کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا۔ فرض تھا کہ پوری ملت تیرا سوگ کرے۔ تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا۔ سزاوار یہ ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتم دار۔ طرابلس کا سوگوار۔ عراق کے لئے غمزدہ۔ بلقان کے لئے اشکبار۔ شام پر گریاں۔ انگورہ پر مرثیہ خوان۔ حجاز کا سوختۂ غم اور بیت المقدس کے لئے وقفِ الم۔

اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمینِ اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ مناسب یہی ہے کہ تیرے لئے قبلۂ اوّل کا سینہ پھٹ جائے۔ اور تو اس میں بس جائے "۔

علامہ اقبال نے کہا ؎

خاک قدس اُو را آغوشِ تمنا گرفت

رفت ازاں راہے کہ پیغمبر گزشت

وزیرِ ہند نے اعتراف کیا کہ :۔

محمد علی ایک جلیل القدر مسلمان۔ ایک زبردست محبِ وطن اور عالمِ انسانیت کے ایک عظیم القدر پیشوا تھے۔

مفتی اعظم امین الحسینی نے فرمایا :۔

محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سب کچھ ملت۔ قوم اور اسلام کے لئے قربان کر دیا۔

مولانا ظفر علی خان نے لکھا ؎

دلکشی فضائے وطن کی محمد علی سے تھی
رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی



(۱۰)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

ابتدائی دور متکلمِ اسلام۔ عظیم و جلیل مجاہد۔ انقلابی مفکرؒ۔ صاحبِ فراست۔ محقق و مدبر مولانا عبید اللہ سندھی۔ ایک سکھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۸ء سے جامپور کے اردو مڈل سکول میں داخلہ لیا۔ اس وقت والدین کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ اور دل میں اسلام کی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ جب خدا کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے تو اسے خود ہی صراطِ مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ آپ کو ۱۸۸۴ء میں ایک آریہ سماجی طالب علم سے ایک کتاب تحفۃ الہند مل گئی۔ جس میں نومسلموں کی فضیلتیں اور آخرت کے احوال درج تھے۔ اس کے بار بار کے مطالعہ سے آپ کے دل میں شمعِ اسلام روشن ہوتی گئی۔ اس کے بعد آپ کو کہیں سے حضرت اسماعیل شہید کی تصنیف لطیف تقویۃ الایمان مل گئی۔ اس کے مطالعہ نے ضیاءِ توحید پیدا کی۔ اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ جس پر آپ نے ۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو اپنا آبائی شہر سیالکوٹ چھوڑ دیا اور پھرتے پھراتے کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں آگئے۔ جہاں اسلام قبول کیا۔ آپ کو جب عزیز و اقارب کے تعاقب کا پتہ چلا تو آپ سندھ چلے گئے جہاں آپ کو سید العارفین حافظ محمد صدیق بھرچونڈی والے کی صحبت نصیب ہوئی۔ انہوں نے آپ کو اپنا روحانی بیٹا بنا لیا۔ اور وہاں کی تعلیم و تربیت نے آپ کو اسلامی معاشرت کا نمونہ بنا دیا۔ وہاں سے بہاولپور آئے۔ جہاں مولانا عبد القادر سے ہدایت النحو پڑھی پھر واپس کوٹلہ رحم شاہ پہنچے۔ جہاں مولانا خدا بخش سے کافیہ پڑھی اور پھر دیوبند کا رُخ کیا۔ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے درس میں داخل ہو گئے۔ وہاں امتیازی نمبروں میں امتحانات پاس کیے۔ آپ کے مدرس اول مولانا سید احمد دہلوی نے آپ

کے علمی ذوق وشوق کو دیکھ کر فرمایا کہ "اگر اسے پڑھنے کے لئے کتابیں میّسر آجائیں۔ تو یہ شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔" وہیں آپ کو عالم رویا میں سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم اور امام ابو حنیفہؒ کی زیارت ہوئی اور آپ کے چند احباب نے آپ کو آسمان شہرت پر اڑتا ہوا دیکھا۔ وہاں ہی آپ نے تصنیف کا شغل بھی شروع کر دیا اور اصول فقہ پر ایک رسالہ لکھا جسے حضرت شیخ الہند نے بے حد پسند فرمایا۔ وہاں سے آپ گنگوہ پہنچے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ اور تکمیل تعلیم کرتے رہے۔ اور واپس ہو کر سندھ میں اپنے روحانی باپ کے پاس سکھر آئے۔ جو آپ کے پہنچنے سے دس روز قبل عالم بقار کو سدھار گئے تھے۔ اسی اثنار میں حضرت شیخ الہند کی طرف سے آپ کو اجازت نامہ برائے تدریس پہنچ گیا اور آپ نے حدیث پڑھانی شروع کر دی۔ آپ کے روحانی باپ کے خلیفہ مولانا تاج محمود نے وہیں سکھر میں آپ کی والدہ کو بلا لیا اور آپ کی وہیں سکھر کے اسلامیہ سکول کے ٹیچر محمد عظیم خان کی لڑکی سے شادی کرا دی اور مطالعہ کے لئے بہت بڑا کتب خانہ جمع کر دیا۔ اس کے علاوہ آپ گوٹھ پیر جھنڈا (حیدر آباد) کے راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے دینی کتب خانہ سے بھی استفادہ کرتے رہے اور دیگر بزرگانِ دین سے مستفیض ہوتے رہے۔

قلبی رجحان

مولانا عبیداللہ سندھی اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ :-

"اللہ تعالےٰ کی رحمتوں میں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک کا سلسلۂ علمار میرا رہبر بنا اور ان کو میں نے اپنا امام بنا لیا۔ مجھے اپنی علمی اور سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں ایک

اصول پر منظم ہوگئیں اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح میں پیوست ہوگئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف شیخ الہند نے کرایا تھا۔ آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علما کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد شیخ الہند سے پڑھی۔

دوران مطالعہ مولانا اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا سے پیدا ہوچکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات و حکایات نے اتنا کردیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتادی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی محبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لئے سوچتا تھا۔ اب دہلی کے لئے سوچنے لگا۔ مولانا اسماعیل شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنالیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کرلیا اور اسطرح آہستہ آہستہ کام شروع کردیا ...... جہاد کے سلسلہ میں اس جماعت کا حضرت شیخ الہند سے ذکر آیا۔ انہوں نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دیکر اتحادِ اسلامی کی ایک کڑی بنادیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تمام تعلیمی اور سیاسی مشاغل حضرت شیخ الہند سے وابستہ ہوگئے۔

(نقوش صد ۱۴۲۲۔ آپ بیتی نمبر)

عملی اقدام دیوبند سے آپ سندھ واپس آگئے اور امروٹ میں ایک مطبع قائم کیا۔ جس میں عربی و فارسی کی نایاب کتابیں اور "ہدایت الاخوان" نامی ماہنامہ چھپتے رہے۔ دو سال تک مطبع چلانے کے بعد آپ نے مولانا راشداللہ سے مل کر ۱۹۰۱ء میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اور سات سال تک اس کا انتظام سنبھالے رکھا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کو حضرت شیخ الہند نے دیوبند بلالیا اور وہاں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ یہاں آپ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ شیخ الہند کے ارشاد پر دیوبند سے دہلی منتقل ہوئے۔ جہاں آپ نے ۱۹۱۳ء میں جامعہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کی بنیاد رکھی۔ جس کے سرپرستوں میں شیخ الہند کے علاوہ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک شامل تھے۔ اسی دوران آپ کا ڈاکٹر انصاری سے تعارف کرایا گیا اور ڈاکٹر انصاری نے آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر سے متعارف کرایا۔ دو سال یہاں ملی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس مدرسہ کا تذکرہ ریشمی خطوط کی ڈائریکٹری میں نمبر ۱۷۶ پر یوں درج ہے:۔

"نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی ایک مشہور ادارہ ہے۔ جسے ایم عبیداللہ نے جمیعتہ الانصار دیوبند سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو قائم کیا تھا۔ نظارۃ المعارف کا ظاہری مقصد یہ تھا کہ وہ انگریزی خواں مسلمانوں میں، عربی تعلیم کا شوق پیدا کرے۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو مشنری ٹریننگ دینے کا ادارہ تھا اور ان کے ذہن میں سخت متعصبانہ خیالات پیدا کرتا تھا۔ اس کام میں عبیداللہ کے خاص ساتھی ایم احمد علی۔ قاضی ضیاء الدین ایم اے۔ اصطفیٰ اکریم بی اے۔ انیس احمد بی اے وغیرہ تھے۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ حکیم اجمل خان۔ ڈاکٹر انصاری محمد علی آف کامریڈ۔ مرحوم شبلی نعمانی۔ نواب مشتاق حسین وغیرہ اسکے

پرجوش ہمدرد تھے مصارف دو سو روپیہ ماہوار مہینہ کی دربار بھوپال کی امداد، ڈاکٹر انصاری کا ۵۰/- روپیہ ماہانہ چندہ اور سفیروں کے ذریعہ جمع ہونے والی رقوم سے پورے ہوتے تھے۔ حال ہی میں اس ادارہ کو اتحاد اسلامی کے منصوبوں کی تیاری کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ نیز آزاد علاقہ کو جانے اور وہاں سے واپس آنے والوں کے لئے قیام کا کام دیتا ہے"۔

(تحریک شیخ الہند صد ۲۶۴)

ہجرتِ کابل جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جہاد کا بھولا ہوا سبق سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے یاد دلایا۔ مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:-

"جب مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال نکل رہا تھا اور ان کی آتش بیانی سے مسلمانوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی اور وہ جہاد جس کا نام لینے سے لوگ ڈرنے لگے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسکا صور اس بلند آہنگی اور بیباکی سے پھونکا کہ یہ بھولا ہوا سبق لوگوں کی زبانوں پر آگیا۔ "الہلال" دیوبند کے حلقہ میں بھی آتا تھا۔ اور حضرت مولانا محمود الحسن کی مجلس میں پڑھا جاتا تھا۔ میں نے اس زمانہ میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا یہ فقرہ سنا تھا کہ ہم نے جہاد کا سبق بھلا دیا تھا اور ابوالکلام نے ہم کو پھر یاد دلا دیا۔ اس زمانہ میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی حضرت مولانا محمود الحسن کے ترجمان تھے"۔

(یادِ رفتگان صد ۴۲۷)

ولی اللٰہی تحریرات۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریکات اور

حضرت شیخ الہند کی صحبت کے اثرات نے آپ کے دل میں جوش جہاد پیدا کر رکھا تھا۔ جس سے کام لینے کے لئے حضرت شیخ الہند نے اپنے منصوبۂ جہاد کے سلسلہ میں آپ کو فی الفور کابل پہنچنے کا حکم دیا۔ کیونکہ ان دنوں یورپ جنگ کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ اور ہندوستان میں بغاوت کا ازحد اندیشہ تھا۔ جس کی وجہ سے برطانوی حکومت کی سی۔آئی۔ڈی سرگرم عمل تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی وغیرہ جیل جاچکے تھے۔ اس زمانہ میں سب سے زیادہ استاد قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ اور طلبا بلا چون وچرا ان کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی سفر کابل کی غرض وغایت پوچھے بغیر مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا عبداللہ انصاری کو لیکر افغانستان پہنچ گئے۔ کابل پہنچنے کے بعد آپ کو حضرت شیخ الہند کے انقلابی منصوبہ کی نوعیت معلوم ہوئی اور آپ یہ معلوم کرکے پھولے نہ سمائے کہ انگریزوں کے خلاف طاقت کے ذریعہ جہاد کرنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ اور آپ نے وہاں شیخ الہند کی نمائندگی کرنی ہے۔

ملاقاتِ امیر

یہاں سے آپ کو سپہ سالار محمد نادر خان اور سردار محمود خان طرزی وغیرہ کے نام خطوط دیئے گئے تھے۔ جو آپ نے ان حضرات تک پہنچائے۔ سپہ سالار نے آپ کو ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور قیام کابل کے دوران آپ کی مشکلات کو حل کرنے میں امداد دیتے رہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:۔

"احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم بظاہر ان سے اجنبی رہیں اور اس پر ہم نے عمل کیا۔ ان کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے۔ اس لئے ان کا ہر قول وفعل اخلاص پر مبنی تھا۔ ترکی کے شریکِ جنگ ہونے کا اثر طرزی پر نسبتاً بہت زیادہ تھا۔ اس لئے ہمارا رابطہ ان

سے زیادہ ہوتا گیا۔ انہوں نے ہمیں سردار معین السلطنت سے ملایا۔
اس سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہنچ گیا۔ سلطنت افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے۔ جسے میزان التحقیقات الشرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خان ہمارے دارالعلوم دیوبند کا تعلیم یافتہ ہے۔ حدیث حضرت گنگوہی سے پڑھی تھی۔ انہیں جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ میرا نام عبیداللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔
ایک دن سردار نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارہ میں بلایا عصر کے بعد وہیں اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خان تشریف لائے۔ اور کوئی آدمی نہ تھا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ حضور میں پیش کیا۔ آدھ گھنٹہ تک اعلیٰ حضرت اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائیہ فقروں سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کام کرنے کے لئے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا۔ جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخیر تک کرتا رہا"۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کا انتخاب کتنا صحیح تھا اور تحریک جہاد کے اس محاذ کے لئے آپ کی شخصیت کتنی موزوں تھی۔

اسیری و رہائی

آپ کابل میں چھ سات سال تک وہاں کی حکومت کی اعانت سے اپنے منصوبہ میں رنگ بھرتے رہے۔ وہیں آپ نے ایک تنظیم جنود اللہ (خدائی فوج) جہاد کی اغراض کے لئے ترتیب دی اور دوسری تنظیم حکومت کابل کی مصلحتوں کے پیش نظر حکومت موقتۂ ہند کے نام سے قائم کی۔ جس میں غیر مسلم بھی شامل تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کی جماعت سرحد سے جو مجاہدین کابل پہنچتے۔ وہ جنود اللہ میں شریک ہو جاتے۔ حکومت موقتہ ہند کے تین مرکز بنائے گئے۔ کابل۔

نیپال اور بنگال ۔ کابل کا محاذ مولانا عبیداللہ سندھی کے سپرد ہوا اور جنود اللہ کا دیگر تمام کاروبار حکومتِ موقتہ مرکزِ کابل کے سپرد ہوا ۔ امیر امان اللہ خان نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد آپ کو ہی حکومت موقتہِ ہند کا نمائندہ تسلیم کرتے ہوئے سرکاری معاملات حرب و صلح میں شریک کر لیا ۔ جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو آپ کو خصوصیت سے بلا کر اس مجلس میں شرکت کا اعزاز بخشا گیا ۔ ادھر انگریزوں کا حکومتِ افغانستان پر روز بروز حکومتِ مؤقتہ ہند کے ارکان کو ملک سے نکالنے کے لئے دباؤ بڑھ رہا تھا ۔ اس لئے امیر کابل نے آپ کو اپنی سرگرمیاں بین الاقوامی تقاضوں کے تحت معطل کرنے کا امر صادر کیا ۔ جس پر ان حضرات نے افغانستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا ۔ اور واپس یاغستان کو آ رہے تھے ۔ جب جلال آباد کے قریب پہنچے تو وہاں برطانوی افغانوں نے مولانا سیف الرحمٰن کو معہ ہمراہیان گرفتار کر لیا ۔ انور پاشا کے نام حضرت شیخ الہند کا خط جلا دیا گیا ۔ اور ان ۲۰ - ۲۵ مجاہدین کو اس کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ۔ جس میں بمشکل دس آدمی سما سکتے تھے ۔ جب امیر امان اللہ خان کا اقتدار مستقل ہو گیا تو انہوں نے آپ کو بلوا کر رہا کر دیا ۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا بیان ہے کہ :-

”اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان کی سلطنت میں ہم نے چند روز اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک دیکھ لی تھی ۔ جس طرح وہ اپنے وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے ۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا ۔ ہم ان کی پرائیویٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے ۔ ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا ۔ ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا ۔ جو قبول نہیں فرمایا ۔ ہم نے کوئی سفارش نہیں کی ۔ جو رد کی گئی ہو ۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ۔ ہم نے افغانستان کے استقلال و استحکام کیلئے بھی کیا“ (آپ بیتی نمبر نقوش)

دَورِ سیاحت

عالم اسلام کا اتحاد بھی چونکہ آپ کے پروگرام میں شامل تھا۔ اس لئے ۱۹۲۳ء میں روس کی سات ماہ کی سیاحت کر کے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ قرار دیا اور اسے لادینی اثرات سے محفوظ رکھنے کی تدابیر سوچتے رہے۔ پھر ترکیہ جانے کا ارادہ کیا۔ تو ترکی اور روس کی سفارت خارجہ نے ترکی جانے کے لئے ایک ایسا راستہ متعین کر دیا۔ جس پر برطانوی کارندوں یا جاسوسوں کی رسائی ممکن نہ تھی۔ وہاں آپ دو سال رہ کر تحریک اتحاد اسلامی کا مطالعہ کرتے رہے اور پھر اپنی پارٹی کا منشور چھاپ دیا۔ جس میں آپ کی مذہبی تحریک پر کوئی آنچ نہ آتی تھی اور جس کا مقصد یورپ کو حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی قلبی خواہش کے مطابق اسلام سے متعارف کرانا تھا۔ وہاں سے پھر آپ ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ کی مؤتمر خلافت میں شرکت کے لئے پہنچ گئے۔ جہاں ۱۲، ۱۳ سال رہ کر علمائے مکہ سے استفادہ کرتے رہے۔ اپنا علمی مشغلہ اور مطالعہ جاری رکھا۔ اور اکابرینِ ملت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مولانا رفیع الدین دہلوی۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی معروف تصنیفات کا مطالعہ فرماتے رہے اور ساتھ ساتھ سلسلۂ تدریس بھی جاری رہا۔ جس سے خلق خدا کو بہت فائدہ پہنچا۔ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آئے۔ اور اس بات کا تہیہ کر لیا کہ اب امام ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفہ کی تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ اعلیٰ طبقہ کو اسکی طرف متوجہ کریں گے اور جب کبھی حالات سازگار ہوئے۔ تو فلسفہ ولی اللٰہی کی روشنی میں کانگرس کے اندر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کریں گے۔

غیر ممالک میں رہتے ہوئے وہاں کی حکومت اور حالات کے تقاضوں کو بھی مصلحتہً پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ قیام افغانستان کے دوران غازی انور پاشا کی طرح ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان شاہِ افغانستان نے بھی آپ کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ آزادی ہند کا مطالبہ متحدہ ہو۔ کیونکہ شاہ موصوف کو عالمِ اسلام کے اتحاد

سے زیادہ اہل ہند کا اتحاد عزیز تھا۔ جس پر مولانا عبیداللہ سندھی مجبوراً وہاں انڈین نیشنل کانگرس کے داعی بن گئے اور امیر امان اللہ خان کے زمانہ میں تو بیرونِ ہند بلکہ برٹش ایمپائر کے باہر آپ نے کابل میں خود ہی کانگرس کمیٹی قائم کرلی اور اسکے آپ صدر رہے۔

خدائی فوج

آپ جب تک دیوبند یا دہلی رہے۔ حکومتی جاسوس سایہ کی طرح آپ کے ساتھ رہتے تھے اور کراماً کاتبین کی طرح آپ کا اعمالنامہ تیار کرتے رہتے تھے۔ ۱۵ر اگست ۱۹۱۵ء کو آپ ہندوستان سے کابل پہنچے اور پورے چوبیس ۲۴ سال جہاں گردی کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں آپ کو ہندوستان آنے کی اجازت ملی۔ اس عرصہ میں حکومتِ برطانیہ کی عالمی سی۔ آئی۔ ڈی حتی الوسع ہمزاد کی طرح کہیں کہیں ساتھ رہی اور آپ کو سرکاری ریکارڈ میں مغرور دکھایا گیا۔ کیونکہ آپ ہندوستان سے افغانستان ہجرت کر گئے تھے۔ انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں موجود سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹوں سے بھی آپ کے مجاہدانہ کارناموں پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ آپ ہی ریشمی خطوط کے کاتب تھے۔ اور ان رپورٹوں کے مطابق آپ کو مہندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ کا تعاون حاصل تھا۔ جو قیصر جرمنی اور سلطان ترکی سے اس امر کے خطوط لائے تھے کہ افغانستان کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ روسی ترکستان۔ قسطنطنیہ اور برلن کو برطانیہ کے خلاف مشن بھیجے گئے اور ہندوستانی سازشیوں کو کابل سے ریشمی خطوط لکھے گئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے جنود ربانیہ کے نام سے جو تنظیم قائم کی تھی۔ اس ڈائری کی رو سے اسکا یہ مقصد تھا۔

> "اس سازش کے اراکین کو "جنود ربانیہ" (خدائی فوج) نام دیا گیا تھا اس کے تمام اراکین کو فوجی عہدے دینا اور مدینہ کو اس کا خاص مرکز بنانا طے پایا تھا۔ جہاں دیوبند کے مولوی حسن محمود کو القائد یعنی جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ اسکے ثانوی مراکز استنبول۔ تہران اور کابل تھے۔ کابل میں مولوی عبیداللہ

کو قائم مقام جنرل مقرر کیا گیا تھا۔

اس فوج کا مقصد کافروں کے تحت حکومت، ممالک اسلامیہ بالخصوص ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے سلاطین اسلامیہ کو متحد کرنا تھا۔ مولانا محمود حسن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ حجاز کے ذریعہ خلافت عثمانیہ سے رابطہ قائم کریں اور اس حکومت کو چند شرطیں ماننے پر آمادہ کریں۔ جن کے پورے ہونے پر حکومت افغانستان، برطانیہ سے برسرِ جنگ ہو جائے گی۔ اس فوج کے جو افسران کابل میں تھے۔ ان کے ذمہ تھا کہ وہ بھی اسی مقصد کے لئے افغانستان کے اینٹی برٹش عناصر سے جوڑ توڑ کرتے رہیں۔ اور آزاد قبائل میں برطانیہ کے خلاف ہر وقت دشمنی اور عداوت کے جذبات کو مشتعل کرتے رہیں۔

ہندوستان میں جو سازشی موجود تھے۔ ان کا کام روپیہ جمع کرنا تھا تاکہ کابل ہندوستان اور حجاز میں سازش کے مصارف پورے ہو سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی جنون کو اتنا زیادہ بڑھا دینا تھا کہ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان جنگ چھڑتے ہی وہ بھڑک کر ہر طرف آگ لگا دیں۔

اس فوج کے افسروں کی ایک فہرست (ریشمی) خطوط کے ساتھ منسلک تھی۔ جس سے ظاہر ہو گیا کہ سازش کی ہدایت کرنے والی طاقت عبیداللہ کی تھی...... جس کے کٹر متعصب جنونی دوست، پیرو اور رشتہ دار سندھ میں تھے۔ اور ان کے رابطے ہندوستان کے سب حصوں میں تھے۔

مختصر یہ کہ عبیداللہ کی سکیم یہ تھی کہ ہندوستان میں اسلامی عسکریت کی سوکھی ہڈیوں میں سے، جن اجسام میں زندگی کی رمق باقی ہے ان

سے کام لیا جائے۔ اس کا مزید منصوبہ یہ تھا کہ دوسری سازشی جماعت (حکومت موقتہ ہند) کے پہلو بہ پہلو کام کیا جائے۔ تاکہ ہندوؤں کے انقلاب پسند عناصر کی آپ کو تائید حاصل رہے۔"

(تحریک شیخ الہند صہ ۲۳۶ تا صہ ۲۳۹)

وسعتِ نظر

مولانا عبیداللہ سندھی اس وقت افغانستان سے روس پہنچے۔ جب لینن وہاں اشتراکیت کی بنیادیں استوار کر رہا تھا۔ آپ وہاں لینن کو ملے بغیر دو سال تک اشتراکیت کی نشوونما کا مطالعہ کرتے رہے۔ آپ سوویت روس میں نیشنل کانگرس کے تعلق کی وجہ سے سوویٹ روس کے معزز مہمان کی حیثیت سے رہے۔ ان دنوں لینن اتنے بیمار تھے کہ اپنے دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتے تھے۔ اس لئے آپ کی اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اشتراکی نظام کے نشیب و فراز اور ظاہر و باطن کا جائزہ لینے کے بعد ترکی پہنچے۔ جہاں آپ تین سال رہ کر اتاترک کے مذہب بیزار بلکہ مذہب کش "کمالات" کا مشاہدہ کرتے رہے۔ جن کے ذریعہ وہاں معاشرہ سے مذہب کو بے دخل کر کے لادینی رائج کر دی گئی۔ وہاں سے آپ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے چکر کاٹتے ہوئے حجاز پہنچے۔ وہاں ۱۲ - ۱۳ سال رہ کر مغربی دنیا کے مشاہدات اور ولی اللّٰہی تعلیمات کی روشنی میں اسلامیانِ ہند کی زبوں حالی کا حل سوچتے رہے اور بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچے جس پر شاہ ولی اللہ دہلوی اور سر سید احمد خان پہنچے تھے اور جس کو مسلمانوں کے عظیم دینی مراکز دیوبند۔ اعظم گڑھ اور ندوہ کے رہنماؤں نے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ اگرچہ سید سلیمان ندوی کو مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی کا احساس تھا۔ جس کی وجہ سے آپ اپنے مؤقر جریدہ "معارف" میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ:-

"دنیائے اسلام کے انقلابِ ذہنی کا ایک اور نتیجہ اقتصادیات کی طرف توجہ ہے۔ اب تک آزاد دنیائے اسلام کی زندگی کا سہارا صرف تلوار تھی

مگر اس جنگِ عظیم میں اس کو نظر آ گیا کہ تلوار سے بھی زیادہ تیز مہلک ہتھیار ہے۔ جس کا نام "قومی دولت" ہے۔ اس قومی دولت کے حصول کے تین ذرائع ہیں۔ زراعت۔ تجارت اور صنعت۔ ان محسوس اور بیّن طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ حقیقت مسلمانانِ عالم کے ذہن نشین ہو گئی ہے کہ ان ذرائع سہ گانہ کے بغیر ان کی زندگی معرضِ خطر میں ہے۔ اور آزاد ہونے کے باوجود وہ یورپ کے غلام رہیں گے"

مگر اس گتھی کا کوئی حل پیش نہ کیا گیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نظریات اور مغربی دنیا کے مشاہدات و تاثرات کی بنا پر قوم کے سامنے اس دور کی اقتصادی مشکلات کا یہ حل پیش کر کے علماء دین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم زندگی کے اساس کی حیثیت دیں۔ لیکن یہ نہ سمجھیں کہ سائنس نے ساری زندگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ بے شک سائنس نے مادی دنیا میں جو انکشافات کئے ہیں۔ وہ سب صحیح ہیں۔ لیکن زندگی صرف مادہ تک ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ مادہ کسی اور وجود کا پرتو ہے اور اس وجود کا مرکز ایک اور ذات ہے جو خود زندگی ہے اور زندگی کا سہارا اور باعث بھی ..... زندگی کا مادی تصورِ حیات اس لحاظ سے ناقص ہے کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن زندگی کا صحیح اور مکمل تصوّر "اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ" ہے اور یہی تصور ہے۔ جو زندگی کی ساری مادی کائنات پر حاوی ہو سکتا ہے"

اس سے مولانا عبیداللہ سندھی کی وسعتِ نظر اور ہمت و جرأت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے مکتبِ فکر کے نظریات کو نظر انداز کر کے قوم کو صحیح راہ دکھا دی جو مادی ترقی کو کوئی

اہمیت نہ دیتی تھی۔ اور سارا زور روحانی ترقی پر دیتی تھی۔ حالانکہ انسانی زندگی کے ارتقار کے لئے مادی ترقی بھی اتنی ضروری ہے۔ جتنی روحانی۔ اسی لئے قرآن کریم نے پہلے حسنة الدنیا پر زور دیا ہے اور پھر حسنة الآخرہ پر!

آپ مادی ترقی دینِ متین کی حدود و قیود کے اندر چاہتے تھے اور صاف فرمایا کرتے تھے کہ:-

"مسلمانوں کی فلاح اس میں ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں اور محمدؐ عربی کی طرف پھر سے لوٹ جائیں۔ محض مادی ترقی ہمارے امراض کا مداوا نہیں کر سکتی"۔

(عظمتِ رفتہ صد ۱۱۷)

کتاب وسنت کے خلاف بدعات آپ کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ ہر معاملہ میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ سیرت کے جلسوں کا ان کے زمانے میں بھی رواج تھا۔ جواب سرکاری طور پر رواج عام میں بدل دیا گیا ہے۔ سیرت نبوی کی ان تقریبات کے سلسلہ میں فرمایا:-

"زمانۂ حال میں مجالس ہائے سیرت کا نظام بھی ایک قسم کا خواب آور نشہ ہے۔ جو عوام کو پلایا جا رہا ہے۔ تحریک کو چلانے والے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر جن لوگوں نے ان کو یہ لقمہ دیا۔ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دماغ میں یہ خیال جمالیں کہ اسلام کی تمام اثر آفرینی قرآن کی بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شخصیت میں مضمر ہے۔ اگر آئندہ بھی کوئی ایسی شخصیت بروئے کار آگئی۔ تو ممکن ہے یہ اثر دوبارہ پیدا ہو سکے"۔

عادات وخصائل

مولانا عبید اللہ سندھی انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سر سے ہمیشہ ننگے رہتے تھے۔ جب آپ سے اس کی وجہ

پوچھی گئی تو لال قلعہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ غصّہ اور کچھ حسرت کے ملے جلے لہجہ میں فرمایا:۔

"میری ٹوپی تو اس دن سر سے اتر گئی۔ جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا اب جب تک یہ مجھ کو واپس نہیں مل جاتا۔ میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ مَیں ٹوپی سر پر رکھوں"۔

جب آپ سے پوچھا گیا کہ حضرت کبھی آپ نے اپنی زندگی میں نوکر بھی رکھا ہے؟ حسبِ عادت بپھر کر بولے:۔

"آپ یہ کیا پوچھتے ہیں۔ کیا کوئی انسان بھی کسی انسان کا نوکر ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک انسان دوسرے کی مدد کر سکتا ہے۔ میری خدمت بھی میرے دوست احباب کرتے تھے اور مَیں ان کی خدمت کرتا تھا"۔

آپ سے پھر سوال کیا گیا کہ تیس برس کی جلاوطنی میں آپ پر عیش و مسرت کے بھی کچھ دن آئے؟ تو فرمایا:۔

"یقین کیجئے کہ اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے۔ جس میں چین و آرام سے سویا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے پر تیس۳۰ برس کے بعد میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکا ہوں"۔

مولانا کے علم و فضل اور مجاہدانہ کارناموں کے چرچے زبان زدِ خلائق تھے اور لوگ ان کے دیدار کو ترسا کرتے تھے۔ جب آپ کی مراجعتِ ہند کی خبر آئی تو لوگ بڑی بے چینی سے آپ کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ آپ کے مشتاقانِ دید میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان دہلی بھی شامل تھے۔ وہ اپنا آنکھوں دیکھا حال یوں لکھتے ہیں:۔

شانِ قلندری

"۱۹۳۹ء میں اچانک سنا کہ مولانا تیس برس کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان تشریف لا رہے ہیں اور جہاز سے کراچی اتر کر سیدھے دلی تشریف لائیں گے۔ اب ایک ایک گھڑی گننی شروع کر دی۔

اور مولانا کی آمد کا سخت بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ ہم سب لوگ مولانا کے استقبال کے لئے دلی اسٹیشن پر پہنچے۔ علماء اور ملک کے زعماء جس طرح رہتے تھے۔ اس کے پیش نظر اس وقت میں نے مولانا کی نسبت جو تخیّل قائم کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ سر پر عمامہ ہوگا۔ جبہ زیب تن ہوگا۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم از کم ہمراہ ضرور ہوگا۔ دو تین بھاری بھاری سوٹ کیس۔ ایک بھاری بیڈنگ۔ دو تین تھرماس کی بوتلیں۔ تین چار بھاری اور وزنی ناشتہ دان ساتھ ہوں گے۔ چہرہ پر تمکنت اور وقار ہوگا۔ لیکن جب ٹرین پہنچی تو یہ تمام تخیلات اوہام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درجوں میں گھورتے پھر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا۔ ایک صاحب ننگے سر۔ صرف کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنے اور ایک سفید کھدر کی چادر گلے میں ڈالے ہوئے ایک دم میں تھرڈ کلاس سے پھدک کر پلیٹ فارم پر آکھڑے ہوئے۔ پہچاننے والوں نے پہچانا اور ان کی طرف لپکنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا یہی مولانا عبیداللہ سندھی ہیں۔ سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے۔ عمر ۶۵-۷۰ سال کے درمیان ہوگی۔ مگر جسم مضبوط اور ٹھکا ہوا۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیشانی پر مجاہدانہ عزم و ہمت کے کس بل۔ آواز میں طنطنہ۔ اور چہرہ پر بزرگانہ معصومیت کے ساتھ ایک ایسا جلال کہ گویا ایک سپاہی، ایک میدانِ جنگ سے منتقل ہو کر ایک دوسرے میدانِ جنگ کی طرف آگیا ہے اور اسی نے ایک دوسرا اور نیا مورچہ سنبھال لیا ہے۔

لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان اتاریں۔ مگر وہاں سامان کہاں تھا۔ جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا۔ وہی ان کا سامان تھا اور باقی خدا کا نام۔ میں نے

دنیا میں علماء بھی دیکھے ہیں۔ تارکینِ دنیا بھی دیکھے ہیں اور کسانوں اور مزدوروں کے غم میں مرنے والے بھی۔ لیکن دنیا اور اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی۔ بے نیازی اور مکمل قسم کا قلندر آج تک نہ کوئی دیکھا ہے اور نہ شاید دیکھوں گا۔"

بے سرو سامانی

"دلّی پہنچنے کے بعد مولانا نے ابتداً قیام جامعہ ملّیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں کیا تھا۔ یہ جگہ میرے پڑوس میں تھی۔ اس لئے مغرب کے بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حسبِ معمول حاضر ہوا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں رخصت ہوا تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرہ سے نکل آئے اور سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک موٹر کار ہمارے پاس آکر رکی۔ موٹر کار کا دروازہ کھلا تو اس میں سے کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون باہر نکلے۔ انہوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے۔ جس کے لئے آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ مولانا نے پوچھا کب؟ سیٹھ صاحب نے کہا! بس ابھی!! سیٹھ صاحب کا کہنا تھا کہ مولانا فوراً لپک ان کے ساتھ موٹر میں روانہ ہو گئے۔ نہ کمرہ میں واپس گئے۔ نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کمرہ کا دروازہ بند کیا۔ مَیں ان کے اس انداز پر حیران رہ گیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا کمرہ میں واپس جاتے بھی تو لیتے کیا؟ وہاں ان کا سامان تھا ہی کیا؟ وہاں جو بستر پڑا ہوا تھا یا کچھ برتن تھے۔ تو وہ جامعہ کے مہمان خانہ کے تھے۔ مولانا کا کچھ نہ تھا۔

قرول باغ کے مہمان خانہ میں چند روز قیام فرمانے کے بعد مولانا جامعہ نگر

اوکھلا میں منتقل ہو گئے۔ اس زمانہ میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پابندی کے ساتھ اوکھلے سے آکر دلّی کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلّی کی آمد و رفت کا بس کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہ تھے۔ گرمیوں کا مہینہ تھا۔ مولانا اس روز سخت تپش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے سے دلّی پا پیادہ آئے اور اسی طرح آٹھ میل پا پیادہ واپس تشریف لے گئے اور ارباب شرقیہ میں تشریف لاکر حسب معمول حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا۔ اس وقت چہرہ پر نہ تکان کا کوئی اثر تھا۔ نہ آواز میں کسی قسم کا اضمحلال اور ضعف۔ کمال بشاشت اور توانائی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضر حواسی کے ساتھ حصہ لیا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہو گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مَیں کسی ضرورت سے چتلی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک بھٹیارہ کی دُکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ کھانا بھی بہت معمولی۔ یعنی دو آنے کا سالن۔ ایک آنہ کی روٹی۔ مَیں نے کہا حضرت یہ بے وقت کا کھانا کیسا؟ فرمایا اوکھلے میں کھانا تیار نہ تھا۔ اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس لئے کھانا کھائے بغیر ہی چلا آیا تھا اور چونکہ جیب میں صرف تین آنہ پیسے تھے جو بس کے کرایہ کے لئے کافی نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلّی تک کا سفر پیدل کیا۔"

یہ شانِ قلندری اور حسنِ استغنا آج تک کسی لیڈر۔ کسی رہنما اور کسی رہبر کا دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا۔ آپ جن دنوں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ وہاں بھی آپ کا کوئی مستقل

ذریعہ روزگار نہ تھا۔ فرماتے تھے :۔

"زندگی بھر کبھی پیسے کے لئے کام نہیں کیا جو کچھ کیا اپنے عقیدے میں اللہ کے لئے کیا اور اللہ کھانے پینے کو دیتا رہا۔ ایک دفعہ مکہ میں ایک دو روز کچھ کھانے کو نہ ملا ۔ اس لئے عزیز احمد[1] کو کہا کہ میں خانہ کعبہ جاتا ہوں۔ خاطر جمع رکھو۔ خدا تعالیٰ کچھ انتظام کر دے گا۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد عزیز احمد پہنچا اور اطلاع دی کہ کوئی صاحب آئے تھے اور کچھ رقم دے گئے ہیں "

(افادات و ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی ص۴۶-۲۵)

اثرِ تربیت

یہ تمام تر اثر اس دینی تعلیم و تربیت کا تھا۔ جو ابتداً آپ نے حاصل کی ۔ روس کے قیام کے دوران آپ سوشلزم یا کمیونزم سے بیحد متاثر ہوئے ۔ اور مختلف مجالس میں آپ نے دین کے دائرے کے اندر رہ کر سوشلزم کو اپنانے کی بھی باتیں کیں ۔ لیکن مجموعی طور پر دینی تعلیم و تربیت کا اثر اتنا غالب رہا کہ آپ کمیونزم کا شکار نہیں ہو سکے ۔ جبکا آپ نے خود ان الفاظ میں اعتراف کیا :۔

" یہ واقعہ ہے کہ مجھ میں ایک انارکسٹ کے طبعی رجحان موجود ہیں ۔ اگر میری خاص قسم کی دینی تربیت نہ ہوتی اور میں ماسکو نہ جاتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ میں دو تین ساتھی اکٹھے کر کے بم مارنے کو اپنا مقصد بنا لیتا ۔ افغانستان میں ناکامیوں اور مایوسیوں کو دیکھنے کے بعد عین ممکن تھا کہ میں ایک دہشت پسند بن جاتا ۔ اور ایک انارکسٹ کی طرح بم مار کر دل کی بھڑاس نکالا کرتا ۔ لیکن ماسکو جا کر مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ تشدد اور دہشت گردی

---

[1] آپکے قریبی عزیز اور مولانا احمد علی لاہوری کے چھوٹے بھائی جو تمام عمر آپکے ساتھ رہے۔

کے ذریعہ ایک نظام کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی جگہ نیا نظام لانے کے لئے ایک پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انقلاب ایک پارٹی ہی کو کرنا چاہیئے۔ جو پہلے نظام کو تباہ کرکے اس کی جگہ ایک نیا نظام لائے۔ چنانچہ مجھ میں جو انارکزم و نراج کے رجحانات تھے۔ اس طرح وہ تعمیری فکر کی راہ پر پڑ گئے ''

(افادات و ملفوظات صہ ۲۷۸)

چونکہ موجودہ نسل کی دینی بنیادوں پر تعلیم و تربیت نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ بآسانی سوشلزم اور کمیونزم کا شکار ہو رہی ہے۔ اپنے دین اسلام سے عملاً منحرف ہو رہی ہے اور صرف برائے نام مسلمان شمار ہو رہی ہے۔

سرمایۂ عبرت پاکستان تو دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنے اور دنیا کے سامنے اس کی مثال پیش کرنے کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ بعد ازاں پاکستان میں جو صورتِ حال پیدا کی گئی۔ اس کا نقشہ مولانا سندھی ۱۹۴۳ء میں ہی کھینچ کر رکھ گئے تھے اور اربابِ اقتدار پر بڑی وضاحت سے یہ حقیقت آشکار کر گئے تھے کہ :-

" یہ گھروندے جو تم نے بنا رکھے ہیں اور انہیں تم فلک الافلاک سے بلند سمجھتے ہو، یہ گھروندے زمانے کے ہاتھ سے اب نہیں بچ سکتے۔ تمہارا تمدن۔ تمہارا سماج۔ تمہارے افکار۔ تمہاری سیاست اور تمہاری معاشرت سب کھوکھلی ہو چکی ہے۔ تم اسے اسلامی تمدّن کہتے ہو۔ لیکن اس تمدن میں اسلام کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔ تم مذہب کا نام لیتے ہو۔ لیکن یہ مذہب محض تمہاری ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ مسلمان بنتے ہو تو اسلام کو سمجھو۔ یہ اسلام جسے تم اسلام کہتے ہو۔ یہ تو کفر

سے بھی بدتر ہے۔ تمہارے امیر جاہ پرست ہیں۔ حکمران شہوات میں پڑے ہیں اور غریب طبقے توہمات کا شکار ہو رہے ہیں۔ بدلو! ورنہ زمانہ تمہارا نشاں تک بھی نہ چھوڑے گا۔ سنبھلو!! ورنہ مٹا دیئے جاؤ گے"

(ایضاً صہ ۱۸)

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اربابِ اقتدار نے جب اپنی روش نہ بدلی تو مشرقی پاکستان کا اقتدار ان سے چھین لیا گیا۔ اس طرح مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ پیشین گوئی جزوی طور پر صحیح ثابت ہوئی۔ اگر اب بھی اس سے عبرت حاصل نہ کی گئی تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔

اسی ضمن میں مولانا سندھی ایک بہت بڑے پتہ کی بات یہ فرما گئے کہ:۔

" یہ جو تاریخ اسلام میں تم اکثر پڑھتے ہو کہ فلاں مُلحد تھا۔ فلاں زندیق تھا۔ فلاں نے اسلام کو یوں گزند پہنچایا۔ فلاں سے مسلمانوں کو یہ گزند پہنچا۔ وغیرہ وغیرہ تو یاد رکھو۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جو اپنے اپنے زمانے میں مروجہ مفاسد کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقے کے مفادات پر اس سے زد پڑتی تھی۔ چنانچہ اس کی طرف سے ان کے خلاف مذہبی حربہ استعمال کیا گیا اور اس کے جواب میں بھی مذہب ہی میدان میں آیا۔ اس طرح معاشرتی۔ سیاسی اور اقتصادی اصلاح کی کشمکش مذہبی کشمکش بن گئی اور ایک دوسرے کو ملحد اور زندیق ٹھہرایا گیا۔ اسلام میں مذہبی فرقوں کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ اور الحاد و زندقہ کا چکر یوں چلا"

(ایضاً)

دلی خواہش مولانا سندھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ:۔

" شاہ ولی اللہ کے فکر میں آفاقی وسعت ہے۔ عالمگیر انسانیت ہے۔ ازل سے لیکر ابد تک کے تمام فکری۔ ذہنی اور فلسفیانہ نظاموں کو ایک رشتے میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر اس وسعت اور بے کنار ہونے کے باوجود ولی اللٰہی فکر میں ترتیب ہے۔ نظم و باقاعدگی ہے۔ گویا کہ یہ ریاضی یا حساب کا کوئی مسئلہ ہے۔"

اسلئے بقول مولانا محمد اسماعیل :-

" مولانا سندھی مرحوم کی سب سے بڑی اور پاکیزہ تمنا یہ تھی کہ دینی مدارس میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت کی تعلیم ہو۔ علمائے کرام اسے اپنائیں اور اس کے مطالعہ اور اس کی تحقیق کا ان میں شغف پیدا ہو۔ مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ حکمت ولی اللہ ایک طرف اس دیوار کو جو قدیم اور جدید علوم کے درمیان انگریزی سیاست نے حائل کر دی ہے۔ ختم کر سکتی ہے اور دوسری طرف برعظیم کے مسلمانوں کو آج جس فکری رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس سے پوری ہو سکتی ہے۔"

(ایضاً صد ۱۱۳)

اس کی غرض و غایت کی وضاحت کے لئے جب مولانا مناظر احسن گیلانی نے آپ سے سوال کیا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں تو فرمایا :-

" مولوی بہت زیادہ پستی میں پڑے ہیں اور موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ بہت اوپر نکل گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مولوی کو کھینچ کر ذرا اوپر کروں اور تعلیم یافتہ طبقے کو اتنا ہی نیچے کر لوں تاکہ مولوی اور موجودہ تعلیم یافتہ مسلمان کو ایک سطح پر لے آؤں۔"

افسوس کہ آپ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

مفکّرانہ انداز مولانا عبید اللہ سندھی ان مفکرین میں سے تھے۔ جو انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ جو بڑی بے تعصبی سے، غور وخوض کے ساتھ ماضی کا مطالعہ کرتے تھے اور بڑی فراست و بصیرت کے ساتھ حال و مستقبل کے مسائل کا ایسا حل پیش کرتے تھے۔ جو انسان کو رسم پرستی کی دلدل سے نکال کر بڑی جرأت و جسارت کے ساتھ حقیقت شناسی کی راہ پر گامزن کر دیتے تھے۔ آپ ان مفکرین میں سے تھے۔ جن کے ذہن میں جمود نہیں تھا۔ وہ رسمی حد بندیوں سے آزاد ہو کر پیش آمدہ مسائل کا ایسا حل پیش کرتے تھے۔ جنھیں ابتداءً معاشرہ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ بلکہ ان پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے۔ اسے آزاد خیال کہہ کر اس کی عظمت سے انکار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انہیں دیوانہ و مجذوب قرار دیا جاتا ہے۔ مولانا سندھی کا شمار بھی اسی زمرہ میں کیا گیا۔ لیکن مستقبل نے ان کے نظریات یا پیش بینیوں اور پیشین گوئیوں کی تصدیق کر کے مولانا کو ایک بین الاقوامی مفکرؔ کی حیثیت سے اتنا اونچا مقام بخشا۔ جس پر مولانا ابوالکلام یا اس دور کے طبقہ علماء جمعیۃ سے کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ روس اور یورپ کی "سیر" نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ وہاں کے مشاہدات کی روشنی میں آپ نے ماضی کے حالات کا ایسا تجزیہ پیش کیا کہ اربابِ فکر و نظر انگشت بدنداں رہ گئے مثلاً کارل مارکس کے نظریہ کا پوسٹمارٹم کرتے ہوئے فرمایا:۔

"حکیم الہند امام ولی اللہ دھلویؒ کے چوتھے اصول کہ" کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلّی نہ برتا جائے"، کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکے۔ جب تک ہم نے یورپ جا کر سوشلزم کا مطالعہ نہیں کیا۔ جن رفقاء نے ہمیں اس مطالعہ میں مدد دی۔ وہ کارل مارکس کے متبع تھے۔ اس کے احترام میں ہمارے یہ رفقاء اس قدر مبالغہ کرتے

جس سے ہمیں تکلیف ہوتی۔ اس احترام اور فضیلت کا مدار وہ کارل مارکس کے اقتصادی نظام کو بتاتے ہیں۔ جب اس قسم کے انقلابی پروگرام کے تمام حصّے ہم نے حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف میں نہایت شرح و بسط سے پائے۔ جو کارل مارکس سے بہت پہلے گزرے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ ۱۷۶۲ء میں فوت ہوئے اور کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔"

پیشین گوئیاں

مولانا عبیداللہ سندھی چونکہ انقلابی ذہن رکھتے تھے اس لئے آپ حالات و واقعات کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کے بدلنے کے ساتھ اپنے فکر کا طریق اور محاذ بھی بدلتے رہتے تھے۔ مولانا ربع صدی کی جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد جب ۱۹۳۹ء میں متحدہ ہندوستان میں واپس آئے تو آپ نے آتے ہی جو پہلی خبر دی۔ وہ یہ تھی کہ:-

"ایک جنگِ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے۔ جس میں روس شریک ہوگا اور اگرچہ جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کی ہوگی۔ جس کا حلیف روس ہوگا۔ لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس ہی کی ہوگی۔"

(امروز ۲۲ اگست ۱۹۶۲ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے اس سوال پر کہ مولانا جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم الشان طاقت ہے اور اگر اٹلی اور جاپان روس کے حلیف ہوگئے۔ تو کیا یہ سب مل ملا کر بھی فتح حاصل نہ کر سکیں گے؟ مولانا نے اپنی عادت کے مطابق بڑی جلالی شان سے میز پر مکہ مار کر فرمایا:-

"جرمنی! اگر اس نے روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائے گا۔ ہٹلر

اور میسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔"

جب آپ سے اس جنگ میں امریکہ اور برطانیہ کے انجام کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ :-

"تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اٹلی اور جرمنی کا نظام فاشسٹ ہے۔ امریکہ اور برطانیہ میں جمہوریت قائم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے۔ لیکن بہر حال فاشسزم کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ روسی نظام کمیونزم ہے۔ جو آئندہ چل کر تاریخ اور وقت کے طبعی تقاضے کے باعث ساری دنیا کا نظام بننے والا ہے۔ اس ترتیب کے اعتبار سے ہونا یہ چاہیئے کہ پہلے فاشسزم ختم ہو۔ جو ان تینوں میں سب سے زیادہ بُرا نظام ہے۔ اس کے بعد سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کمیونزم میں جنگ ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں سے جو صالح تر نظام ہوگا، وہ باقی رہ جائے گا اور اسکا حریف ختم ہو جائے گا۔"

موازنۂ بصیرت

آپ کی یہ "مجذوبانہ بڑ" چند ماہ بعد اس وقت حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگئی جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اور ہٹلر کی فوجیں برق و باران کی طرح مشرقی یورپ کے جس ملک کا رخ کرتیں۔ اسے اپنے پاؤں میں سرنگوں پاتیں۔ بروز اتوار ۲۲ر جون ۱۹۴۱ء کو دن کے تین بج کر پانچ منٹ پر ہٹلر نے اعلانِ جنگ کر کے سویٹ روس کے خلاف اعلان جنگ کیا تو ۲۵ر جون کے "نیوز کرانیکل" نے امریکہ کے ایک نامور فوجی ماہر میجر فیلڈنگ کا یہ باوثوق بیان شائع کیا کہ "روس کی فوجی اور فضائی طاقت ہمیں معلوم ہے۔ اس لئے روس کی سرخ فوج جرمنی کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکے گی۔" خود اسی اخبار نے اپنے اداریہ میں یہانتک کہ جرمنی کے مقابلہ میں روس کی شکست یقینی ہے۔

یہ جنگ زیادہ سے زیادہ موسم خزاں تک چلے گی۔" ڈین آف کنٹربری نے بھی یہی لکھا کہ سرخ فوج کو مکمل شکست ہو گی اور سوویٹ یونین بالکل تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ ۶ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو ماسکو خطرہ میں آچکا تھا اور ماسکو گورنمنٹ وہاں سے بھاگ چکی تھی۔

عین ان دنوں جب جرمنی کی فوجیں ماسکو کے دروازہ پر دستک دے رہی تھیں۔ مولانا سندھی پھرتے پھراتے ماہنامہ "برہان" کے دفتر میں جا پہنچے۔ وہاں آپ سے پھر یہ سوال ہوا کہ اب تو ہٹلر کی فتح یقینی ہے تو آپ نے شیر کی طرح بپھر کر فرمایا:۔

"روس کو ہرگز شکست نہیں ہو سکتی۔ غریب ہٹلر کو یا کسی کو پتہ بھی نہیں کہ روس کی ریزرو فوج کتنی کچھ اور کہاں کہاں ہے۔ سائبیریا کے پہاڑوں میں ان کے میگزین ہیں۔ جن کو ہوا تک نہیں لگی۔ یہ پسپائی تو روس کا ایک خاص طریقۂ جنگ ہے۔ اور ایک فوجی چال کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔ جرمن فوجیں اسٹالن گراڈ تک اسی طرح بڑھتی چلی جاویں گی۔ لیکن پھر وہاں سے پسپا ہونا شروع ہوں گی اور سیدھی برلن میں جا کر رکیں گی۔ جہاں ہٹلر اور اس کی حکومت کی موت کی آخری رسم ادا کی جائے گی۔"

مولانا سندھی نے یہ پیشین گوئی اتنے یتقین کے ساتھ فرمائی کہ سب ایک دوسرے کا اس انداز سے منہ تکنے لگے۔ جیسے یہ شخص پاگل ہے اور بے تکی ہانک رہا ہے۔ لیکن جنگ کے نتیجہ نے فیصلہ مولانا سندھی کے ارشاد کے مطابق دیا۔ مومن اور کافر کی فراست و بصیرت کا یہی تو فرق ہے کہ بقول سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم "مومن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ زمان و مکان اس کی نظر کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ صدیوں بعد آنیوالے واقعات کو اس طرح دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جیسے یہ ان کے درمیان موجود ہے۔ لیکن ایک غیر مسلم خواہ وہ کتنی بلند فکر و نظر رکھتا ہو۔ اس مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ جیسا کہ متذکرہ بالا موازنہ سے عیاں ہے۔

فوجی امداد دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں یعنی کانگرس، مسلم لیگ اور جمیعۃ العلمار وغیرہ نے جنگ میں ہر قسم کی اخلاقی۔ مالی اور جانی قربانی نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مولانا سندھی نے اس فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے حکومت کو مدد دینے کی تلقین کی اور اپنے شاگردوں کو بالعموم اور کرنل خواجہ عبدالرشید کو بالخصوص مجبور کر کے فوج میں بھیجا۔ جس پر آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ ایک ظالم حکومت کی کیوں امداد کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔

"میں حکومت کا نہیں بلکہ اپنے ملک کا ہمدرد ہوں۔ اس جنگ کے بعد ہندوستان کا آزاد ہونا یقینی ہے۔ اگر انگریز جیت بھی گئے۔ تو وہ اقتصادی۔ فوجی اور انٹرنیشنل معاملات کی وجہ سے اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ ہندوستان پر اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکیں گے اور انہیں مجبور ہو کر ہمیں آزادی اور خود مختاری دینی پڑے گی۔ پس اگر یہ یقینی ہے۔ تو ہمیں ابھی سے نیشنل فوج اور قومی سول ایڈمنسٹریشن کا انتظام کرنا ہوگا اور ان کے لئے نوجوانوں کو تربیت دینی ہوگی۔ فوجی ٹریننگ اس سے بڑھ کر اور کہاں ہو سکتی ہے کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اپنے نوجوان فوج میں بھرتی کرائیں۔ فرض کرو ہم نے اس طرح ایک لاکھ نوجوان بھرتی کرائے۔ اور ان میں سے پچاس ہزار مر کھپ گئے۔ تو باقی جو پچاس ہزار بچیں گے۔ وہ تو آزاد ہند کی قومی فوج کے سپاہی ہوں گے۔ جن کے بل بوتے پر ہم حکومت چلا سکیں گے۔ اگر اس کے برخلاف جنگ میں عدم تعاون کی منفی پالیسی پر عمل کیا۔ تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ کل جب ہم کو آزادی ملے گی تو حکومت کی مشین چلانے کے لئے ہمیں انہی تمام زنگ آلود پرزوں سے کام لینا پڑے گا۔ جن سے آج انگریزی حکومت کی مشین چل رہی ہے۔

اس لئے ملک کے سچے ہمدرد اور محب وطن اور صحیح الخیال نوجوان فوج میں بھرتی ہوں اور اس نیت اور جذبہ سے ملٹری تعلیم حاصل کریں کہ انہیں جلد ہی قومی فوج کی حیثیت سے ملک کی خدمت کرنی ہو گی۔"

(بحوالہ صدر)

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے کم فہم ارباب سیاست نے مولانا کو ٹوڈی۔ سرکاری پٹھو۔ کاسہ لیس۔ رجعت پسند غرض کہ جو کچھ منہ میں آیا۔ ان کو کہتے رہے۔ لیکن حقیقت بین نظریں مولانا سندھی کی دور رس نگاہوں کی داد دے رہی تھیں۔ اور بعد کے حالات نے مولانا سندھی کے مذکورہ بالا نظریہ کی حرف بحرف تائید و توثیق کر دی تھی۔



(۱۱)

قائدِ اعظم محمد علی جناح رح

معمارِ پاکستان

دراز قد ۔ باوقار چہرہ ۔ خوشنما ہاتھ ۔ رئیسانہ لباس ۔ پرکشش شخصیّت ۔ نحیف جسم ۔ طوفانی روح ۔ بطلِ حریت ۔ مجسمہ یقین ۔ انتھک انسان ۔ خوش بیان ۔ ملّت کا پاسبان ۔ مردم شناس قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ایسے وقت میں ملّتِ اسلامیہ کی عنانِ قیادت سنبھالی جب :۔

"مغلوں کے زوال اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمان ابدی نامرادی کے غار میں گر چکے تھے ۔ ان کی ذہنیت میں افسردگی رچ چکی تھی ۔ ان کے ارادوں کو تصوّف اور رہبانیت نے کچل ڈالا تھا ۔ ان کے ادب میں انسان کی اولوالعزمی کی بجائے دنیا کی بے ثباتی کا موضوع سما چکا تھا ۔ ان کی معاشرت بادشاہوں کے جائز و ناجائز وارثوں یعنی جاگیرداروں اور صاحبِ ثروت لوگوں کی اجارہ بن چکی تھی ۔ ان کی سیاست میں فرنگی بادشاہوں اور ان کے نمائندوں کی قصیدہ خوانی اور خوشامد کے سوا کچھ نہ تھا ۔ انہوں نے اپنے مذہب پر بھی ان گنت فرقوں نقلی پیروں اور جادوگروں کو مسلط کر رکھا تھا ۔ استبداد و استعمار کے خلاف بغاوت کرنے کو وہ سرپھروں کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے اور ان نشیبوں میں اتر چکے تھے ۔ جہاں زندگی محض ایک صدائے بازگشت اور موت ایک بے بہا حقیقت بن جاتی ہے اور جہاں انسان جان بوجھ کر بے احتیاطی سے شیشے کا برتن اٹھاتے ہوئے اسے توڑ بیٹھتا ہے تو کہتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی تھی" ۔

(نقوش)

ان ناگفتہ بہ حالات میں اس مرد مجاہد نے قوم کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے اس کے سامنے ایک مطمح نظر رکھا۔ اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعہ اس کے لئے قوم میں محبّت کا جذبہ اور جد وجہد کی قوت پیدا کی۔ مسلمانوں کو ہزیمت خوردگی۔ مایوسی اور بے چارگی کی دلدل سے نکالا۔ ان کے مٹتے ہوئے احساس خودی کو از سرِ نو زندہ کیا۔ ان کی قومی شخصیّت کو ایک نئی تاب وتوانائی بخشی۔ ان میں اتفاق و اتحاد اور فکر و عمل کا جذبہ پیدا کر کے اس قوم سے ٹکر لی۔ جسکی عالمگیر سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اس میں قائداعظم کی سیاست اور وکالت سے زیادہ ان کا ایمان وایقان اور فراست وبصیرت کارفرما تھی اور اس کے ساتھ انہیں تائیدایزدی حاصل تھی۔ جس کی بدولت انھوں نے اتنی عظیم سلطنت کے حکمرانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور ان مسلمانوں کو جن کے دل و دماغ ماؤف ہو چکے تھے۔ جن کے سیاستدان انہیں از کار رفتہ قرار دے چکے تھے اور جن کے جسم کے ٹکڑے غیر مسلموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ان کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا مالک بنا دیا۔

قوم کو اس منزل تک پہنچانے میں قائدِاعظم کو صدہا خطرات اور مشکلات پیش آئیں۔ مگر انھوں نے اپنا قدم کسی بھی مرحلہ پر پیچھے نہ ہٹایا۔ خدائے حکیم نے اس جسم ناتواں میں، اس مشتِ استخواں میں وہ قوت اور طاقت بھر دی تھی اور اسے اتنا مضبوط د قومی دل عطا کر دیا تھا کہ یہ نامساعد حالات میں بھی ہارنے۔ تھکنے، جھکنے کا نام لئے بغیر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ یہ غیر معمولی قوت، آپ کی صداقت و دیانت کی ایک کرامت تھی۔ مسلمانوں کے ضعف وزوال میں سیاسی فریب کاری و ریاکاری کی دنیا میں آپ مہدیِٔ زماں بن کر آئے اور یہ الفاظ کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے کہ :۔

"میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ اب مجھے مرنے کا کوئی رنج نہیں ہو گا۔ . . .
آپ کے پاس اب سب کچھ ہے۔ ایک آزاد اور خود مختار ملک، جس

میں آپ زندگی کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں۔ اب یہ کام نئی نسل کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کرے اور اسے مضبوط بنائے۔"

حسن آغاز

قائدِاعظم نے ابتدائً سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں قرآن شریف کے ساتھ ساتھ ابتدائی گجراتی تعلیم پائی۔ بعدازاں بمبئی چلے گئے۔ وہاں گوکل داس تیج پرائمری سکول اور انجمن اسلام میں کچھ عرصہ پڑھتے رہے۔ پھر واپس سندھ مدرسۃ الاسلام میں آگئے۔ جس کے صدر دروازہ پر یہ کتبہ لکھا ہوا تھا:۔

ENTER TO LEARN —— GO TO SERVE

یعنی علم حاصل کرنے کیلئے آؤ اور خدمت کرنے کے لئے جاؤ۔

خدمت کا جو جذبہ آپ نے اس مدرسہ سے پایا۔ اسی نے آپ کو بام شہرت پر پہنچایا۔ آپ کو شروع سے ہی محنت کی عادت تھی جس کا آپ یہ جواز بتلایا کرتے تھے کہ میں زیادہ اس لئے پڑھتا ہوں کہ مجھے ایک دن بڑا آدمی بننا ہے۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے سولہ سال کی عمر میں ہی انگلستان جانا پڑا۔ اس نوعمری میں آپ نے اپنے لئے جو تعلیم گاہ پسند کی۔ اس سے آپ کے طبعی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے وہاں اپنی تعلیم کے لئے "لنکن اِن" کو پسند کیا۔ کیونکہ اس کے صدر دروازہ پر دنیا کے جن عظیم قانون دانوں کی فہرست کندہ تھی۔ اس میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی اور اسم گرامی بھی موجود تھا۔ جس کی وجہ سے آپ نے اسی تعلیم گاہ کو پسند فرمایا۔ اس انتخاب لاجواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپکو طالب علمی کے زمانہ سے سرکارِ دو جہاںؐ سے گہری محبت۔ عقیدت اور وابستگی تھی۔ ورنہ عنفوانِ شباب میں ان باتوں کو کون اہمیت دیتا ہے۔

قائدِ اعظم کو اپنی ساری ہنگامہ خیز سیاسی زندگی میں پولیس والوں سے واسطہ نہ پڑا اور نہ قید و بند کی نوبت آئی۔ جس زمانہ میں سیاسی قیدیوں سے ملک بھر کے جیل خانے آباد کئے جا رہے تھے۔ ایک صاحب قائدِ اعظم سے بھی پوچھ بیٹھے کہ آپ بھی کبھی گرفتار ہوئے یا نہیں۔ تو آپ نے بتلایا کہ :۔

"جب میں انگلستان پڑھا کرتا تھا۔ تو ایک دفعہ مجھے لندن میں پولیس سے سابقہ پڑا۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک رات ہم کشتی رانی کے لئے گئے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک چھکڑا مل گیا۔ ہم سب دوست باری باری ایک دوسرے کو چھکڑے پر کھینچ رہے تھے کہ اتنے میں پولیس آگئی اور سب کو پولیس اسٹیشن لے گئی۔ لیکن انہوں نے مجھے کچھ نہ کہا اور بغیر کسی شرط کے گھر جانے کی اجازت دیدی"۔

(نقوش آپ بیتی نمبر)

یہ تائیدِ ایزدی کی نشانی تھی کہ قوم کا یہ سالار پاکستان کی چوتھی جنگ لڑے گا۔ ملت کی گاڑی کو تن تنہا اس طرح کھینچے گا کہ نہ کبھی پولیس کو اس پر دست درازی کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ اسے کبھی قانون شکنی کی پاداش میں جیل جانا پڑے گا۔ بلکہ یہ ہنگاموں۔ ہڑتالوں اور گرفتاریوں کے دور میں، ہر طرح مامون و مصئون رہیگا۔

جذبۂ حریت

قائدِ اعظم کے لئے انگلستان ایک عجیب ملک تھا۔ غیر مانوس لوگ اجنبی ماحول اور ناواقفیت کی وجہ سے پہلے تو آپ کچھ پریشان خاطر ہوئے۔ کچھ وہاں کی کہر۔ دھند اور شدت کی سردی نے پریشان کئے رکھا۔ مگر بہت جلد آپ کا وہاں دل لگ گیا اور آپ خوش و خرم اپنی پڑھائی میں مشغول رہنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسیات میں بھی دلچسپی لیتے رہے اور وہاں کی لبرل ازم سے بہت متاثر ہوئے۔ جسکا آپ نے ان الفاظ میں اظہار کیا :۔

"انگلستان میں مجھے لبرل ازم مکتبِ خیال کے بہت سے ممتاز رہنماؤں
سے ملنے کے مواقع ملے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس نظریئے کو سمجھنے لگا۔
اس وقت انگلستان میں لارڈ مورلے کے لبرل ازم کا سکہ چلتا تھا۔
میں نے انہی کے افکار و نظریات کو اپنایا اور یہ لبرلزم میرے رگ وپے
میں سرایت کر گئی۔ جس نے مجھے عجب خوشی اور مسرت کی کیفیت بخشی"۔

(بحوالہ صدر)

لبرلزم یا جذبۂ حریت کا جو سبق قائدِ اعظم انگریزوں سے سیکھ کر آئے۔ اسے اس خوبی کے ساتھ ان کے خلاف استعمال کیا کہ ان کو اپنی سلطنت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اور مسلمانوں کو اس جہادِ آزادی کی بدولت اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کا کچھ حصہ بھی مل گیا۔ جس پر مخالفین نے ناک بھویں چڑھائیں اور مذاق تک اڑایا۔ مگر قائدِ اعظم کے اس جواب نے سب کو لاجواب کر دیا کہ:-

"روٹی کا ایک ٹکڑا مل جانا اور اسے خوشی سے کھانا، اس سے بہتر ہے کہ
بالکل کچھ نہ ملے"۔

مولانا محمد علی جوہر کا خیال تھا کہ انگریز اہل ہند کی عسکری امداد سے عالم اسلام پر قابض ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا۔ تو مرکزِ اسلام حرمین شریفین بھی آزاد ہو سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور پورا مشرق وسطیٰ ان کے اثر و نفوذ سے آزاد ہو گیا اور حرمین شریفین میں اسلام کی صحیح حکومت قائم ہو گئی۔

عملی تربیت

لندن کا قیام قائدِ اعظم کے لئے بڑا مفید رہا۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے آجکل کی طرح وہاں کی ہوش ربا زندگی میں کھو جانے کی بجائے وہاں کے حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور اپنا کوئی لمحہ بھی خرافات میں ضائع نہ کیا۔ برٹش میوزیم لائبریری میں مطالعہ کے لئے باقاعدہ اجازت حاصل کر لی اور

اپنا زیادہ تر وقت وہاں مطالعہ میں صرف کرتے۔ اتوار کو دنیا کی مشہور جلسہ گاہ ہائیڈ پارک میں چلے جاتے اور وہاں حکومت پر لوگوں کی کڑی تنقیدیں سنتے۔ دارالعوام (اسمبلی) کے اجلاسوں میں بھی باقاعدگی کے ساتھ جا کر برطانوی مدبروں اور مفکروں کی تقریریں سنتے اور پارلیمانی آداب اور کارروائی کو ذہن نشین کرتے۔

آپ کے قیامِ انگلستان کے زمانہ میں ہی آپ نے طلباء کے مسائل میں دلچسپی لینی شروع کی۔ وہاں ہندوستانی طلباء کی کوئی تنظیم نہ تھی۔ نہ ہی ان کے درمیان کوئی رابطہ قائم تھا۔ آپ نے ان کی انجمن بنانا چاہی۔ مگر حسبِ توقع لڑکوں نے ساتھ نہ دیا۔ اس لیے اس وقت تو یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ لیکن جب جون ۱۹۱۳ء میں آپ ہندوستان کے نامور لیڈر مسٹر گوکھلے کے ساتھ انگلستان گئے تو آپ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گئے اور لندن کے کنگسٹن ہال میں ہندوستانی جماعت کی بنیاد رکھی۔

لندن کے قیام کے دوران آپ انگریزی زبان کے ادیبوں اور شاعروں کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہے شیکسپیئر سے آپ زیادہ متاثر تھے اور آپ نہ صرف اس کے تھیٹر میں جاتے رہے بلکہ اس کے ایک ڈرامہ میں حصہ لے کر اس دنیا میں بھی جھانک لیا۔ مگر آپ نے اس سے زیادہ اس میں دلچسپی نہ لی۔

اُسی زمانہ میں ہی بمبئی کے ممتاز پارسی لیڈر دادا بھائی نوروجی سنٹرل فنس بری کے حلقہ سے دارالعلوم کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ جو برطانوی دارالعوام کا انتخاب لڑ رہے تھے اور جن کے خلاف نفرت کی خلیج وسیع کرنے کے لئے لارڈ سالسبری وزیرِ اعظم برطانیہ نے اپنی ایک تقریر میں دادا بھائی کو کالا آدمی کہہ دیا تھا۔ اس سے ہندوستانی طلبار سخت مشتعل ہوئے۔ قائدِ اعظم اور دوسرے ہندوستانی طلبار نے بڑے جوش و خروش سے کام لے کر انہیں اس انتخاب میں کامیاب کرایا۔

اس طرح قائدِ اعظم کو نسلی بنیاد پر کام کرنے کا نہ صرف تجربہ ہو گیا بلکہ وہ ایک بہت بڑے لیڈر کے مقرب بن گئے۔

یہ اسی عملی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ قائدِ اعظم سیاست کے میدان میں ہندوؤں اور انگریزوں کو نیچا دکھانے اور خود عروس کامیابی سے ہمکنار ہونے میں بازی لے گئے۔

کانگرس میں شمولیت

متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کے ایماء پر ایک ریٹائرڈ انگریز افسر نے ہندوستان میں انگریزی راج کے بقاء اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ جسے ہندوؤں نے ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ تصوّر کیا۔ ۱۹۰۶ء میں کانگرس کے صدر دادا بھائی نوروجی تھے۔ اسی سال کانگرس نے اپنا نصب العین سوراجیہ قرار دیا یعنی برٹش گورنمنٹ کے زیرِ سایہ داخلی آزادی حاصل کرنا۔ جس سے متحدہ ہندوستان کی سیاست کا نیا دَور شروع ہوا۔ اس قرارداد کی تیاری میں دادا بھائی نوروجی کے اعزازی معتمد کی حیثیت سے قائدِ اعظم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اسی سال آپ کانگرس میں شامل ہو گئے۔

قائدِ اعظم بڑے نیک نیت انسان تھے۔ وہ انگریزی حکومت کے دل و جان سے مخالف تھے۔ اور جانتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد سے وہ انہیں چٹکی بجاتے ہندوستان سے باہر نکال سکتے ہیں۔ اس لئے آپ کانگرس میں شامل ہوئے تاکہ متحدہ کوششوں سے بدیشی حکومت سے مخلصی حاصل کی جائے۔ قائدِ اعظم نے کانگرس کی تن من دھن سے امداد کی اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بنانے کے لئے کوشاں رہے۔ جس کی وجہ سے آپ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر قرار دیئے گئے۔

اس زمانہ میں کانگرس میں ۷۵۶ ہندو اور صرف سترہ مسلمان تھے اور ہندو

اپنے خبثِ باطنی کی وجہ سے جب بھی موقعہ پاتے ۔ مسلم مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ۔ اسوقت قائدِ اعظم کانگرس کی بجائے مسلمانوں کے ترجمان بن کر ان کے حقوق کی حفاظت کرتے ۔ قائدِ اعظم بیس سال تک مسلسل کانگرس کے حامی و مددگار رہے ۔ آپ کانگرس کے معمولی ممبر نہ تھے ۔ بلکہ ہر ماہ اپنی جیب خاص سے کانگرس کو ایک ہزار روپیہ کی گرانقدر مالی امداد دیتے تھے ۔ لیکن جوں جوں کانگرس مسلم حقوق کو غصب کرنے کے لئے عیارانہ ہتھکنڈوں پر اترتی گئی ، قائدِ اعظم کا دل کانگرس سے کھٹا ہوتا گیا ۔ اور جب آپ کو یقین ہو گیا کہ کانگرس مسلم حقوق کو غصب کرنے پر تلی ہوئی ہے ۔ تو آپ کانگرس سے الگ ہو گئے ۔ مگر اس کے باوجود آپ ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے لئے کانگرس سے مخلصانہ تعاون کرتے رہے ۔

گاندھی کی عیّاری

یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو افقِ سیاست پر ایک نئی جماعت آل انڈیا ہوم رول لیگ اس دعویٰ کے ساتھ ابھری کہ ہندوستان کو فوری طور پر بلا شرط داخلی خود مختیاری یا ہوم رول دیا جائے ۔ یہ ان ترقی پسند نوجوانوں کی جماعت تھی ۔ جو کانگرس کی سُست روی سے نالاں تھے اِس جماعت کی قیادت کا سہرا مسز اینی بیسنٹ کے سر تھا ۔ جس نے اس جماعت کی ترجمانی کے لئے نیو انڈیا نامی روزنامہ بھی جاری کیا ۔ یہ نوزائیدہ ادارہ اتنی تیزی سے مقبولیت کی منزلیں طے کرنے لگا کہ حکومت نے اسے بریک لگانے کے لئے ۱۵ ، جنوری ۱۹۱۷ء کو مسز اینی بیسنٹ اور اسکے دو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ۔ جس سے اس کی مقبولیّت میں اور اضافہ ہوا ۔ قائدِ اعظم پہلے ہی ہندوستان کی آزادی کے لئے دل میں ایک سچی تڑپ رکھتے تھے ۔ اس لئے آپ ہوم رول لیگ میں شامل ہو کر بمبئی شاخ کے صدر بن گئے ۔ اور آپ نے میدانِ سیاست میں ہلچل مچا دی ۔ گاندھی نے اسے اپنی سیاسی موت تصوّر کرتے ہوئے ۔ پینترا بدلا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ ترک کر کے پہلی جنگِ عظیم

میں انگریزوں کی مدد کا اعلان کردیا۔ ہندوستانی باشندوں کو برطانوی مفاد کے تحفظ کے لئے فوج میں بھرتی کرانے کی مہم شروع کردی اور وائسرائے کو لکھا کہ:-

"سلطنت برطانیہ کے لئے عنقریب میں ہندوستان کے تمام تندرست افراد کی خدمات پیش کروں گا۔ مجھے انگریز قوم سے محبت ہے اور میں ہر ایک ہندوستانی کے دل میں انگریزوں سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہوں"

گاندھی نے یہ غداری اس وقت کی۔ جب ہوم رول لیگ کے رہنما اور سینکڑوں کارکن جیلوں میں بند تھے۔ گاندھی نے جنگی رضا کاروں کی بھرتی میں اتنی مدد دی کہ حکومت برطانیہ نے آپ کی وفا شعاری کی بنا پر آپ کو قیصرِ ہند کا تمغہ عطا کیا۔ مگر اس نازک موقعہ پر قائدِ اعظم نے غیر مشروط طور پر حکومت برطانیہ کی امداد کرنے سے صاف جواب دے دیا ہندو مسلم اتحاد اور حکومت خود اختیاری کی جدوجہد تیز کردی اور حکومت کو ببانگِ دہل یہ بتلا دیا کہ :-

"ہم اس وقت تک جنگ میں برطانیہ کی مدد نہ کریں گے۔ جب تک حکومت اس امر کی ضمانت نہ دے کہ میثاقِ لکھنؤ کے مطابق ہندوستان کے لئے مناسب و معقول اصلاحات نافذ کی جائیں گی"

(ہمارے قائدِ اعظم ص۵٦)

ہندو اور گاندھی انگریز کے سامنے جھکتا گیا۔ مگر قائدِ اعظم اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ جس کی وجہ سے ہوم رول لیگ کا رویہ دن بدن سخت ہوتا گیا۔ گورنر بمبئی لارڈ ولنگڈن اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا۔ جس کے خلاف ہوم رول لیگ کے پروگرام کے مطابق بمبئی میں پہلی بڑے پیمانہ پر ہڑتال ہوئی۔ قائدِ اعظم کی قیادت میں اس کے خلاف جلوس نکلے۔ انگریز نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کا قائد نہ دبنے والا ہے اور نہ اپنی راہ سے

ہٹنے والا ہے۔ تو اس نے ۱۹۱۷ء میں ہندوستان میں جلد سیاسی اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کر کے اس مردِ آہن سے اپنی جان چھڑائی اور نام نہاد "مہاتما" گاندھی کے ماتھے پر قیصرِ ہند کا کلنک ٹیکا لگا کر اسے ہمیشہ کے لئے ذلیل و رسوا کر دیا۔ قائدِ اعظم نے بڑے سے بڑا عہدہ۔ منصب۔ اعزاز اور خطاب قبول کرنے سے انکار کر کے انگریز کے دل میں اپنے لئے بہت بڑی عزت و عظمت حاصل کر لی۔ جو گاندھی کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوئی۔ اسی لئے مسٹر مانٹیگو وزیرِ ہند نے کہا تھا کہ قائدِ اعظم کے مقابلہ میں گاندھی غیر مؤثر شخصیت ہے۔

رولٹ ایکٹ

پہلی جنگِ عظیم کے دوران۔ کانگرس کے ارکان ملک بھر کے خطاب یافتگان اور انگریزوں کے بہی خواہاں نے حکومت برطانیہ کو اس کی توقعات سے بڑھ چڑھ کر جو مدد دی اسکا نتیجہ ان کی حسب خواہش برآمد نہ ہوا۔ حکومت برطانیہ نے نہ ان کی خواہشات کا احترام کیا اور نہ حکومت خود اختیاری دی۔ اس طوطا چشمی کو اہل ہند نے اپنی توہین تصور کیا۔ مسلم لیگ اور کانگرس نے متحدہ طور پر لکھنؤ میں اپنے مطالبات منوانے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ جو میثاق لکھنؤ کہلایا۔ اس کے ذریعہ حکومت پر زور ڈالا گیا کہ وہ ان کے مطالبات پورے کرے۔ اس تحریک کو بڑھتا دیکھ کر ایک طرف تو ۱۹۱۹ء میں اہلِ ہند کی اشک شوئی کے لئے مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا اور دوسری طرف ملک کی سیاسی تحاریک کو کچلنے کے لئے رولٹ ایکٹ کا رولر تیار کیا گیا۔ جس کی رو سے حکومت کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ جسے چاہے۔ جس وقت چاہے بلا دلیل، بلا وکیل جیل بھیج دے۔ اس بل کی سب جماعتوں نے مخالفت کی۔ قائدِ اعظم نے اسمبلی میں اس بل کی مخالفت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اسطرح اٹھایا ہے۔

جیسے کچھ جرائم پیشہ قبائل ہم میں دفعتہً رونما ہو گئے ہوں و. اب ضروری ہے کہ ایک قانون بنا کر ان کا صفایا اور قلع قمع کر دیا جائے۔ لیکن قانون بنانا مرض کا علاج نہیں۔ تمہیں (حکومت کو) اپنی پالیسی تبدیل کرنی چاہیئے۔ یہ مجرمانہ سازشیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اس کمیٹی نے (جو سر سڈنی رولٹ کی زیرِ صدارت تشکیل کی گئی تھی) ایسی سفارشات پیش کی ہیں۔ جنھیں کوئی مہذب حکومت قبول نہیں کر سکتی۔ بلکہ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر اسے قانون کی شکل دے دی گئی۔ تو سارے ملک میں اس سرے سے لیکر اس سرے تک ایک آگ لگ جائے گی"۔

جب اس تنقید و تنبیہہ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اسمبلی کے پاس کردہ رولٹ ایکٹ پر وائسرائے نے اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تو قائدِاعظم نے یہ کہتے ہوئے اسمبلی سے استعفی دے دیا کہ میں ایسی اسمبلی کا ممبر رہنا اپنی اور اپنی قوم کی توہین سمجھتا ہوں جو قانون سازی میں عوام کے جذبات کا خیال نہ رکھے۔ آپ نے جو استعفیٰ وائسرے کو بھیجا۔ اس میں تحریر تھا کہ:۔

"رولٹ ایکٹ کی منظوری اور اس پر آپ (وائسرائے) کی مہر تصدیق نے عوام کو برطانوی انصاف سے برگشتہ کر دیا ہے۔ انصاف اور معدلت کے بنیادی اصولوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا ہے اور قوم کے دستوری اور آئینی حق کو سوختت کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا میں اس فیصلہ اور حکومت کی اس روش کے خلاف احتجاج اور اظہار برہمی کے طور پر امپریل کونسل کی ممبری سے استعفی دیتا ہوں۔ ان حالات میں کوئی خود دار آدمی حکومت سے تعاون نہیں کر سکتا۔ ایسی حکومت سے جو ایوان آئین ساز

میں قوم کے منتخب شدہ نمائندوں کی آواز کو ٹھکرا دیتی ہو۔"

(۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء، از مالا بار ہل ممبئی)

للکارِ قائدِ اعظم قائدِ اعظم کی اس جرأت ایمانی اور کردار کی بلندی نے آپ کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے اور عوام و خواص میں آپ پہلے سے زیادہ محبوب و مقبول بن گئے۔ گاندھی جو اب تک حکومت برطانیہ کا گن گا رہا تھا اور اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کے ذریعہ عوام سے ریفارمز ایکٹ کو کامیابی سے چلانے کی اپیلیں کر رہا تھا۔ رولٹ ایکٹ بم کے دھماکا سے بڑا سٹ پٹایا اور اپنی خفت مٹانے کے ستیہ گرہ کی تحریک چلا دی۔ جو جلیانوالہ باغ کے خونیں ڈرامہ کی بنیاد بنی۔ جہاں جنرل ڈائر نے گولی چلوا کر چار سو کے قریب انسانوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اس پر زبردست احتجاج ہوا اور قائدِ اعظم نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ:-

"رسوائے عالم صدر رولٹ کمیٹی کے وضع کردہ جن قوانین پر لارڈ چمسفورڈ کی حکومت نے عملدرآمد شروع کیا ہے۔ ایسے ہیبتناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں کہ جن کو نہ تو آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ ہی عورتوں کے اشکوں کی روانی ان کو دھو سکتی ہے۔ موجودہ طرزِ حکومت ناقابل برداشت ہے۔ اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دار حکومت ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گے۔ ہمیں محض احتجاجی ریزولیوشن پاس کر کے سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کو بھیجنے کی بجائے کوئی مؤثر لائحہ عمل وضع کرنا ہو گا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ جو فرانس اٹلی اور مصریوں نے کئے تھے۔"

(حیات قائدِ اعظم صہ ۱۲۵)

اس ضیغم اسلام کی یہ گرج جب ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ کی در و دیوار سے ٹکرائی۔ تو قصرِ بکھنگم

تک لرز گیا۔ کیونکہ انگریز گاندھی کی آواز کو اتنی وقعت نہ دیتا تھا۔ جتنی قائدِاعظم کی گھن گرج کو اہمیت دیتا تھا۔ جنکا سیاسی کردار آئینہ کی طرح شفاف تھا۔ اور جو گاندھی کی طرح اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کے ہیر پھیر میں چھپانے کے عادی نہ تھے اور جن کی سیاسی دیانتداری اور اخلاقی جرأت کی پورے ملک میں دھوم تھی۔

دوست نما دشمن تحریک ترک موالات کے دوران گاندھی اس امر کے لئے بہت کوشاں رہا اور تحریک خلافت کی آڑ میں علی گڑھ میں مسلمانوں کے مونس و ہمدرد بن کر، ان کی "بہتری" کے لئے اس امر کا شدومد سے مطالبہ کرتا رہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بند کردی جائے۔ حکومت کی تعلیمی امداد ٹھکرا دی جائے۔ اس زمانہ میں اس نے کبھی ہندو یونیورسٹی بنارس نہ رخ کیا۔ نہ اپنی جاتی سے تعلیمی ادارے بند کرنے کو کہا۔ بلکہ جس زمانہ میں گاندھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بند کرانے پر تلا ہوا تھا۔ اس کا بھائی بند پنڈت مدن موہن مالویہ ہندو یونیورسٹی بنارس میں پرنس آف ویلز کو شاہی استقبال دینے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اور اسے گاندھی کی اشیرباد حاصل تھی۔ دراصل گاندھی تحریکِ خلافت کی تائید کی یہ قیمت وصول کرنا چاہتا تھا کہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں پر تعلیم جدید کے دروازے کھول کر انہیں ترقی کے جو مواقع مہیا کئے تھے۔ ان کو بند کرا کر مسلمانوں کو پھر قصرِ مذلت میں دھکیل دیا جائے۔ تاکہ تعلیم کی بدولت یہ سوراج یا حکومت خود اختیاری میں حصہ دار نہ بن سکیں۔ تحریکِ خلافت کے دوران گاندھی کی اسلام دوستی سراسر منافقت پر مبنی تھی۔ اس کا صداقت اور دیانت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قائدِاعظم سال بھر بڑی خاموشی کے ساتھ منافقت اور اسلام دوستی کی آڑ میں، اسلام دشمنی کا یہ ڈرامہ بغور دیکھتے رہے اور اس کے نتائج و عواقب، متشکل ہو کر قائدِاعظم کی حقیقت بین نظروں کے سامنے ایک فلم کی طرح چلتے رہے۔ اب آپ کے لئے چپکے رہنا مشکل ہو گیا۔ گو کھلے کی برسی کے

موقعہ پر آپ بھی پہنچ گئے اور اجلاس عام میں گاندھی کے مسلم کش منصوبہ کو یوں ہدفِ تنقید بنایا:۔

"میرے بہت سے دوستوں اور رفیقوں نے پوچھا ہے کہ میں سیاسیات کے اس نازک ترین دور میں خاموش کیوں ہوں یا الگ تھلگ کیوں ہوں! بلاشبہ صورتِ حال دشواریوں اور خطروں سے لبریز ہے۔ ایک طرف حکومت کا وہ خودسرانہ اور سفاکانہ طرزِ عمل ہے۔ جس نے قومی وقار کو مجروح کر رکھا ہے۔ جس شخص میں ذرا بھی سیاسی بصیرت ہو گی۔ وہ حکومت کو اس طرزِ عمل پر ملامت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ جنگِ عظیم جو ابھی ختم ہوئی ہے۔ اس میں ہندوستان نے اپنا خون بہایا۔ مال وزر سے حکومت کی مدد کی۔ لیکن صلہ کیا ملا؟ رولٹ ایکٹ! لیکن دوسری طرف میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ گاندھی جی نے، جن کی میں عزت کرتا ہوں۔ جو پروگرام اختیار کیا ہے۔ وہ قوم کو غلط راستے پر لئے جا رہا ہے (آوازیں نہیں نہیں) میں جانتا ہوں۔ آپ یہی کہیں گے۔ لیکن میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ پروگرام قوم کو غلط راستے پر نہ لئے جا رہا ہوتا۔ اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ پروگرام صحیح ہے۔ تو میں پہلا شخص ہوتا۔ جو اسکی عملی تائید کرتا۔ میں گاندھی جی اور ان کے رفقاء کی عزت کرتا ہوں۔ ان کے جذبۂ قربانی کا معترف ہوں۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ ان کا پروگرام قوم کو صراطِ مستقیم کی بجائے ایک گڑھے کی طرف لئے جا رہا ہے۔ میری رائے میں صحیح راستہ یہ تھا کہ کونسل میں جا کر رُودرزُد بیوروکریسی کا مقابلہ کیا جاتا۔ یہاں تک کہ حکومت کونسل کو توڑنے پر مجبور ہو جاتی۔

زارِ روس نے ڈوما قائم کی وہاں کے وطن پرستوں نے یہی کیا اور بالآخر زارِ روس نے مجبور ہو کر ڈوما توڑ دیا۔ یہی ہمارے لیڈر یہاں بھی کر سکتے تھے۔ اب گاندھی جی کے پروگرام کی دوسری شق کو لیجئے۔ یہ ہے سکولوں کا مقاطعہ (بائیکاٹ) آخر ترکِ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ صرف چرخہ کاتنا؟ اگر یہی بات ہے اور گاندھی جی یہی کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا کہ یہ تحریک بہر حال سیاسی تحریک نہیں ہے!

گاندھی کے پروگرام کی تیسری شق ہے کھادی کا عام رواج! اس پر خود کانگرس کے ڈیلی گیٹ بھی عامل نہیں۔ اس طرح کامیابی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ جذباتی پروگرام ہے۔ اس کی بجائے اگر یہ ہوتا کہ ملوں پر ملیں قائم کی جاتیں اور پھر برطانوی مال کا مقاطعہ کیا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ اسی طرح اسکول اور کالج جابجا قائم کئے جاتے پھر طلبا سے باہر آنے کو کہا جاتا تو کون تائید نہ کرتا۔"

(بمبئی کرانیکل ۱۲ فروری ۱۹۲۱ء)

قائدِ اعظم کے یہ ارشادات اس بات کے شاہدِ عدل ہیں کہ ان کی دور رس نگاہیں گاندھی کے دجل و فریب کی تہ تک پہنچ گئی تھیں اور وہ ترکِ تعلیم کے پروگرام کو مسلم نوجوانوں کی خودکشی پر محمول کرتے تھے۔ قائدِ اعظم نے ہر ایسے نازک موقعہ پر اپنی سیاسی بصیرت سے مسلمانوں کو ہندوؤں کی مسلم کش پالیسی سے بچایا اور گاندھی کا فریب نہ کھایا۔ علی برادران کو بھی جو گاندھی کا فریب کھا چکے تھے۔ کانگرس سے نکلنے کا راستہ دکھایا۔ ورنہ آج مسلمان ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوتے۔

یہ قائدِ اعظم کی صداقت اور فراست تھی کہ انہوں نے ۱۹۲۰ء میں کانگرس سے علیحدہ ہوتے وقت جو یہ کہا تھا کہ" گاندھی جی ملک کو تباہی اور ہلاکت کی طرف لے

جارہے ہیں۔ ہمیں جنگِ آزادی ایوانِ حکومت کے باہر نہیں بلکہ اس کی اسمبلیوں میں داخل ہو کر اندر لڑنی چاہیئے۔" اور جسکا اعادہ آپ نے مذکورہ بالا برسی کے موقعہ پر کیا۔ آنے والے واقعات نے قائدِ اعظم کی اس رائے کی صداقت کا اعتراف خود ہندو کانگرس سے کرا دیا۔ جس نے ۱۹۲۲ء میں وہی راہ عمل اختیار کی۔ جو قائدِ اعظم نے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں تجویز کی تھی۔ حالات نے گو کانگرس کو قائدِ اعظم کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ مگر قائدِ اعظم نے پھر کانگرس میں شمولیت نہ کی۔ البتہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے پھر بھی آپ نیک نیتی سے کوشاں رہے۔ ۱۹۲۸ء میں جو سائمن کمیشن ہندوستان میں آیا۔ اس میں چونکہ کوئی ہندوستانی ممبر شامل نہ تھا۔ اس لئے اہلِ ہند نے اسکا تاریخی مقاطعہ کیا اور قائدِ اعظم نے اس بائیکاٹ میں پیش پیش رہ کر پھر ہندو مسلم اتحاد کی امید پیدا کر دی۔ جس کا نتیجہ "دہلی تجاویز" کی صورت میں برآمد ہوا۔ جسکا حلیہ موتی لال نہرو نے اپنی نہرو رپورٹ میں بگاڑ کر مسلم دشمنی کا ثبوت دیا۔

ہندو ذہنیت

۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ کی منظوری کے لئے کلکتہ میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی۔ جہاں اس مسئلہ کے آبرومندانہ حل کے لئے قائدِ اعظم نے بغرض مفاہمت اس رپورٹ میں چند ترامیم پیش کیں۔ جنھیں ہندوؤں نے مسترد کر دیا اور وہ قائدِ اعظم کی معقول اور منصفانہ تجاویز کو کسی بھی قیمت پر منظور کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بلکہ ہندو پریس نے قائدِ اعظم کی مصالحتی تجاویز یا مطالبات کو بے ہودہ اور وطن کش قرار دیا۔ جس پر قائدِ اعظم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہیں مجبوراً بہ چشمِ تر یہ کہنا پڑا کہ:-

"اب ہمارے تمہارے راستے جدا جدا ہیں۔"

دہلی کے مشہور اخبار الجمعیتہ نے مورخہ ۵ جنوری ۱۹۲۹ء کے اداریہ میں ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ:-

"مسٹر جناح کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور انہوں نے مسلم مفاد کی ترجمانی کی ہے۔ جو ہندو سوسائٹی میں سب سے بڑا گناہ ہے اور جس کی تلافی سیاسی یا مذہبی شدھی کے سوا ممکن نہیں۔ یہ ہے اس طبقہ کی ذہنیت۔ جو نہرو رپورٹ کو زبردستی مسلمانوں پر ٹھونسنا چاہتا ہے اور وہ مادر وطن کی آزادی کے لئے قربانی کا دعویدار ہے۔ نیشنل کانگرس کے اس طرز عمل سے مسٹر جناح کو سبق حاصل کرنا چاہیئے اور ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندو اکابر اب کسی حالت میں بھی مسلمانوں کی بات سُننے کے لئے تیار نہیں اور نہ تملق ولابہ گری ان کو حق انصاف کی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔"

مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ ایک طرف تو قائداعظم نے مسلم کش نہرو رپورٹ کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور دوسری طرف ہندوؤں نے نہرو رپورٹ کی تائید کے لئے پنجاب اور یو۔ پی کے چند مسلمان لیڈروں کی تنخواہ پر خدمات حاصل کر لیں۔ جنھوں نے اپنی تنخواہیں حلال کرنے کے لئے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ممبران لیگ بکثرت نہرو رپورٹ کے حق میں ہیں۔ ان "زعماء" نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ ایک سازش کے تحت انہوں نے قائدِاعظم کی عدم موجودگی میں بے شرمی کا کھیل کھیلتے ہوئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں بڑے ڈرامائی انداز سے نہرو رپورٹ کے حق میں ایک قرارداد تک پاس کر ڈالی۔ جسے قائدِاعظم نے منسوخ کر دیا۔ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور نے اپنی ۴ر اپریل ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں اس شرمناک ڈرامہ کے جو کردار گنوائے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر شیخ محمد عالم۔ غازی عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر کچلو سرِفہرست نظر آ رہے ہیں۔ یہ حالات اس بات کے شاہد عدل ہیں کہ یہ مجاہد اعظم صرف کانگرس۔ ہندو سبھا کے مورچوں پر ہی معروفِ جہاد

نہ تھا۔ بلکہ اسے کرایہ کے مسلمانوں سے بھی دو دو ہاتھ کرنے پڑ رہے تھے۔

حسن آغاز

قائدِ اعظم نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اخیر وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ اس اتحاد کے ذریعہ انگریزوں کو بآسانی ملک بدر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے فی الواقعہ نکالنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ اگر قائدِ اعظم درمیان میں نہ ہوتے تو وہ بالیقین اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ مگر قائدِ اعظم ان کے لئے سنگِ راہ ثابت ہوئے اور جب قائدِ اعظم کو یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں سے مل کر نہیں رہنا چاہتے تو انہوں نے ۱۹۳۶ء سے مسلمانوں کو متحد کرنے کی مساعی شروع کر دیں۔ کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ ہو چکا تھا۔ جس کے تحت ہندوستان کو گیارہ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ان میں انتخابات شروع ہونے والے تھے۔ جن کے ذریعہ ہندو مسلمانوں پر غالب آنا چاہتے تھے۔ اس لئے قائدِ اعظم نے اس وقت مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا اور فرمایا:۔

"میں چاہتا ہوں کہ مسلمان خود اپنے اوپر بھروسہ کریں۔ اور اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو باحوصلہ اور پکے ارادے کے مالک ہوں۔ جو اپنے اصولوں کے لئے تنہا جدوجہد کر سکیں۔ خواہ پوری دنیا خلاف کیوں نہ ہو"

آپ نے مسلمانوں کو لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہونے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا:۔

"محنت۔ مصائب اور قربانیوں کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لوگ آپ کو ڈرائیں گے۔ بہلائیں گے۔ پھسلائیں گے۔ مگر یاد رکھئے کہ آگ میں تپ کر ہی لوہا کندن بنتا ہے۔ ظلم و ستم سے گھبرائیے نہیں۔ فیصلہ کیجئے اور فیصلہ

کرنے سے پہلے سو بار سوچ لیجئے۔ لیکن ایک بار جو فیصلہ کرلیں۔ اس
پر ڈٹ جایئے"۔

اس کے ساتھ ہی آپ نے ملک گیر دورہ شروع کر دیا۔ جسکا نتیجہ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں نظر آیا۔ جہاں ہندوستان بھر کے مسلم لیڈر جمع تھے۔ وہیں مسلم لیگ کا جھنڈا تیار کر کے علی امام ایڈوکیٹ لکھنؤ نے پیش کیا۔ جسے سب نے پسند کیا اور مولانا ظفر علی خان نے اس کی پرچم کشائی کی۔ اس میں مسلم لیگ کے رضا کاروں کو مسلم نیشنل گارڈ کا نام دیا گیا۔ اس کے لئے فنڈز مہیا کرنے کی خاطر راجہ محمود آباد نے اپنی ٹوپی بغرض نیلام پیش کی۔ جو پانچ ہزار میں فروخت ہوئی۔ پچپن ۵۵ ہزار چندہ جمع ہوا۔ اس روز قائدِ اعظم شیروانی۔ پاجامہ اور کالی سمور کی ٹوپی پہن کر شریکِ اجلاس ہوئے۔ جو اتنی پسند کی گئی کہ جناح کیپ کے نام سے محبوب و مقبول ہو گئی۔ اور اسی روز سے قائدِ اعظم اسلامیانِ ہند کی متاعِ حیات بن گئے اور غیر مسلموں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگے۔

ہندو گردی ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگرس سات صوبوں میں برسرِ اقتدار آگئی۔ بمصداق خدا گنجے کو ناخن نہ دے، کانگرس کے برسرِ اقتدار آتے ہی ہندوؤں نے ہر جگہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کر دی۔ ان کی جائیدادیں جلانے، انکی عورتوں کی عزت و عصمت لوٹنے، ان پر ملازمت کے دروازے بند کرنے۔ گائے کی قربانی کو ممنوع کرنے۔ مسلمان طالب علموں سے گاندھی کی تصویر کی پوجا کرانے۔ بندے ماترم کا مشرکانہ گیت گانے پر مجبور کرنے۔ مخلوط تعلیم جاری کرنے۔ اردو کو مٹانے اور سنسکرت کو رواج دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں ہر طرح سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے اور انہیں بہ جبر ہندو بنانے کی مہم کا آغاز کر دیا گیا اور بعض مقامات پر اقلیت

میں ہونے اور ہندوؤں کے مظالم نہ سہہ سکنے کی وجہ سے مسلمان ہندو ہو گئے۔ اور سکولوں۔ کالجوں میں جو مشرکانہ اور اسلام سوز نصاب جاری کیا گیا۔ اس کی بدولت نسلِ نو خود بخود ہندوانہ رنگ میں رنگی جانے لگی۔ یہ سب کچھ گاندھی۔ نہرو اور ابوالکلام آزاد کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اور ان کانگرسی مولویوں۔ نیشنلسٹ مسلمانوں اور احراریوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ جو ہر دم کانگرس کا دم بھرتے رہتے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کی شرکت کے بعد کانگرس نے نشۂ اقتدار میں چُور ہو کر مکمل آزادی کا دس اکتوبر ۱۹۳۹ء کو اعلان کر دیا اور حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے ۱۵ نومبر کو ساتوں کانگرسی صوبوں کی کانگرسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔

یومِ نجات

قائدِ اعظم نے جو شروع سے ہندوؤں کے ارادوں کو بھانپتے چلے آ رہے تھے۔ مکمل آزادی کو مسلمانوں کے لئے مہلک تصور کیا اور ہندو وزارتوں کے استعفیٰ پر مسلمانوں کو "یومِ نجات" منانے کا حکم دیا۔ جس کے نتیجہ میں ملک بھر میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے استبداد و استحصال سے نجات پانے کی خوشیاں منائیں اور اس خوشی میں دوسری اقلیتیں عیسائی۔ پارسی اور راجپوت مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو گئیں اور کانگرس مات کھا گئی۔ پھر اس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلانی شروع کر دی۔ مگر جاپان کے شکست کھا جانے کی وجہ سے کانگرس کی کمر ٹوٹ گئی وہ قائدِ اعظم کو ناکام بنانے کے لئے کانگرسی مسلموں۔ نیشنل مسلموں کانگرسی مولویوں اور احراریوں کو میدان میں لائی اور انہیں مسلم لیگ کے مقابلہ میں اگلی صفوں میں کھڑا کر دیا۔ اور عقبی جانب شیعہ سُنی فساد کرانے اور زیادہ سے زیادہ بولی پر مسلمانوں کو خریدنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ تاکہ لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کیا جائے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب برلا اور ٹاٹا جیسے کروڑوں پتی سیٹھ

بھی قائدِ اعظم کو خریدنے میں ناکام رہے تو پھر عیار گاندھی اور اس کے ہندو حواری قائدِ اعظم کی خوشامد و درآمد پر اتر آئے اور بھکاریوں کی طرح قائدِ اعظم کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے۔ لیکن اب اس مردِ مجاہد پر تمام مسلم کش صورتِ حال روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی تھی۔ اس لئے آپ ان کے ہمرنگِ زمیں دام میں نہ آئے اور گاندھی کو للکارا کہ:-

"ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اپنے حقوق کے لئے آخری دم تک لڑیں گے۔ گاندھی جی! آنکھیں کھولئے۔ اگر آپ اب بھی مسلمانوں کی طاقت کو پہچان لیں۔ تو ممکن ہے ہندوستان میں پھر امن کی لہر دوڑ جائے۔"

لیکن کانگرسی ہندو مسلمانوں کا مستقل اور منفرد وجود اور ان کی طاقت کو تسلیم کرنے سے صاف منکر ہو گئے۔ ان کے اس انکار نے قائدِ اعظم کے ہاتھ اور مضبوط کر دیئے۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور وہ سب پاکستان کے مورچہ کی طرف رواں دواں روانہ ہو پڑے۔

قراردادِ پاکستان

قائدِ اعظم کی رہنمائی میں مسلمانوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو شاہی مسجد کے زیرِ سایہ سابق منٹو پارک اور حال اقبال پارک میں پہنچ کر دم لیا مسلم لیگ نے اپنے سالانہ جلسہ میں اپنی اکثریت والے صوبوں میں آزاد حکومتیں قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور ہندوؤں کی غلامی اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جس پر گاندھی اور نہرو کو پسینہ آ گیا۔ ہندو من حیث القوم دہل گیا۔ انگریزوں نے جب ملک کے گوشے گوشے اور قریے قریے سے آنے والی یہ آوازیں سنیں کہ ملک تقسیم کرو اور چلے جاؤ۔ پاکستان زندہ باد۔ لے کے رہیں گے پاکستان اور بن کے رہے گا پاکستان۔ پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ تو وہ بھی دم بخود ہو کر رہ گئے۔

ابھی تک قائدِ اعظم یا مسلم رہنماؤں یا مسلم لیگ نے اپنی اس قرارداد کو کوئی نام نہ دیا تھا اور یہ قراردادِ لاہور کے نام سے ہی مشہور ہوئی۔ لیکن اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی ہندوؤں پر پاکستان کا ہوّا سوار ہو گیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے نظریہ کا مذاق اڑانے اور قائدِ اعظم کو نشانہ بنانے کے لیے اپنی تحریروں۔ تقریروں اور اخباروں میں لفظ پاکستان کو اتنا اچھالا کہ قائدِ اعظم نے اس بدنیت قوم کے ناپاک ارادوں سے تنگ آ کر یکم مارچ ۱۹۴۲ء کو اعلان کر دیا کہ :۔

"ہم نے قرارداد لاہور کو پاکستان کا نام نہیں دیا تھا۔ لیکن اگر دشمن ہمیں چڑانے کے لیے اس نام کا استعمال کر رہے ہیں۔ تو ہم اس سے چڑیں گے نہیں۔ بلکہ آج سے اس قرارداد کو قرارداد پاکستان ہی کے نام سے پکاریں گے۔ ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں ہندوستان کا کوئی ایسا حل قبول نہ ہو گا۔ جس میں مسلمانوں کے پاکستان کو نہ مانا گیا"

کرپس مشن جس روز قائدِ اعظم نے یہ اعلان کیا۔ اسی روز ہندوستان کے مستقبل کا حل تلاش کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے کرپس مشن کو ہندوستان بھیجا۔ مشن کا استقبال قائدِ اعظم نے اس اعلان سے کیا :۔

"مسلمان پاکستان کے علاوہ کسی دوسری تجویز کو ہرگز ہرگز منظور نہیں کریں گے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں۔ لیکن ہم آزاد پاکستان چاہتے ہیں۔ ہم کوئی ایسا فیصلہ قبول نہیں کریں گے۔ جس سے مطالبہ، پاکستان کی نفی ہوتی ہو یا ہندو کو ہم پر مسلّط ہونیکا موقعہ ملے"

تمام لیڈروں سے ملاقات اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد کرپس مشن نے قائدِ اعظم کے حق میں فیصلہ دیا اور اصولاً پاکستان کی حمایت کر دی۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے کب ماننے والے تھے۔ راج گوپال اچاریہ کے سوا تمام ہندوؤں اور کانگرس

نے مشن کی تجاویز مسترد کر دیں اور مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت ان کے حوالے کی جائے اور اس کے ساتھ ہی کانگرس نے حکومت کے خلاف باغیانہ مظاہرے شروع کر دیئے۔ قائدِ اعظم نے جب ہندوؤں کو بغاوت پر آمادہ دیکھا تو انہوں نے مسلمانوں کو بھی مقابلہ کیلئے تیار رہنے کا حکم دیا اور فرمایا :۔

"کانگرس کی اس بغاوت کا مقصد صرف برطانیہ کی مخالفت نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف بھی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو غلام بنانا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان پاکستان کے حصول کے لئے قربانیاں دینے کے لئے تیار ہو جائیں ؛؛

قائدِ اعظم کے اس اعلان کرنے کی دیر تھی کہ کانگرس نے اپنی تمام مسلم نما توپوں کا رخ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کی طرف موڑ دیا۔ متشدّدانہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ کیا گیا مگر اللہ نے انہیں بچا لیا۔ قائدِ اعظم پر ٹوڈی کا لیبل چسپاں کیا گیا۔ اس کو "کافرِ اعظم" قرار دینے کے لئے اپنے تنخواہ دار مولویوں سے فتویٰ حاصل کیا گیا۔

نئے جال

۱۹۴۴ء میں لارڈ ویول کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ ہندوؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ مگر قائدِ اعظم نے اس کی کوئی دال نہ گلنے دی۔ گاندھی نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے پھر مصالحت کا فریب دیا۔ اس نے قائدِ اعظم سے کئی ملاقاتیں کیں۔ کئی خطوط لکھے۔ مگر قائدِ اعظم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آپ چٹان کی طرح اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ گاندھی نے ناکامی کے بعد سر تیج بہادر سپرد اور بھولا بھائی ڈیسائی کو آگے بڑھایا۔ مگر وہ بھی قائدِ اعظم کو شیشہ میں اتارنے میں ناکام رہے۔ اس کے بعد لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس کا ڈھونگ رچایا۔ جس میں تین غیر لیگی مسلم نمائندے بھی بلائے۔ قائدِ اعظم نے ان کی

نمائندہ حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ کانگرسی مہرے تھے۔ اور کہا کہ جب تک مسلمان نمائندے مسلم لیگ سے نہ لئے جائیں گے ــــــــ وہ کوئی بات سننے کیلئے تیار نہ ہوں گے۔ کانگرس اور ویول نے قائدِ اعظم کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد لارڈ ویول نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا اور الیکشن کے میدان میں قائدِ اعظم کو مات دینے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ دوسری طرف قائدِ اعظم بھی سینہ ٹھوک کر میدان میں نکل آئے اور انہوں نے مسلمانوں کو تیار رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ :-

"آپ قوم کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم آزاد پاکستان میں رہ رہے ہوں گے۔ جب قربانی کا وقت آئیگا۔ تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا۔ جو اپنے سینہ پر گولی کھاؤں گا۔ مسلمانو! کام کرو۔ کام اور مسلسل کام کئے جاؤ۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہو گی۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کانگرس کی "اندرونی اور بیرونی" تمام مخالفتوں کے باوجود مسلم لیگ نے الیکشن جیت لیا۔ مرکز کی تمام مسلم نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں۔ صوبائی انتخابات میں بھی کانگرس کو چت نیچے گرایا۔ اس عظیم کامیابی پر ہندوؤں یا کانگرس کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ اور ۱۱ر جنوری ۱۹۴۶ء کو مسلمانوں نے یومِ فتح منایا۔

وزارتی مشن

ہندوستان کے مسئلہ کا کوئی اور حل تلاش کرنے کے لئے مسٹر ایٹلی وزیرِ اعظم برطانیہ نے ایک وزارتی مشن مئی ۱۹۴۶ء میں ہندوستان بھیجا۔ اس نے شملہ کی سرد فضا میں بیٹھ کر کانگرسی اور مسلم لیگی

لیڈروں سے مذاکرات کیے۔ لیکن کانگرسی لیڈر مسلمانوں کو آزاد وطن دینے پر تیار نہ ہوئے۔ گاندھی۔ کانگرس اور ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کے پیشِ نظر وزارتی مشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا کہ جو پارٹی اسے منظور کرے گی۔ وہ مرکز میں عارضی حکومت بنا سکے گی۔ اس منصوبہ کے تحت وائسرائے نے عبوری حکومت میں پانچ مسلم لیگی۔ پانچ کانگرسی۔ ایک سکھ۔ ایک عیسائی وزیر نامزد کرنے کا اعلان کیا۔ مسلم لیگ نے وزارتی مشن کی سکیم کو منظور کر لیا۔ لیکن کانگرس نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اندریں حالات جمہوری تقاضوں کے تحت وائسرائے کا فرض منصبی تھا کہ وہ مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دیتا۔ مگر اس نے ہندوؤں کو خوش رکھنے کے لیے، مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت نہ دے کر برطانوی وقار کو شدید ٹھیس لگائی اور وزارتی مشن کے فیصلہ کے پیرا نمبر ۸ کی غلط تاویل شروع کر دی۔

راست اقدام

جس پر دہلی کے انگریزی اخبار سٹیٹسمین نے مشن کو وعدہ خلافی کا مرتکب گردانتے ہوئے اپنے بے لاگ اداریہ میں یہاں تک لکھ دیا کہ سیاسی لیڈر تو اپنے وعدوں سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ لیکن مدبروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے وعدوں سے مکر جائیں۔ جو بات ۱۶ جون کو اتنی فروری اور مناسب معلوم ہوتی تھی۔ اس کی نوعیت محض دوسرے دن کے اندر بنیادی طور پر نہیں بدل سکتی تھی۔ اس صریح۔ صاف اور تاریخی انحراف کے بعد قائدِ اعظم نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور ۲۷-۲۸-۲۹ جولائی کو بمبئی میں لیگ کی کونسل کا بھی ایک غیر معمولی اجلاس منعقد کیا۔ جس میں کانگرس کی چالبازیوں کی مذمت کی گئی اور برطانوی حکومت کی کھلی جانبداری اور کانگرس نوازی کے خلاف بایں صورت احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان سب برطانوی اعزازات اور خطابات واپس کر دیں۔ لیگ کی کونسل نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پاکستان کے

حصول کی خاطر براہِ راست اقدام کا وقت آگیا ہے۔ لہٰذا مجلس عاملہ براہِ راست اقدام کا پروگرام مرتب کرے۔ راست اقدام کی قرارداد منظور ہونے پر قائدِاعظم نے کھڑے ہو کر فرمایا:۔

"ہم نے آج جو کچھ کیا ہے۔ وہ ہماری تاریخ میں سب سے زیادہ تاریخی اقدام ہے۔ ہم نے لیگ کی پوری تاریخ میں آئینی طریقوں اور آئینی طرزِ عمل کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے کبھی کوئی کام نہیں لیا۔ لیکن اب ہمیں مجبوراً اور بادل ناخواستہ یہ موقف اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔ آج کے دن سے ہم آئینی طریقوں کو خیرباد کہتے ہیں۔"

(قائدِاعظم میری نظر میں ص۷۸ شاہکار)

حسنِ اعتراف

اس طرح بمصداق تنگ آمد بجنگ آمد قائدِاعظم کو حضرت شیخ الہند کے ترک موالات کے فتویٰ پر عمل کرنا پڑا۔

راست اقدام کے لئے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس روز خطاب یافتگاں یکے بعد دیگرے لیگ کونسل کے ڈائس پر آکر اپنے خطابات عطائے تو بلغائے تو کے طور پر واپس کرنے کا اعلان کرتے گئے۔ یہ قائدِاعظم کی قیادت کی کرامت تھی کہ جن کی زندگی سرکار انگریزی کی ناصیہ فرسائی کرتے گزر گئی تھی۔ جنھوں نے ضمیر و ایمان کی متاع عزیز لُٹا کر خطابات اور اعزازات حاصل کئے تھے۔ وہ آج ملک و ملّت کی آزادی و سرفرازی کے لئے برضا و رغبت غلامی کے یہ طوق اپنی گردن سے خود اتار کر پھینک رہے تھے۔ ان کی اس گرانقدر تاریخی قربانی سے متاثر ہو کر بمبئی کے ایک کانگریس نواز ہفت روزہ بلٹز نے لکھا کہ:۔

"مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناح پر رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتے گذشتہ ہفتہ لیگ کی جو زبردست قلبِ ماہیت عمل میں آئی۔ یعنی جس طرح

وہ مسلمان نوابوں۔ نوتوں اور ناٹوں کے ایک رجعت پسند گٹھ جوڑ سے ایک ایسی انقلاب پسند عوامی تنظیم میں تبدیلی ہوگئی کہ جو اگر عملاً نہیں تو کم از کم قولاً شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کرنے میں منہمک ہے۔ اسے دیکھکر چوری چھپے ہم اس قومی خواہش کے اظہار پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کاش انڈین نیشنل کانگرس کے معاملات کی باگ ڈور بھی کسی مسٹر جناح کی سی مسلمہ قابلیت کے نکتہ شناس سیاستدان کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاستدانی کی اپنی اس آخری ضرب کاری سے مسٹر جناح نے انگریزوں اور کانگرس دونوں کو مات دے دی ہے اور اس عام قومی الزام کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ مسلم لیگ برطانوی شہنشاہیت کی طفیلی ہے۔"

(بحوالہ صدر ص ۷۹)

مسلم کُشی یومِ راست اقدام سے ہندوؤں نے فسادات شروع کر دیئے۔ جو ملک بھر میں آگ کی طرح پھیلتے گئے۔ صرف کلکتہ میں کانگرسیوں کی سرپرستی میں ہندوؤں نے پانچ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا۔ نواب بھوپال نے یہ تلخی کم کرنے کے لئے گاندھی اور قائدِاعظم کے درمیان پڑکر ملاقات کرائی۔ جس کے دوران گاندھی نے قائدِاعظم کے سامنے ہتھیار ڈالدیئے اور مان لیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی بلاشرکتِ غیرے نمائندگی کا حق رکھتی ہے۔ مگر وہ حسب عادت بعد میں اپنے قول و قرار سے پھر گئے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۴۶ء کے دوسرے ہفتے لارڈ ویول اور قائدِاعظم کے درمیان ایک ملاقات ہوئی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر قائدِاعظم نے حکومت کے اندر گھس کر کانگرس کے خلاف مورچہ بندی کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ وزارت میں شامل ہوگئی۔ جس پر ہندو بوکھلا گئے اور انہوں نے بہار۔ نواکھلی اور تیرہ میں بے بس مسلمانوں پر ظلم و ستم کے

پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ سڑکوں اور گلیوں میں خون کے ندی نالے بہنے لگے۔ بھوکے پیاسے بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں تک کو قتل کر کے ہندوؤں نے سفاکیت اور بربریت کا بازار گرم کر دیا۔ ملک میں خانہ جنگی کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ ہندو کسی قیمت پر مسلمانوں کو باعزت مقام پر دیکھنے کے لیئے تیار نہ تھے۔ اتنے وسیع پیمانہ پر قتل عام نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امن وصلح سے رہنے کا امکان ختم کر دیا۔

اس صورت حال سے گھبرا کر حکومت برطانیہ نے پھر ۲، دسمبر ۱۹۴۶ء کو ایک گول میز کانفرنس لندن میں بلائی۔ جس میں قائداعظم۔ لیاقت علی خان۔ جواہر لال نہرو اور بلدیو سنگھ شامل ہوئے۔ قائداعظم نے اس کانفرنس میں بھی یہی فرمایا کہ:-

"مسلمان ہندوؤں سے الگ قوم ہیں۔ حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ ہندوؤں کو ہندو اکثریت اور مسلمانوں کو مسلم اکثریت کے علاقے تقسیم کر دے۔ اس کے سوا اب ہندوستان کے مسئلہ کے حل کا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا"

کانگرسیوں نے پھر وہاں حسب سابق قائداعظم کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جسکی وجہ سے کانفرنس ناکام ہو گئی۔ البتہ وزیراعظم برطانیہ نے جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہندوستان کو چھوڑ دینے کا اعلان کر دیا اس زمانہ میں پنجاب میں کانگرس کے ایجنٹ خضر حیات ٹوانہ کی حکومت تھی۔ جس نے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر اپنی وزارت بنا رکھی تھی۔ پنجاب کے باغیرت مسلمانوں نے اسکے خلاف کامیاب مورچہ لگایا۔ اس مورچہ پر ہزاروں مجاہدین جیلوں میں چلے گئے۔ سینکڑوں نے سینوں پر گولیاں کھائیں۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ۳، مارچ ۱۹۴۷ء کو خضر حیات کی حکومت استعفیٰ دے کر چلتی بنی۔ انگریز گورنر نے حکومت سنبھال کر ہندوؤں اور سکھوں کی پشت پناہی شروع کر دی۔ جس کے بل بوتے پر پنجاب میں بھی ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع

کردیا۔ اتنے میں حکومت اہلِ ہند کے حوالے کرنے کے لئے لارڈ مونٹ بیٹن وائسرائے ہند بن کر یہاں پہنچ گیا۔ قائدِ اعظم نے اسے بھی آتے ہی سرخ جھنڈی دکھائی کہ مسلم لیگ قیامِ پاکستان کے مطالبہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے گی۔ جب کانگرس نے یہ دیکھا کہ قائدِ اعظم نہ بزور و نہ بزاری نہ بزن اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ تو اس نے قائدِ اعظم کے قدموں میں بعد از خرابی بسیار ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہتھیار ڈالدیئے اور مطالبۂ پاکستان، پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی شرط کے تحت تسلیم کرلیا۔

آخری مورچہ

قائدِ اعظم نے حکومت کی صفوں میں گھس کر جو آخری مورچہ لگایا تھا۔ اسے ناکام کرنے کیلئے ہندوؤں نے یہ چال چلی کہ وزارتِ مالیات مسلمانوں کے حوالے کی جائے۔ انہیں بنیّوں کی طرح حساب کرنا آتا نہیں۔ اسلئے یہ ناکام ہوکر خود راہِ فرار اختیار کریں گے۔ قائدِ اعظم ابھی اس مسئلہ پر متذبذب تھے۔ کہ چوہدری محمد علی نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ یہ پورٹ فولیو قبول کرلیں۔ بنیّوں کو ناک چنے چبوانے کے لئے میں کافی ہوں۔ چنانچہ وزارتِ خزانہ لیاقت علی خان نے اور وزارتِ داخلہ ولبھ بھائی پٹیل نے سنبھال لی۔ جو پاکستان کے لئے ہندوستان کی ایک انچ زمین دینے کے لئے بھی تیار نہ تھا اور اسے دھرتی ماتا کا جھٹکہ تصور کرتا تھا۔ وزارتِ داخلہ کو چلانے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت تھی۔ لیاقت علی خان نے ایک طرف تو اپنے پیش کردہ بجٹ میں ایک لاکھ سے زیادہ آمدنی والوں پر ۲۵ فیصد کی شرح سے منافع ٹیکس لگادیا۔ جس سے بڑے کانگرسی سیٹھوں۔ برلوں اور مہاجنوں کی چیخیں نکل گئیں اور دوسری طرف انہوں نے کانگرس کے مردِ آہن ولبھ بھائی پٹیل کی راہ میں ایسی مالی رکاوٹیں کھڑی کردیں کہ وہ وزیر باتدبیر مسلم لیگ کا محتاج بن کر رہ گیا اور اپنے وسیع اختیارات کے باوجود مسلم لیگ کے فنانس ڈیپارٹمنٹ

کی منظوری کے بغیر اپنے اختیار سے جب چپراسی تک نہ رکھ سکا تو چیختا چلاتا مونٹ بیٹن کے پاس پہنچا کہ ہندوستان کو مسلم لیگ سے نجات دلائی جائے۔ مونٹ بیٹن اب انگریز نہیں رہا تھا۔ عملاً ہندو بن چکا تھا۔ اس نے کانگرس کے گلے سے مسلم لیگ کا پھندا نکالنے کی امکان بھر کوشش کی۔ مگر پاکستان کے مجاہدِ اعظم نے اسکی کوئی دال نہ گلنے دی۔ جس پر ولبھ بھائی پٹیل کو اس کے سوا اپنی جان چھڑانے کی اور کوئی صورت نہ نظر ی کہ قائدِ اعظم کا مطالبہ پاکستان تسلیم کر کے ملک تقسیم کر دیا جائے۔ تاکہ ہندو اطمینان سے تو حکومت کر سکیں۔ چنانچہ ۳ر جون کو ہندوؤں اور انگریزوں نے قائدِ اعظم کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ ماؤنٹ بیٹن اور نہرو نے اسی روز آل انڈیا ریڈیو سے اپنی شکست اور قائدِ اعظم کی فتح کا اعلان کر دیا۔ اس روز پہلی دفعہ آل انڈیا ریڈیو سے دنیا فاتح پاکستان کی تقریر کے یہ آخری لفظ سن کر انگشت بدنداں رہ گئی کہ:-

پاکستان زندہ باد

بفضلہ تعالٰے علمار کرام کی مدد سے قائدِ اعظم نے بنگال اور سرحد کا ریفرنڈم بھی جیت لیا اور مسلمانوں کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا مالک و وارث بنا کر آپ ۲۵ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو خود ترک دنیا کر کے چلے گئے۔

(۱۲)

سر آغا خان

مذہبی پیشوا

اسماعیلی فرقہ کے اڑتالیسویں امام۔ بین الاقوامی شہری۔ عالمی شہرت کے مالک۔ گھوڑ دوڑ کے شائق۔ سونے۔ ہیروں اور پلاٹینیم میں تلنے والے مذہبی پیشوا، اپنی آمدنی کا معتدبہ حصہ اپنے فرقہ کی معاشی۔ اقتصادی۔ تعلیمی ثقافتی۔ صحتی اور مذہبی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے والے کروڑپتی رہنما۔ ایرانیوں کے ہزرائل ہائی نس۔ انگریزوں کے پی۔ سی، جی۔ سی۔ ایس۔ آئی، جی۔ سی۔ وی۔ او، جی۔ سی۔ آئی۔ ای، اسلامیانِ ہند کے مخلص بہی خواہ۔ دنیا کے نامور شہنشاہوں۔ بادشاہوں۔ امرو۔ وزیروں۔ سفیروں اور شخصیتوں کے بے تکلف دوست۔ آٹھ سال کی عمر میں مسندِ امامت پر بیٹھنے والے سلطان محمد شاہ، دنیا بھر میں سر آغا خان یا دی آغا خان کے نام سے مشہور تھے۔

تعلیم و تربیت

آپ ۲ر نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ مگر آپ کا لڑکپن اور جوانی کا سارا زمانہ بمبئی اور پونا میں گزرا باقی عمر یورپ کے عشرت کدوں میں گزاری اور مصر کو اپنی آخری آرامگاہ کے لئے منتخب کیا۔ آپ کی والدہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ آپ کو عربی۔ فارسی۔ انگریزوں اور فرانسیسی زبانوں کے علاوہ مذہبی تعلیم دلائی۔ آپ کی لاڈلے شہزادوں کی طرح پرورش کی بچپن میں آپ کو بڑی محنت شاقہ کرنی پڑی۔ صبح چھ ساڑھے چھ بجے اٹھا دیئے جاتے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر سات بجے گھوڑے سواری کے لئے بھیج دیا جاتا۔ ایک گھنٹہ تک آپ گھوڑا دوڑاتے آٹھ سے ساڑھے گیارہ بجے تک اپنے استادوں سے انگریزی اور فرانسیسی پڑھتے۔ پھر اپنا لنچ کھا کر دو بجے تک ستاتے۔ اس کے بعد تین گھنٹے تک عربی پڑھتے۔ پھر گاڑی

پر ہواخوری یا ٹینس وغیرہ کھیلنے جاتے۔ شام کو سات بجے واپس آکر دو گھنٹے بیٹھ کر خوشخطی کی مشق کرتے۔ جسے آپ بے انتہا اداس کرنے والی اور روح گھلا دینے والی کہا کرتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:-

"دس سال تک ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء تک یہ نظام بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہا۔ اس میں میرے لئے کوئی چھٹی کا دن ملنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں نہایت بے رحمی کے ساتھ برابر کام پر لگایا جاتا تھا"

(آپ بیتی صہ۵۹)

محنتِ شاقہ

اس محنت شاقہ کا یہ نتیجہ نکلا:-

"جب میری عمر تیرہ سال کی تھی۔ میں انگریزی۔ معمولی فرانسیسی مکمل فارسی اور اچھی خاصی عربی پڑھ لکھ سکتا تھا۔ رومن اور اسلامی تاریخ کا صحیح علم رکھتا تھا۔ سائنس کے کم از کم مبادیات سے مجھے اچھی واقفیت تھی۔ یعنی علم کیمیا۔ طبیعات۔ علم نباتات۔ علم حیات اور علم حیوانات سے واقف ہو چکا تھا۔ ہمارے ہر ایک گھر میں ایک لائبریری ہوا کرتی تھی۔ اور روزانہ مقررہ وقت پر مجھے لائبریری میں عملی اور تجرباتی کام کرنا پڑتا تھا۔

(ایضاً صہ۱۷)

جو تربیت مجھ کو دی جاتی تھی۔ وہ بہت سخت تھی۔ وہ تھوڑا سا وقت جو مجھ کو ملتا تھا۔ وہ بھی خالی نہ رہتا تھا۔ کیونکہ یہ میرا فرض تھا کہ میں اپنے ان مریدوں سے ملوں جو ہمارے مکان پر اپنے وفادارانہ احترام کی نذر پیش کرنے کے لئے آتے تھے"

(صہ۶۰)

یہ اسی تعلیم و تربیت۔ محنت اور مشقت کا نتیجہ تھا کہ جس نے آپ کو آسمانِ شہرت

پر پہنچایا۔ اور یورپ کے شاہی خاندانوں۔ رئیسوں۔ امیروں اور وزیروں میں اتنا مقبول بنایا کہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصہ میں آپ کو ان کا ننانوے فیصد مہمان بننا پڑتا تھا۔ اور صرف یک فیصد میزبان بننا پڑا اور یہ کم و بیش سلسلہ آخیر وقت تک جاری رہا۔ مثلاً اگر آپ نے ۱۸۹۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ کھانا کھایا تو ۱۹۵۳ء میں ملکہ الزبتھ کے ساتھ چائے پی۔

سیاسی صورتِ حال

۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے آپ کو اپنی لیجسلیٹو کونسل یعنی مجلس آئین ساز کا رکن بنا دیا۔ جبکہ ابھی آپ کی عمر بیس اور انتیس سال کے درمیان تھی۔ اس زمانہ میں وائسرائے کی یہ چھوٹی سی منتخب شدہ جماعت بہت بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ کیونکہ اسکے ہاتھ میں اصلی طاقت اور سارے اختیارات تھے۔ اس کے لئے بہت بااثر لوگ نامزد کئے جاتے تھے۔ آپ دو سال تک اس کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں آپ کا قیام کلکتہ میں رہا۔ جو اس زمانہ میں برطانوی سلطنت کا مرکز تھا۔ دو سال کے بعد دوبارہ آپ کو یہ اعزاز پیش کیا گیا۔ جو آپ نے قبول نہ کیا۔ اس دور کے تجربات کا نچوڑ آپ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :۔

"میں نے دیکھا کہ گورنمنٹ، ہندوستان کے آدمیوں سے کتنی دور ہو گئی تھی۔ صرف عام آدمیوں سے ہی نہیں۔ بلکہ ہندوستان کے روز افزوں۔ نمایاں اور کارکن تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی دور ہو رہی تھی۔ اپنی ذہنیت اور اپنی فضاء کے اعتبار سے اجنبی اور بیرونی قسم کی ہو گئی تھی ...... دوسری طرف ہندوستان کے سیاسی (ہندو) لیڈر جو اپنے معمولی مطالبات حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ اب اس بات کی کوشش شروع کر رہے تھے کہ ان کو صرف انتظامی اصلاحات ہی حاصل نہ ہو جائیں۔ بلکہ

ان کو اپنی سیاسی قسمت کا پورا فیصلہ کرنے کا حق مل جائے۔ اور وہ اپنی سیاست پر پورا قابو پالیں"۔

(سرگزشت صہ ۱۵۵)

تعلیمی پسماندگی

غیر سیاسی امور میں سرآغا خاں کے نزدیک سب سے زیادہ اہم مسئلہ تعلیم کا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی ترقی نہ ہونے کے برابر تھی۔ سرسید احمد خان کی طرح سرآغا خاں کے لئے بھی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی سوہانِ روح تھی۔ اسی لئے آپ اپنی سرگذشت میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مَیں ذاتی طور پر اپنا عقیدہ تعلیمی ترقی کی طرف جمائے ہوئے تھا۔ جہالت میرے نزدیک گورنمنٹ اور عوام دونوں کے لئے ایک قسم کا خطرہ تھی۔ غریبی اور بیماری، یہ دونوں جہالت کے منحوس نتیجے اور اس کے ساتھ ساتھ رہنے والی چیزیں تھیں۔ لیجسلیٹو کونسل میں میری تقریریں اکثر تعلیم کے منصفانہ اور فیاضانہ خرچہ پر زور دیا کرتی تھیں۔ مَیں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ملک میں عام ابتدائی تعلیم کا رواج جاری کیا جائے۔ جیسا کہ دنیا کے ہر مہذب ملک میں پایا جاتا ہے۔ اور جتنی بار مَیں کہہ سکتا تھا۔ مَیں نے یہ بھی بتایا کہ میرے خیال میں ہندوستان کی انتہائی غریبی کا بنیادی سبب ہندوستان کی انتہائی جہالت اور لاعلمی ہے"۔

(ایضاً صہ ۱۵۹)

ہندوؤں کی زیادتی

سرآغا خان کو دو سال وائسرائے ہند کی مجلس آئین ساز میں کام کرنے کا جو موقعہ ملا۔ اس نے ہندو ذہنیت کو قریب سے مطالعہ کرنے کے اہم مواقع پیدا کر دیئے۔ جس کا آپ کی سیاسی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اس ضمن میں آپ کے مندرجہ ذیل نقوش و تاثرات اس دور کے سیاسی

پس منظر کو سمجھنے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں :-

"میں نے اپنے ان دو سخت اور فیصلہ کن سالوں میں یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ کانگرس پارٹی جو اس وقت ملک کی واحد کارکن اور ذمہ دار سیاسی جماعت تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ ثابت ہونے کی اہلیّت نہیں رکھتی تھی۔ وہ مسلمان طبقہ کی ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق انصاف کے ساتھ برتاؤ کرنے کی اہل نہ تھی ... ہندوؤں کی یہ زیادتی تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے بنیادی مقاصد اور امیدوں سے آنکھیں بند کر لی تھیں"

سر آغا خان نے ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کے لئے اپنے قریبی دوست سر فیروز شاہ مہتہ، (جو کانگرس کے اونچے درجہ کے مشیروں میں سے تھے) کی معرفت اس امر کی بہتری کوشش کی کہ وہ مسلمانوں کو صحیح نمائندگی دے اور سرکاری ملازمتوں میں ان کا صحیح تناسب مقرر کرے مگر کانگرسیوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کے بعد سر آغا خان نے اپنے دوسرے گہرے دوست مسٹر جی۔ کے گوکھلے کے ذریعہ ہندوؤں کو مسلم کش زیادتیوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر مسٹر گوکھلے بھی کانگرس پارٹی کے دل و دماغ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکے۔ حالانکہ اس وقت وہی ہندوستان کے سب سے بڑے قومی سیاسی لیڈر تھے اور مسٹر گاندھی اور دونوں نہرو یعنی باپ بیٹے ابھی قیادت کی صفِ اول میں نہ پہنچے تھے۔

مسلم لیگ کا قیام

کانگرس پارٹی چونکہ مسلمانوں کے جائز مطالبات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی بلکہ اس معاملہ میں بالکل اندھی ہو گئی تھی۔ اسلئے سر آغا خان نے اس ہٹ دھرمی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ راستہ نکالا :-

"۱۹۰۶ء میں محسن الملک، مَیں اور دوسرے مسلمان لیڈر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے لئے صرف یہی ایک چارہ باقی تھا کہ ہم اپنی جداگانہ جماعت بنائیں اور جداگانہ کام کریں اور برطانوی گورنمنٹ سے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کو بہ حیثیت ایک قوم کے جو دوسری قوم کے اندر ہے۔ تسلیم کرالیں۔"

اس زمانہ میں رائٹ آنریبل سیدامیر علی کا شمار بھی غمخوارانِ ملت میں ہوتا تھا۔ مگر حکومت نے ان کو سیاست کے میدان سے دور رکھنے کے لئے ہائیکورٹ کا جج بنادیا تھا۔ جو بعدازاں پریوی کونسل کے ممبر بنے۔ ان دنوں سیدامیر علی کلکتہ ہائیکورٹ میں جج کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اس لئے سر آغاخاں اور ان کے رفقار کار نے جداگانہ جماعت بنانے کا جو منصوبہ بنایا۔ اس کے متعلق انہوں نے جسٹس سیدامیر علی کی بھی رائے معلوم کی۔ کیونکہ وہ ہندو مسلم مسئلہ پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ سر آغاخان نے جب سید صاحب کے سارا معاملہ گوشگزار کیا تو بقول سر آغاخان انہوں نے:۔

"ہماری ان کوششوں میں ہم کو آگے بڑھایا تاکہ ہم ایک جداگانہ مسلم تنظیم قائم کرلیں اور انہوں نے خاموشی کے ساتھ ہم کو مسلسل مدد دی۔"

(ایضاً صفحہ ۱۶۲)

اس صلاح مشورہ کے بعد ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

سیاسی سرگرمیاں

۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۹ء تک کا درمیانی عرصہ تاریخ پاک و ہند کا بڑا طوفانی دور تھا۔ ملک میں وقتاً فوقتاً احیار اسلام اور آزادیٔ وطن کی جو تحریکیں اٹھی تھیں۔ ان کی وجہ سے ملک میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ کانگریس انتہاپسند لیڈروں کے زیر اثر آچکی

تھی۔ ملک میں دہشت زدگی کا دور دورہ تھا۔ تقسیم بنگال نے ملک کے سیاسی حلقوں میں سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ معرضِ وجود میں آچکی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں انگلستان میں لبرل حکومت برسر اقتدار آ گئی تھی۔ لارڈ منٹو گورنر جنرل کا دور تھا۔ سیاسی بیداری کے طوفان کو روکنے کیلئے حکومتِ برطانیہ اہلِ ہند کو کچھ سیاسی مراعات دینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اور سر آغا خان اس زمانے میں چین کے لئے رختِ سفر باندھ چکے تھے کہ نواب محسن الملک نے ایسے نازک حالات میں آپ سے اس وفد کی رہنمائی کی درخواست کی جو ۱۹۰۶ء میں بمقام شملہ لارڈ منٹو سے بسلسلہ اصلاحات ملنے والا تھا۔ چنانچہ آپ نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اپنا چین کا دورہ ملتوی کر دیا اور مسلم لیگ کے وفد کی قیادت کر کے اسلامیانِ ہند کی وکالت کے فرائض سر انجام دیئے۔ اسی وفد سے سر آغا خان کی سیاسی سرگرمیوں کا اور اسی وفد اور اس کے مطالبات سے مسلمانانِ ہند کی جدید سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

تعلیمی خدمات سر آغا خان کی رفاہی دلچسپیاں شروع میں اپنے فرقہ تک محدود تھیں۔ مگر جب نواب محسن الملک سے آپ کی دوستی بڑھی۔ آپ کی ان سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو گیا اور آپ عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی میں دلچسپی لینے لگے۔ جس کا آغاز آپ نے متحدہ ہندوستان کے ممتاز ترین اور عالمِ اسلام کے بہترین تعلیمی ادارہ علی گڑھ کالج کے دورہ سے کیا۔ جہاں آپ کا سر سید احمد خان نے بڑی مسرت کے ساتھ استقبال کیا اور آپ کو سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ جس کے جواب میں سر آغا خان نے کہا:۔

"علی گڑھ کالج ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں میں ایک امتیازی نشان رکھتا ہے اور میرے خیال میں تمام اسلامی ممالک میں اس سے بہتر کوئی ادارہ

موجود نہیں"۔

۱۹۰۲ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کی صدارت کرتے ہوئے آپ نے جو صدارتی خطبہ دیا۔ اس میں مسلمانوں کے اسبابِ زوال پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ:-

"مسلمانوں کی ایک علیحدہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ جہاں علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ طلبار کو یہ بھی بتایا جائے کہ ان کا ماضی کیسا باعظمت تھا۔ یہ علی گڑھ سے علم و ہدایت کی روشنی لیکر اسے تمام ہندوستان میں پھیلائیں۔ علی گڑھ کو مسلمانوں کی علمی۔ دماغی اور اخلاقی ترقی کا مرکز بنایا جائے اور اسے آکسفورڈ اور دنیا کی دوسری شہرہ آفاق یونیورسٹیوں کے معیار پر پہنچایا جائے اور سائنسی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جائے"۔

انگریزی تعلیم کے لئے اگرچہ علی گڑھ کالج قائم ہو چکا تھا۔ لیکن جب پرنس آف ویلز نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ تو ان کے پروگرام میں علی گڑھ کا دورہ شامل نہیں تھا۔ آپ نے ذاتی اثر ورسوخ کی بنار پر علی گڑھ کو ان کے دورہ کے پروگرام میں شامل کرایا اور پرنس آف ویلز نے جب کالج کا معائنہ کیا تو آپ کی تحریک پر انہوں نے اپنے نام سے موسوم سائنس کی تعلیم کے لئے سکول قائم کرنے کی اجازت دیدی۔ ان تعلیمی اداروں میں چونکہ انگریزی سٹاف سے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے نواب محسن الملک نے ان کا اثر ورسوخ کم کرنے کے لئے مسلمان اساتذہ کو بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس غرض کے لئے آغا خان نے ایک معقول رقم مہیا کی۔ جس کی بنار پر آغا خان فارن سکالرشپ قائم کیا گیا۔ اس کا سب سے پہلے وظیفہ ڈاکٹر ضیا الدین کو ملا۔ جو اس وقت یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

مسلم یونیورسٹی

سر آغا خان نے آجکل کے رہنماؤں کی طرح صرف باتیں بنانے پر ہی اکتفا نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ کہا۔ اسے عملی جامہ پہنانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پہلی آمد پر آپ نے علی گڑھ کالج کو ۲۵ ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ ۱۹۱۰ء میں آپ نے دوبارہ کالج کا دورہ کیا۔ اس موقعہ پر آپ نے طلبار سے خطاب کرتے ہوئے پھر اس بات پر زور دیا کہ اسے ایک ایسی یونیورسٹی بنانا چاہیئے۔ جو اسلام کے لئے باعثِ فخر ہو۔ علم و تحقیق کے لحاظ سے یہ دیوارِ چین سے لیکر مرکز بحرالکاہل تک مسلمانوں کے لئے اخلاقی اثر کا سرچشمہ ہو۔ اور اپنی ان نیک خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پھر ایک لاکھ روپے کا گرانقدر عطیہ دیا۔

سر آغا خان کی تعلیمی دلچسپیوں کی بنار پر ۱۹۱۱ء میں یونیورسٹی کے منصوبہ کی تکمیل کے لئے جو سنٹرل فاؤنڈیشن کمیٹی بنائی گئی۔ اسکا سر آغا خان کو صدر منتخب کیا گیا۔ جس کی بنار پر آپ نے ملک بھر میں مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کی خاطر دَورے کئے جن کے دوران مجوزہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے نواب بھوپال نے سر آغا خان کو ایک لاکھ روپیہ عطا کیا۔ ۲۴ر فروری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کی مہم کے سلسلہ میں جب آپ ایک تعلیمی وفد لے کر لاہور پہنچے تو آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کی گاڑی کو گھوڑوں کی بجائے انسانوں نے کھینچا۔ جن میں ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ضیار الدین بھی شامل تھے۔ اسی سال آپ کو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ کی مساعی جمیلہ سے ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ معرضِ وجود میں آئی۔ آپ کو اس کا پہلا پرو وائس چانسلر مقرر کیا گیا اور آپ کئی سال تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

سر آغا خان کی خواہش کے مطابق یہ یونیورسٹی عالم اسلام کا ایک امتیازی نشان بن گئی۔ جو روزِ اوّل سے ہندوؤں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ اور

متحدہ ہند میں یہ مسلم یونیورسٹی پاکستان کا پہلا قلعہ ثابت ہوئی۔ جس سے تعلیم و تربیت پاکر پاکستان کے علمبردار نکلے۔ جس کا سر آغا خان نے اپنی سرگزشت میں، ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

"ہم فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ علی گڑھ صرف ہماری کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کسی بیرونی فیاض کا نتیجہ نہ تھا اور یقین کے ساتھ اس بات کا دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہ پاکستان کی آزاد اور خود مختار قوم علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کے اندر پیدا ہوئی"

(صہ ۹۵)

اسی لئے تقسیم ہند کے بعد گورنمنٹ ہند نے اپنے روایتی تعصب کے تحت اسے انتقام کا نشانہ بنایا اور اسکی امتیازی شان ختم کر کے اسے ہندو یونیورسٹی بنارس کا مثنیٰ بنا دیا۔

سیاسی خدمات

سر آغا خان نے ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی اور مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے۔ جو بہت حد تک منظور کر لئے گئے۔ جس کا اندازہ منٹو مارلے اصلاحات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ان اصلاحات کی رو سے سب سے بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ تاکہ مختلف قومیں خود اپنا اپنا نمائندہ منتخب کر سکیں۔ اسی اصول پر تحریکِ پاکستان کی بنیاد رکھی گئی اور ملک تقسیم کرایا گیا۔ اس کامیابی کا سہرا سر آغا خان کے سر تھا۔ جس پر ہندوؤں کے سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ جو مسلمانوں کو الگ قوم تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے اور مخلوط انتخاب کے ذریعہ مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں جب مسلم لیگ کا انتخاب ہوا۔ تو سر آغا خان کو مسلم لیگ کا مستقل صدر چن لیا گیا۔ اور آپ ۱۹۱۲ء تک اسکے صدر رہے۔ اسکے بعد جب مسلم لیگ نے

اپنا آئین بدل ڈالا تو سر آغا خان نے بھی لیگ سے استعفیٰ دیدیا۔

سر آغا خان نے ترکی اور خلافت کے مسائل میں بھی بڑی دلچسپی لی۔ اسی سلسلہ میں آپنے لندن سے ایک اخبار "مسلم آؤٹ لک" جاری کرایا۔ پیرس اور لندن میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔ یونانیوں کے مظالم کے خلاف جب آپ ایک وفد لیکر برطانیہ کے وزیرِ اعظم لائیڈ جارج سے ملے تو اس نے کہا کہ یونانیوں نے تلوار کے زور سے تھریس پر قبضہ کیا ہے۔ تو آپنے فوراً کہا "مسٹر پرائم منسٹر یونانیوں کو ہم پر چھوڑ دو۔ اگرچہ میں ضعیف ہو گیا ہوں مگر جب میں تلوار لیکر جاؤنگا تو یونانیوں کو وہاں سے نکال دونگا"۔

کانگرس کا مقابلہ کرنے کیلئے جب ممتاز سیاسی رہنماؤں کی آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی گئی تو اسکے پہلے اجلاس کا سر آغا خان کو ہی صدر منتخب کیا گیا۔ جسکے خطبہ صدارت میں آپنے جداگانہ انتخابات پر زور دیا۔ جسے بعدازاں حکومت برطانیہ کو ماننا پڑا۔ پہلی گول میز کانفرنس کیلئے بھی تمام سیاسی رہنماؤں نے آپکو اپنا قائد منتخب کیا۔ مگر کانگرس کی عدم شرکت کی وجہ سے یہ کانفرنس ناکام رہی۔

مسلم لیگ کے ابتدائی دور میں آپنے ہر محاذ پر اسکی رہنمائی اور مدد کی۔ اسکی مالی اعانت کی اور جداگانہ انتخابات کا فارمولا تسلیم کرا کر تعمیرِ پاکستان کیلئے زمین ہموار کرادی۔ گول میز کانفرنس کے بعد جب مسلم لیگ عوامی سیاسی جماعت بن گئی اور قائدِ اعظم نے اسکی قیادت سنبھال لی۔ تو اسکے بعد سر آغا خان نے متحدہ ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینا ترک کردیا۔ بہرحال اس حد تک آپ کی تعلیمی اور سیاسی خدمات تحریکِ پاکستان کے لئے سنگِ میل ثابت ہوئیں اور آپ کی قیادت میں پاکستان کا پہلا مورچہ سر ہوا۔

---

(۱۳)

علامہ سر محمد اقبالؒ

پہلو دار شخصیت

درویشِ بے گلیم۔ با عمل انسان۔ زندہ دل مومن۔ مجتہد عصر۔ سخن گو فلسفی۔ بت شکن مفکرّ۔ خودشناس شاعر۔ روحانیت کا قائل۔ اسلام کا گرویدہ۔ ستائش دنیا سے بے نیاز۔ حقیقت پسند شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ پر گذشتہ ربع صدی میں جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اتنا آج تک کسی شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ اس کے باوجود عوام ابھی تک اس آفاقی شاعر کے تصوّرات و تخیلات سے صحیح معنوں میں روشناس نہیں ہو سکے۔ اور نہ ان کے کلام و پیغام کے عمود و عمق یا گہرائی و گیرائی کا صحیح اندازہ لگایا جا سکا ہے۔ کیونکہ شاعر کا ایک مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ اور وہ اسی عینک سے واقعاتِ عالم کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر اپنی چشم بصیرت سے جو کچھ دیکھتا ہے۔ اسے شعر کے قالب میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ لیکن قاری کو چونکہ ہر شعر یا نظم کا شانِ نزول معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اپنی مطلب براری کے لئے شاعر کے مشاہدات کو اس کے نظریات تصور کرتا ہے اور اس کے کلام کے سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر اس کے مشاہدات کو بغرض مطلب براری بطور نظریات پیش کر دیتا ہے۔ حالانکہ شاعر کی قطعاً وہ غرض یا نیت نہیں ہوتی۔ کلام کے اس غلط استعمال سے بسا اوقات عوام کے ذہن میں شاعر کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہی معاملہ علامہ اقبال کے ساتھ بھی رہا۔ اسی لئے علامہ اقبال نے اپنی پہلو دار شخصیت کے متعلق فرمایا:-

ہیں ہزاروں اس کے پہلو، رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں

دل نہیں شاعر کا ۔ ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھ کو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں

ایسی غلط چسپاندگی کی وجہ بھی علامہ اقبال نے خود اپنے ایک خط مورخہ ۱۱/۱۱/۱۷ میں یہ لکھی ہے کہ :۔

"ہر شخص ہر کتاب کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتا ہے اور اس کے مضامین سے وہی نتائج نکالتا ہے ۔ جن کی اس کی دماغی تربیت مقتضی ہوتی ہے۔"

(مکاتیبِ اقبال)

بوقلموں شخصیت اپنی مطلب براری کے لئے مقصودِ اقبال کو نظر انداز کرنے کا جو نتیجہ نکلا ۔ جناب ممتاز حسن نے اسکی یوں عکاسی کی ہے :۔

"عوام الناس میں جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں ۔ وہ اقبال کو "علامہ اقبال" کہتے ہیں ۔ جو جاہل ہیں اور اس کے منہ سے نظمیں سنتے رہے ہیں ۔ وہ اسے گویا سمجھتے ہیں ۔ "دیندار" لوگ اسے "داڑھی منڈا" اور "کافر" سمجھتے ہیں ۔ سُنّی اسے شیعہ سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ اسے امام حسینؓ اور حضرت علیؓ سے بے حد عقیدت ہے ۔ شیعہ اسے سُنّی سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا مداح ہے ۔ وہابی اسے پیر پرست کہتے ہیں ۔ کیونکہ وہ درگاہِ محبوب الٰہیؒ پر اپنی التجا لے کر گیا ۔ پیر پرست لوگ اسے وہابی سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ وہ بڑے بڑے پیروں سے نوک جھوک کیا کرتا ہے ۔ دیوبندی خیالات کے علماء اقبال کو ایک آزاد خیال ملحد سمجھتے ہیں اور لامذہب نوجوان اسے تنگ نظر اور مذہب کی زنجیروں کا اسیر ٹھہراتے ہیں ۔ کیونکہ اگر ایک طرف وہ فروعات کو چنداں ضروری خیال نہیں کرتا تو دوسری طرف اسے اسلام کے اصولوں سے ایک غیر فانی محبت ہے ۔ بعض اس پر بابی کا الزام

لگاتے ہیں۔ کیونکہ اقبال نے اپنے قیام انگلستان کے زمانہ میں مشہور بابی شاعرہ قرۃ العین پر ایک محققانہ مضمون لکھا تھا۔"

اسی لئے علامہ اقبال نے اپنی بوقلموں شخصیت کے بارہ میں عوامی ردِ عمل کی یوں عکاسی کی ہے ۔

رند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں
زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلماں ہوں میں

دورِ بچپن

علامہ اقبال ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ جب مسلمانوں کا ستارۂ اقبال غروب ہو چکا تھا۔ علمی ذوق مفقود ہو چکا تھا۔ نو تعلیمیافتہ طبقہ مغربی تہذیب سے مسحور ہو چکا تھا۔ جسکا علامہ اقبال کو از حد رنج تھا۔ اسی لئے انہوں نے فرمایا تھا۔

"افسوس کہ ہم اچھے زمانہ میں پیدا نہ ہوئے ...... اب ہر آنے والا دن پہلے سے بُرا آئیگا۔"

علامہ اقبال نے بھی بچپن میں سب سے پہلے قرآنِ کریم کی تعلیم پائی۔ یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ آپ روزانہ صبح اٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ ایک دن جب آپ تلاوت کر رہے تھے تو آپ کے والد ماجد وہاں سے گزرے اور آپ سے کہا۔

"بیٹا جب تم قرآن پڑھو۔ تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے۔"

آپ نے حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے اکتساب فیض کیا۔ ایف۔ اے تک سیالکوٹ کے کالج میں تعلیم پائی۔ بی۔ اے کی

لاہور میں تکمیل کی اور ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ جہاں ڈگریوں پر ڈگریاں حاصل کیں۔ ایک دن آپ کے والد نے آپ سے کہا۔ "بیٹا مَیں نے تمہارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے۔ اس کا مَیں تم سے معاوضہ چاہتا ہوں! اور وہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا"۔ اس ہونہار بیٹے نے باپ کا حساب ایسا چکایا کہ باپ نے بستر مرگ پر اس بات کی شہادت دی اور دنیا آپ کی وفات سے لیکر اب تک آپ کو شمع اسلام کا پروانہ ثابت کر رہی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جسقدر اور جس انداز سے اقبال نے اسلام کی خدمت کی۔ اس دَور میں اتنی خدمتِ اسلام کی سعادت اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

زمانہ طالب علمی علامہ اقبال کی طالب علمی کا زمانہ قابلِ رشک اور قابلِ تقلید تھا۔ خاص کر وہ زمانہ جو آپ نے انگلستان میں گزارا۔ آپ وہاں ۱۹۰۵ء میں گئے اور ۱۹۰۸ء میں ڈگریوں کی جھولی بھر کر واپس آئے۔ اس قلیل عرصہ میں اس ذہین و فطین طالب علم نے، عین عنفوانِ شباب میں، حسن و عشق کی رومانوی دنیا میں رہ کر مولانا محمد علی جوہر کی طرح پارسائی دکھائی۔ وہاں کی "آب و ہوا" اور تہذیب و تمدن کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بلکہ وہاں پہنچ کر یہی سمجھا کہ ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں
کہ مَیں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل
زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

حیرت تو اس بات پر ہے کہ قیامِ انگلستان کے دوران علامہ اقبال سے طہارت کا لوٹا نہ چھوٹا۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے "عصائے موسوی" کی طرح طہارت کا لوٹا ہر جگہ آپ ساتھ رکھتے تھے۔ آخر ایک دن آپ کی میزبان یعنی مالکۂ مکان

نے اسکی وجہ پوچھی تو آپ نے کہا :۔

" اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں ۔ بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے "۔

اس ہوشربا دنیا میں اقبال کی راتیں کیسے گزرتی تھیں ۔ اسکا جواب خود علامہ اقبال یوں دیتے ہیں کہ :۔

" بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا ہے ۔ اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے ۔۔۔ اس وقت عبادتِ الٰہی میں لذت حاصل ہوتی ہے "۔

مصروفیاتِ انگلستان

اس کے علاوہ آپ کے وہاں دن کیسے گزرے اور ان کا حاصل کیا رہا ۔ اس کی تفصیل اس سے بھی حیرت افزا ہے ۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ :۔

" اسی عرصہ میں آپ نے لندن میں بیرسٹری کی تعلیم مکمل کی ۔ کیمبرج یونیورسٹی میں معاشیات کے مطالعہ کے علاوہ فلسفہ میں بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کا زبانی امتحان جرمن زبان میں دیا ۔ جو وہیں سیکھ لی تھی ۔ چھ ماہ تک استادِ عربی کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں ڈاکٹر آرنلڈ کی جانشینی کے فرائض انجام دیئے ۔ اسلام اور اسلامی فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر عمیق مطالعہ کے بعد نصف درجن خطبات و مقالات مرتب کئے ۔ پان اسلامک سوسائٹی اور دیگر انجمنوں کی تنظیم میں حصہ لیا ۔ احباب کے ساتھ انگلینڈ ۔ سکاٹ لینڈ اور جرمنی کے مختلف علاقوں کے دورے کئے جسٹس امیر علی ۔ شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی اور کئی اہم شخصیات

سے ذاتی روابط قائم کیے۔ تہذیب مغرب۔ سیاستِ افرنگ اور عالمِ اسلام کے حالات و تحریکات کا گہرا مطالعہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کے اندر ایک ذہنی انقلاب رونما ہوا:۔

انگلستان کے قیام کے دوران آپ نے اسلامی تہذیب و تمدن پر تقاریر کا جو سلسلہ شروع کیا۔ ان میں سے چند کے عنوان یہ تھے:۔

اسلامی تصوف۔ اسلامی جمہوریت۔ اسلام اور عقل انسانی۔ مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر یہ حقائق اس بات کے شاہدِ عدل ہیں کہ علامہ اقبال کو شروع سے تائیدِ ایزدی حاصل تھی۔ اس لیے آپ نے اس رنگین دنیا میں اپنے اوقات کا صحیح استعمال کیا۔ اپنی زندگی کا ایک لمحہ تک کہیں ضائع نہ کیا اور اتنی ذہنی اور فکری جد و جہد اور محنت و مشقت کی۔ جسکا اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہ اہتمامِ قدرت تھا۔ جو اقبال کو اِسلام کے پیغامبر ہونے کی توفیق بخش رہی تھی۔

کیمبرج کی تعلیم کے دوران ایک صاحب اقبال سے سوال کر بیٹھے کہ اس بات کی کیا وجہ ہے تمام پیغمبر اور بانیانِ مذاہب ایشیا میں پیدا ہوئے اور یورپ میں کوئی بھی پیدا نہ ہوا۔ تو بمصداق ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اقبال نے اسے یہ کہکر خاموش کر دیا کہ:۔

"بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا پنترا جما لیا۔ اللہ میاں نے ایشیار کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔ اس لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں۔ ایشیار میں مبعوث ہوئے"۔

وہ صاحب بولے کہ پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ علامہ اقبال نے کہا:۔

"یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہلِ سیاست اسکے رسول ہیں"۔

جس پر حاضرین مکالمہ نے زور کا قہقہہ لگا کر اس مجلسِ سوال و جواب کو ختم کر دیا۔

امتحانِ ممتحن ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات کے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ممتحن بھی تھے اور بحیثیت ممتحن انہوں نے ایک مجلس میں فرقہ وارانہ سوال پر بحث کے دوران بتلایا کہ :-

" فرقہ وارانہ ذہنیت نے پنجاب کی فضاء کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ اگر کسی ہندو ممتحن کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس لڑکے کے پرچے وہ جانچ رہا ہے۔ وہ مسلمان ہے تو وہ یا تو اسے فیل کر دے گا یا اونچے نمبر پر آنے والا ہے۔ تو اسے اتنے کم نمبر دے گا کہ وہ غریب مشکل سے پاس ہو سکے۔ یہی حالت مسلمان ممتحن کی ہے۔ وہ بھی بے دریغ ہندو لڑکے کو یا تو فیل کر دے گا یا اسکے نمبروں میں کتر بیونت سے کام لے گا۔ بشرطیکہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ پرچہ ہندو طالبعلم کا ہے... مگر میں نے کبھی کسی امیدوار کے ساتھ بے انصافی نہیں برتی۔"

(عظمتِ رفتہ ۲۷۱)

حسن اتفاق سے اس مجلس میں اس کتاب کے مصنف ضیاء الدین احمد بھی موجود تھے۔ جو ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے کے امتحان کے سلسلہ میں لاہور آئے ہوئے تھے۔ اور علامہ اقبال کے پاس اکثر جایا کرتے تھے۔ جب انہیں علامہ اقبال کے ممتحن ہونے کا علم ہوا۔ تو انہوں نے بھی طفلانہ جسارت کرتے ہوئے بغرض حصول رعایت علامہ صاحب کو اپنا رول نمبر بتا دیا۔ اس پر علامہ اقبال بہت بگڑے اور غصہ کے لہجہ میں مگر حسنِ اخلاق سے فرمایا :-

" آپ امیدوار ہیں۔ آپ کو ممتحن سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی آپ کی گفتگو غیر مناسب ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

(ایضاً)

علامہ اقبال کو کیا خبر تھی کہ ان کے مجوزہ پاکستان میں ایک ایسا وقت بھی آئے گا۔ جب طلبار حصول علم کی بجائے ڈگریوں کے حصول کے لئے سستے داموں ممتحن استادوں اور نگرانوں کو خرید سکیں گے۔ علامہ اقبال کی نظر میں استاد کا مقام اتنا بلند و بالا تھا کہ ان کے معیار پر کوئی استاد پورا نہیں اترتا تھا۔ حالانکہ ان کے دور کے اور ہمارے دور کے اساتذہ کے کردار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بایںہمہ انہیں شکوہ تھا کہ:۔

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

اس شعر کے سلسلہ میں ضیار الدین احمد نے علامہ اقبال سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سر محمد شفیع جیسے استاد کی موجودگی میں آپ کو یہ نہ لکھنا چاہیئے تھا۔ آخر اسکی کیا وجہ! ہنس کر فرمایا کہ:۔

" یہ شعر اسی لئے کہا گیا ہے تاکہ لوگ وہی سوال کریں۔ جو آپ نے کیا ہے اسی سوال میں پورا جواب مضمر ہے"

(ایضاً)

گویا آپ کے زمانہ میں بھی کوئی استاد کے مقام پر پورا نہ اترتا تھا۔ آج کا تو خدا حافظ ہے۔

اسلوبِ بیان قرآن کریم نے کارخانۂ قدرت کے اسرار و رموز۔ حکمت و مصلحت کو جسطرح مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اسلام آگاہی کے لئے بالکل قرآن کا اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ جسکی قاضی عبدالغفار "پیامِ اقبال" میں یوں نشاندہی کرتے ہیں:۔

"کوئی تشبیہہ، کوئی استعارہ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ باقی نہیں جس کے اندر اقبال نے اپنا پیام نہ رکھدیا ہو۔ پھول کی پنکھڑی میں،

کانٹے میں، دریا کی روانی میں، صحرا کے بگولوں میں، پہاڑ کی بلندی میں، میخانے کے خم میں، ساقی کے ساغر میں، مغنّی کے ساز میں، ساز کے تار میں، ہوا میں، آسمان میں"۔

ان استعاروں اور اشاروں کے ذریعہ علامہ اقبال اپنے پیغام میں:۔

"لاچاریوں اور مجبوریوں کا علاج بتاتا ہے۔ محرومیوں اور معذوریوں کی دوا پیش کرتا ہے۔ کمزوریوں اور پست حوصلگی کا مداوا لاتا ہے"۔

اور پھر اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ:۔

"جب کوئی قوم زندگی کی آسائشوں کو ڈھونڈنے لگے۔ جسم و جان کی راحتوں کو عزیز رکھے۔ سمجھ لیجیے کہ وہ اب غلام ہے یا بننے والی ہے۔ اسکا طبلِ جنگ تہی اور اسکا میخانۂ حیات خالی ہے"۔

(پیامِ اقبال)

نزولِ اشعار

علامہ اقبال کی شاعری کسبی نہ تھی وہبی تھی۔ اسکی خود علامہ اپنی آپ بیتی میں یوں وضاحت فرماتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس مجھے علیحدگی میں لے جاکر پوچھنے لگے، اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبر پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی۔ انہوں نے قرآن کو عربی میں منتقل کر دیا یا عبارت ہی اس طرح اتری تھی؟ مَیں نے کہا "یہ عبارت ہی اتری تھی" ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا۔ اقبال!! تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اسطرح اتری تھی"؟ مَیں نے کہا ڈاکٹر لوکس! یقین!! بلکہ میرا تجربہ ہے!!! جبکہ مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت کیوں نہیں اتری ہو گی"۔

جس پر پرنسپل موصوف اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ جو لوگ از راہ بغض و حسد علامہ اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے، انہیں کیا معلوم کہ اقبال بذاتِ خود شاعری کا شائق نہ تھے۔ بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ نے شاعری کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر چونکہ اس دور کے لئے نظم ہی اصلاح عوام کا بہترین ذریعہ تھی۔ اس لئے مقلب القلوب نے علامہ اقبال کو یہ ارادہ ترک کرنے کی صرف توفیق ہی نہ بخشی۔ بلکہ آپ کی دستگیری بھی کی۔ جس کی تفصیل خود علامہ اقبال نے اپنی آپ بیتی میں یوں بیان کی ہے:۔

"جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے۔ تو سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں"۔

"یہ کیفیت تو مجھ پر سال میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے۔ لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے۔ اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصہ کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو پہلی کیفیت میں کہا گیا۔ آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے۔ گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ یہ فیضان کے لمحے، دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہوتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان۔ عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں"۔

"ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں، میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری

ہوگئی ۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی ۔
بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحرِ موّاج ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ یہ
کیفیتِ سرور و نشاط اتنی دیر قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے
جمود تعطل (قبض) کی تلافی کر دی "۔

سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزولِ وحی کے دوران بالکل ایسے ہی حالات
کا سامنا ہوا۔ اس لئے علامہ اقبال کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ:۔

" شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے ۔ اس لئے جب وہ کتاب پڑھتا
ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی
طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب
نہیں ہو سکتی "۔

(روزگارِ فقر۔ ۳۹ - ۴۰)

اسی لئے علامہ اقبال نے کہا ؎

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

آپ اپنے خطوط میں لکھتے ہیں :۔

" میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا ۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب
نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں ۔ فن شاعری سے مجھے
کبھی دلچسپی نہیں رہی ۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں ۔ جن کے بیان
کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے یہ طریقہ اختیار
کیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

خصائلِ اقبال

علامہ اقبال کو صرف شاعری کی نعمت ہی نہیں ملی تھی۔ ترنم کی فضیلت بھی عطا ہوئی تھی۔ پہلے تو آپ مولانا حالی کی طرح لاہور میں تنہائی محسوس کرتے تھے۔ لیکن جب آپ کے کلام کا چرچا عام ہونے لگا۔ اور آپ کے ترنم پر اہل ذوق پروانوں کی طرح جمع ہونے لگے تو آپ کی اداسی دور ہو گئی۔ آپ جب ترنم سے اپنا کلام سناتے تو خود بھی وجد میں آجاتے اور دوسروں کو بھی وجد میں لے آتے۔

آپ نے حافظہ بھی خداداد پایا تھا۔ آمد بھی غضب کی تھی۔ جب طبیعت شعر کہنے پر مائل ہوتی تو مسلسل شعروں کی آمد جاری رہتی۔ مگر آپ کو کبھی کاغذ قلم لیکر فکرِ سخن کرتے نہ دیکھا گیا۔ آپ جو کچھ کہتے۔ وہ اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ رہتا اور انہیں دوسرے اوقات میں آپ ضبط تحریر میں لاتے۔ آپ کے اشعار کی آمد چونکہ وہبی تھی۔ اسلئے آپ فرمائش پر شعر نہ کہہ سکتے تھے۔ بلکہ فرمائشوں پر معذرت کر دیتے تھے۔

علامہ اقبال نے اگرچہ ازراہِ کسر نفسی یہ فرمایا کہ وہ گفتار کے غازی ہیں۔ کردار کے نہیں۔ لیکن اگر ان کے مکاتیب میں ان کے کردار کی جھلکیاں دیکھی جائیں تو ان کا مثیل آج بھی کوئی نظر نہیں آتا آپ کے مطبوعہ خطوط بآنگِ دہل اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ علامہ اقبال کو شہرت سے نفرت تھی۔ اور زر و دولت۔ جاہ و مال سے محبت نہ تھی۔ آپ خود لکھتے ہیں:-

"میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کلیۃً ہمنوا ہیں۔ میں ریاکاری اور منافقت سے کوسوں دُور بھاگتا ہوں۔"

(اقبال از عطیہ بیگم)

"میں فقیر آدمی ہوں۔ مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت (نواب بھوپال) دیتے ہیں۔ میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئینِ جوانمردی نہیں ہے۔ کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے۔ جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے"

(اقبالنامہ)

حسن کردار کی ایسی تصویر تو اس دورِ زرگری میں چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی شاید نہ ملے۔

عقائدِ اقبال

علامہ اقبال کے عقائد ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ جیسا کہ ان کے کلام۔ ان کے خطوط اور ان کے وصیّت نامہ سے ظاہر ہے۔ جو اکتوبر ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا۔ اس میں آپ صاف لکھتے ہیں کہ:-

"میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ علمی اعتبار سے امام ابو حنیفہ کا مقلّد ہوں"

آپ کے مختلف خطوط مندرجہ حرف اقبال یا اقبالنامہ میں مندرجہ ذیل فقرات آپ کے عقائد پر مزید روشنی ڈالتے ہیں کہ:-

"میں روحانیت کے قرآنی مفہوم اور روحانی طاقت کا قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔۔۔۔ ذاتی طور پر میں اللہ سے ہدایت کا طالب ہوں"

"میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی

صحبت سے اس طرح مستفیض ہو سکتے ہیں۔ جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے"
(مکاتیب اقبال ص۱۴۱)

"علماء ہمیشہ سے اسلام کی قوت عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں" (حرف اقبال ص۱۶۲)

"قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیئے۔ تاکہ قلب محمدی نسبت پیدا کرے۔ اس نسبت محمدیہ کی تولید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ قرآن کے معانی بھی آتے ہوں۔ خلوص و محبت کے ساتھ محض قرأت کافی ہے"

(مکاتیب اقبال ص۴۰)

"دین کی اصل حقیقت آئمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے سے کھلتی ہے اور آجکل زمانے کا اقتضاء یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے عملی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے"

(مکاتیب اقبال ص۲)

"مجھے اس جماعت (علماء) سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب۔ اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا ہے جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی ہے"

(حرف اقبال ص۲۹)

"اسلام، تہذیب حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نہ یہ کہ ان چیزوں کو جزو اسلام بنا لیا جائے"

(ملفوظات اقبال ص۲۰۹)

ان ارشادات اقبال کی روشنی میں ان تمام مفروضات کی تردید ہو جاتی ہے۔

جو مختلف مکتب فکر کے لوگوں نے علامہ اقبال سے منسوب کئے اور جو لوگ آج علامہ اقبال کو سوشلزم کا حامی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ آپ کے ان نظریات سے ان کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔

فکرِ اقبال

علامہ اقبال قدرت کا ایک ایسا عطیہ تھے جو اکثر و بیشتر ایسے وقت میں ملتا ہے۔ جب کسی قوم کے قویٰ و اعضا مضمحل اور مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اس میں از سر نو ایک نئی روح پھونکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال کو شروع سے فکر رسا عطا ہوئی تھی۔ اربابِ قضا و قدر شروع سے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیونکہ ان سے تعمیرِ ملت کا کام لیا جانے والا تھا۔ آپ کو متوازن طبیعت عطا ہوئی تھی۔ آپ کی فکر و نظر میں کوئی افراط و تفریط نہ تھی۔ بحرِ جذبات میں کبھی ڈوبے نہ تھے۔ کمال تو یہ ہے کہ آپ کا عنفوانِ شباب انگلستان کی جمالیاتی اور رومانوی دنیا میں گزرا جہاں اکثر نوجوان کسی نہ کسی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر بن کر رہ جاتے ہیں یا اپنا دین و ایمان ہی گنوا آتے ہیں۔ مگر علامہ اقبال نے حسن و جنس کی اس دنیا میں کچھ کھونے کی بجائے بہت کچھ پایا۔ وہاں کی تہذیب و تمدن۔ ثقافت و سیاست نفرت و عداوت بوالہوسی اور مادہ پرستی نے علامہ اقبال کی فکری دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا جسکا خود علامہ اقبال نے ان الفاظ میں اعتراف کیا کہ:۔

"یورپ نے مجھے مسلمان کر دیا"

اس مسلمانی کی وضاحت ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے یوں کی ہے:۔

"اسی دور میں اقبال کے ذہن پر اس دین کی آفاقیت پوری طرح آشکارا ہوئی جو رنگ۔ نسل۔ زبان اور وطن کی تمام عصبیتوں کو مٹا کر عالمگیر اخوت و محبت اور احترام آدمیت کا پیغام دیتا ہے۔ اب انہیں اس آئین کی جامعیت کا کامل شعور حاصل ہوا۔ جو عدل و مساوات کی بنیاد پر ایک

ایسا آزاد و خوش حال، منظم و مربوط معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ جس میں ہر فرد اور ہر طبقے کے حقوق محفوظ ہوں اور اسطرح انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی اور اعتدال و توازن پیدا کرتا ہے۔ اب انہوں نے اس ملّت کے مقام و منصب کو سمجھا۔ جسے خدا نے امۃ" وسطاً قرار دیا ہے۔ تاکہ وہ ایک انسان کاملؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے دنیا کے سامنے عناصرِ حیات کے حسنِ تناسب و توازن کا کامل نمونہ پیش کرے۔"

(شذرات فکر اقبال صد ۱۳)

نظریاتِ اقبال

اسی غرض کے لئے علامہ اقبال نے قیام پاکستان کی ضرورت سمجھی تھی۔ پاکستان بن گیا۔ مگر افسوس کہ وہ ضرورت آج تک پوری نہ ہوئی اور اسلام کی بجائے یہاں آہستہ آہستہ سوشلزم لایا جارہا ہے۔ جس کے انجام کی علامہ اقبال خود یوں پیشین گوئی فرماگئے ہیں :-

" ہمارے ملّی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو۔ جونہی یہ گرفت ڈھیلی پڑی ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ شاید ہمارا وہی انجام ہو۔ جو یہودیوں کا ہوا"۔

(ایضاً صد ۸۵)

علامہ اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اللہ آباد کانفرنس میں اسی غرض کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ "ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے"۔ اور اس کی تائید میں یہ دلیل دی کہ :-

" مسلمانانِ ہند اس وقت اپنی زندگی کے نازک دور میں سے گزر رہے ہیں۔ اس کے لئے کامل تنظیم اور اتحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے (کیونکہ) ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے۔ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں

اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائے گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائیگا۔"

اسی لئے پاکستان کی جنگ نکتہ "لا الہ الا اللہ" پر لڑی گئی اور معمار پاکستان حضرت قائدِ اعظم نے کھلے لفظوں میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جنگِ پاکستان کسی ٹکڑۂ زمین کے حصول کے لئے نہیں لڑی جا رہی بلکہ اس کا مقصد یہاں اسلام کا ایسا مثالی نظام قائم کرنا ہے۔ جو دنیا کی رہنمائی کر سکے۔ مگر یہ پاکستان کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی کہ پاکستان بننے کے بعد اس کی عنانِ اقتدار مغرب زدہ لوگوں کے ہاتھ میں آئی اور انہوں نے پاکستان کو اس تہذیب و تمدن کا نمونہ بنانے کی ٹھانی جسکے خلاف علامہ اقبال ساری عمر جہاد کرتے رہے۔ اس طبقہ نے علامہ اقبال کی ساری عمر کی کمائی کو خاک میں ملا دیا۔

تعلیماتِ اقبال اسلامیت کے روح مجسم اور اسلام کے اس پیغامبر کے پیغام کی روح کو سمجھنے کے لئے قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ کسے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے کیونکہ انہوں نے اپنے پیغام میں زیادہ تر قرآنی آیات۔ صحیح احادیث اور سلف کے نظریات کی ترجمانی کی ہے۔ اور ان پر اپنے فکر و فلسفہ کی بنیاد رکھی ہے۔ اسی کی بنا، پر انہوں نے عصرِ جدید کو للکارا ہے۔ وطنیت کا بت توڑا ہے۔ دنیائے اسلام کو بیداری کا پیغام دیا ہے۔ مردہ دلوں میں زندگی کی رمق پیدا کی ہے۔ مسلمانوں کو رنگ و نسب کے امتیاز سے بچایا ہے۔ فرد کو ملت سے وابستہ رہنے کی تاکید ہے۔ سکون و جمود کو خودکشی قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو شک کی دلدل سے نکال کر یقین کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ آپ نے دل و دماغ اور روح و

جسم کی آزادی کو لازمی قرار دیا ہے۔ مادیت کو شیطانِ دوراں قرار دے کر مسلمانوں کو روحانیت کے ذریعہ تسخیرِ عالم کا بھولا ہوا سبق یاد کرایا ہے۔ مغربی تہذیب کو تعذیب ثابت کیا ہے۔ انسان کو خودنگر۔ خودشناس اور خودگر بننے کی تلقین کی ہے اور اسے کہا ہے کہ وہ چڑیا بننے کی بجائے شاہین اور بھیڑ بننے کی بجائے شیر بنے تاکہ اسکی کمزوری سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ انہوں نے آئینِ قرآن پر چلنے اور اپنی مخصوص قومی روایات کے تحفظ پر بڑا زور دیا ہے۔ دنیا کی سیاسیات کی خامیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کر کے فطرت اللہ کی سیاسی حقیقتوں سے آگاہ کیا ہے۔ اور جہاں جہاں بھی کوئی خرابی نظر آئی ہے۔ اس کی فوراً نشاندہی کی ہے۔ تاکہ یہ دنیا صحیح معنوں میں ایک جنت بن جائے اور یہ امتِ مسلمہ اقوامِ عالم کی رہنمائی کا فریضہ حسب سابق باحسن طریق ادا کر سکے۔ غرض کہ اس مردِ مجاہد نے مسلمِ خوابیدہ کو بیدار کرنے اور اسکے وقار و عظمت کو بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

درویشانہ سادگی علامہ اقبال اگرچہ ڈاکٹر اور سر بھی تھے۔ مگر آپ کی روزمرہ کی زندگی میں ایسے طبقہ کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ آپ کی تمامتر زندگی بالکل حکیمانہ۔ درویشانہ اور قلندرانہ انداز میں گزری۔ اگرچہ آپ کبھی کبھار انگریزی وضع یا سوٹ بوٹ میں نظر آتے تھے۔ مگر سوٹ بوٹ والوں کی طرح آپ رئیسانہ اور عیش پسندانہ زندگی نہ گزارتے تھے۔ بلکہ بالکل صوفیانہ انداز سے رہتے تھے۔ آپ کو نہ کھانے کی فکر ہوتی نہ کپڑے کی۔ بلکہ خانہ اور اہل خانہ، دونوں سے بے نیاز اپنا زیادہ تر وقت مطالعہ میں گزار دیتے تھے۔ صوفیوں اور درویشوں کی طرح بہت کم کھاتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ البتہ سحرخیز ضرور تھے۔ آپکا ناشتہ مختصر ہوتا۔ اور کھانا بالکل سادہ۔ جو اکثر آپ چارپائی پر ہی کھالیا کرتے تھے۔ میز کرسی پر کھانے کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا اور نہ راہبانہ انداز تھا۔ آپ کی رائے تھی کہ جو چیز

بھی کھائی جائے۔ خوش ذوقی سے کھائی جائے۔ اسکا ذائقہ عمدہ ہو۔ رنگ اور بو خوشگوار ہو۔ پھلوں میں آم کے عاشق تھے۔ اور غذاؤں میں کباب اور بریانی بڑی مرغوب تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ "یہ اسلامی غذا ہے"

وضع ولباس میں بھی سراپا سادگی تھی۔ ابتداً شلوار اور کُرتہ پہننے کے عادی تھے۔ اور سر پر سفید پگڑی یا لنگی باندھتے تھے۔ ولایت جانے کے بعد انگریزی لباس بھی پہننا پڑا۔ مگر ولایت سے واپس آنے کے بعد آپ عام طور پر شلوار۔ قمیض اور فراک۔ کوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ اگر کبھی پتلون پہننے کی ضرورت پیش آتی تو اس کے ساتھ بھی ہیٹ کی بجائے ترکی ٹوپی ہی پہننے کے عادی تھے۔ کیونکہ آپ کو انگریزی لباس پسند نہیں تھا۔ بلکہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے جاوید اقبال سے اس کی ناپسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ :-

"مجھے پتلون سے شلوار زیادہ پسند ہے"

حسنِ استغناء

استغناء وخودداری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ پنجاب میں یہ تحریک اٹھی کہ دو لاکھ روپیہ جمع کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ تاکہ آپ بے فکری سے شعر وسخن میں مصروف رہیں۔ جب اخبارات کے ذریعہ آپ کو اسکا علم ہوا تو آپ نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی اور فرمایا:-

"اوّل تو میری خودداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ غریب قوم پر ایسی رقم کا بوجھ ڈالوں۔ دوسرے یہ کہ ہر شاعر۔ ادیب اور آرٹسٹ کا فن اس وقت تک زندہ رہتا ہے۔ جب تک وہ زندگی کی تگ ودو میں شریک ہے۔ جو لوگ دنیا کے ہنگامے سے کٹ کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یا بغیر مشقت کے آرام وراحت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اس الہام سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جو صرف

زندگی کے اتار چڑھاؤ میں براہِ راست شریک ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے :

ایک آرٹسٹ کا نقطۂ نگاہ اور نصب العین عوام کے نقطۂ نگاہ اور نصب العین سے مختلف ہوتا ہے۔ اس ندرت و ذوقِ نظر کے باعث فرد اور سوسائٹی میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس تصادم سے ایسی چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔ جن سے آرٹسٹ کا فن حیاتِ تازہ حاصل کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے اوقات کا بیشتر حصہ فکرِ معاش اور دنیوی مکروہات میں ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر میں زندگی کی کشمکش سے علیحدہ ہو جاؤں تو میری شاعری بھی اس تڑپ سے محروم ہو جائے گی۔ جس کا سب سے بڑا منبع خود زندگی ہے"۔

(اقبال کامل صہ۱۸)

ڈاکٹر صاحب کو آخیر زندگی میں بڑے سخت امتحان اور کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ کیونکہ طویل علالت کی وجہ سے آپ کو وکالت کا پیشہ ترک کرنا پڑا۔ اس کے بعد آپ کی زندگی میں کسبِ مال اور حصولِ منصب کی کئی صورتیں پیدا ہوئیں۔ مگر آپ نے ازراہِ غیرت و خودداری ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کیونکہ آپ کی استغنا پسند اور فقیرانہ طبیعت کسی قسم کے احسان یا منت پذیری کو عالمِ تصور میں بھی برداشت نہ کرتی تھی۔ اسی لئے آپ نے ہز ہائی نس آغا خان کا وظیفہ قبول نہ کیا اور آپ کی علالت کے زمانہ میں نظام دکن کی طرف سے ازراہِ تواضع جو ایک ہزار کا چیک آیا تھا۔ وہ آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں سمجھا۔

فقیرانہ فیاضی

فقرار کی طرح آپ کا دل بھی مال و دولت میں اٹکا ہوا نہ تھا۔ بلکہ فقیری میں بھی امیری نمایاں تھی۔ جہاں دوسرے لوگ ہمیشہ امرار و سلاطین سے زر و مال کی توقع رکھتے ہیں۔ وہاں آپ کو امرار سلاطین کی خدمت میں اپنا ذاتی سرمایہ بطور نذرانہ پیش کرنے میں بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ جب مرحوم نادر شاہ افغانستان جاتے ہوئے لاہور سے گزرے تو علامہ اقبال انہیں ملنے اسٹیشن پر تشریف لے گئے اور ان کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ آپ جس مہم پر جا رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو روپے کی ضرورت ہوگی۔ نادر شاہ آپ کے حال سے بخوبی واقف تھے کہ یہ کوئی دولتمند نہیں ہیں۔ اس لئے اس نے کہا کہ تم خود ایک غریب آدمی ہو۔ اس لئے مَیں تم سے روپیہ لینا نہیں چاہتا۔ علامہ نے فرمایا کہ مَیں بلاشبہ غریب آدمی ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس وقت میرے پاس آپ سے زیادہ روپیہ ہے۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس کس قدر روپیہ ہے؟ نادر شاہ نے تسلیم کیا کہ اس کے پاس بہت تھوڑے روپے ہیں۔ اس پر علامہ اقبال نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس پانچ ہزار روپے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو لے سکتے ہیں۔

آپ کو چونکہ مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اسلئے آپ کے پاس فارسی۔ عربی اور یورپین زبانوں کی پانچ سو سے زائد کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ جن کی نسبت آپنے قبل از وفات یہ وصیت فرمائی کہ یہ تمام کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں منتقل کر دی جائیں۔ جو جون ۱۹۳۹ء میں وہاں منتقل کر دی گئیں۔

خواہشِ اقبال

وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات نے جب آپ کیلئے فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تو آپ نے اسکے متعلق حسبِ ذیل بیان دیا۔

"موجودہ حالات میں ہماری قوم کی ضروریات اسقدر زیادہ ہیں کہ ان

کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہر چند کہ اس شخص کی شاعری نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی روح کو جلا کیوں نہ بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ لیکن قوم اور اسکی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔

آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علوم کی تحقیق کے لئے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک چیئر (اسلامک ریسیرچ انسٹی ٹیوٹ) قائم کی جائے۔ جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسیرچ ہونی چاہیئے۔ اسلامی تاریخ۔ فقہ۔ دینیات اور تصوف سے جس قدر پنجاب میں جہالت برتی جا رہی ہے اور اس جہالت سے جسقدر فائدہ اربابِ غرض نے پنجاب میں اٹھایا ہے۔ اس کی مثال ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔

اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی طرزِ حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا۔ اور اس مقصد اور پیغام کو کس طرح تہہ در تہہ پردوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی روح کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے۔ ان پردوں کو اب اٹھانا چاہیئے۔ تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہو سکیں۔

مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی یہ ادارہ بیحد مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما ہے تو دوسری طرف اس نے نوعِ انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس تجویز کو پنجاب کے وزیرِ اعظم پسند فرمائیں گے۔

اور اپنے اثر و رسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔

تاہم میں ایک سو روپے کی حقیر رقم اس مجوزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ء)

۱۳ مئی ۱۹۳۸ء کو انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل نے علامہ اقبال کی اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اسے آج تک عملی جامہ پہنانے کی کسی کو توفیق نصیب نہ ہوئی۔ حالانکہ اقبال خواہ طبقہ میں صاحبِ اقتدار بھی رہے۔ اربابِ ثروت بھی رہے اور حضرات اخلاص و شعور بھی رہے۔ مگر کوئی ایسا صاحبِ دل طبقہ ایسا نہ نکلا جو اسلام اور اس کے پیغام کو عام کرنے کی خاطر اس کام کی اہمیت کو سمجھتا اور علامہ اقبال کی اس آخری آرزو کو پورا کرتا۔

دولت اور شہرت

موجودہ دور میں جب شہرت اور دولت ہی انسان کا مقصدِ حیات بن کر رہ گئی ہے۔ علامہ اقبال کو ان دونوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ علامہ اقبال پر مالی مشکلات کا دور بھی آیا۔ مگر آپ نے بڑی پامردی اور حقیقت پسندی سے ناسازگار حالات کا مقابلہ کیا۔ ملازمت آپ کو راس نہ آئی۔ کیونکہ نوکری کو آپ بے باکانہ اظہارِ خیال کی آزادی میں مخل سمجھتے تھے۔ حالانکہ برطانوی عہد حکومت میں آپ جیسی قابلیت کے آدمی کے لئے ملازمت کی بہت بڑی گنجائش تھی۔ مگر آپ نے نوکر ہونا پسند نہ کیا۔ آپ نے عطیہ بیگم کو جو خطوط وقتاً فوقتاً لکھے۔ ان سے ان نامساعد حالات کا پتہ چلتا ہے۔ جن سے علامہ اقبال کو گزرنا پڑا۔ ایک خط میں آپ لکھتے ہیں:۔

"میں کسی ملازمت کا خواہاں نہیں۔ میرا تو یہ ارادہ ہے کہ جسقدر جلد ممکن ہو۔ اس ملک سے بھاگ جاؤں . . . میری زندگی نہایت المناک ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی حصولِ مسرت کا حق ہے۔

اگر معاشرہ یا فطرت، مجھے اس حق سے محروم رکھنا چاہے۔ تو میں دونوں سے بغاوت کرونگا۔ اب یہی چارۂ کار باقی ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے اس بدبخت ملک کو خیر باد کہہ جاؤں۔ یا مے نوشی میں پناہ ڈھونڈوں جو خودکشی کو آسان تر بنا دیتی ہے۔ کتابوں کے یہ بے جان۔ بنجر اوراق مجھے مسرت نہیں دے سکتے۔ میری روح کی گہرائیوں میں اتنی آگ دبی ہے کہ ان سب کو اور تمام معاشرتی رسوم کو بھی جلا کر راکھ کر دے۔"

(اقبال۔ از عطیہ بیگم صد ۳۶-۳۷)

ایک دوسرے خط میں زمانہ کی ناقدر شناسی کا شدید شکوہ ان الفاظ میں کیا۔
"میری زندگی سیدھی سادی۔ دیانتدارانہ زندگی ہے۔ میرا دل میری زبان سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لوگ ریاکاری کا احترام اور تعریف کرتے ہیں۔ میں ریاکاری سے حاصل کی ہوئی شہرت۔ عزت اور عقیدت کے مقابلے میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ گمنامی میں مر جاؤں اور کوئی مجھ پر آنسو بہانے والا نہ ہو۔ رائے عامہ کے عفریت اپنی عقیدت و احترام کی غلاظت ان لوگوں کو بخش دیں۔ جو ان کے باطل اقدار دینی و اخلاقی کے مطابق عمل کرتے اور زندگی گزارتے ہیں۔ میں اتنا پست نہیں ہو سکتا کہ ان رسوم و روایات کا احترام کروں۔ جو انسانی ذہن کی فطری آزادی کو کچل دیتی ہیں۔"

(ایضاً صد ۴۹)

آپ ان دنوں اتنے مغموم تھے کہ عطیہ بیگم کو اپنے ۷، اپریل ۱۹۱۰ء کے خط میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ:۔
"لیکن اب میرے دل میں شاعری کے لئے کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ مجھے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے میری شاعری کی حسین دیوی کو قتل کر دیا ہے اور میں تخیل سے یکسر محروم کر دیا گیا ہوں۔ اور رنگ زیب پر میری وہ نظم جو ان کے مزار کی حالیہ زیارت کے بعد لکھی گئی۔ شاید میری آخری نظم ہو۔" (ایضاً صہ ۶۸-۶۹)

یہ علامہ اقبال کی فطرت کا کمال تھا کہ وہ حادثاتِ غم سے بجھنے کی بجائے ابھرتی اور اور چمکتی ہی رہی اور علامہ اقبال غم کی تخلیق اور تعمیر قوتوں کو شخصیت کی تکمیل کے لئے ناگزیر قرار دیتے ہوئے امن و سکون سے اس وادی سے گزرتے ہی رہے۔

داغِ مفارقت آخر رو بہ زوال قوم میں قرآن کی روح پھونکتے پھونکتے تھک کر اسرارِ قدرت کا محرم اور رموزِ فطرت کا آشنا حکیم الامت علامہ اقبال اس دنیا کو اس کے حال پر چھوڑ کر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے ابدی وطن کو واپس لوٹ گیا اور آپ کے رفیقِ سفر مورخِ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی نے آپ کی مفارقت پر یوں قائم کیا:۔

"صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبلِ ہزار داستان اب ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا۔ وہ (متحدہ) ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول، شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا۔ اسکی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم۔ اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق اس کے شعر کا ہر پرِ پرواز بالِ جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی۔ لیکن اس

کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاراللہ باقی رہے گا۔ امید ہے کہ ملّت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا۔ اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے۔

آہ

اقبالؔ ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروانِ ملّت کا رہنما اقبال، ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا اور ۳۸ سال گزر جانے کے باوجود اس کا آج تک کوئی جانشین پیدا نہ ہوا۔ اور نہ قوم نے اس کے پیغام پر عمل کیا۔

(۱۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی

مردِ حق

شیخ الاسلام۔ امام المفسرین۔ شیخ الحدیث۔ محققِ اسلام۔ دانائے شریعت ماہرِ رموزِ دین۔ قادر الکلام مقرر۔ بلیغ البیان خطیب۔ عاملِ قرآن۔ چراغ محفلِ عرفان۔ جہاندیدہ ادیب۔ حکیمِ ملت۔ صاحب نظر نائب رسول۔ داعی الی اللہ۔ پیکرِ عزم و استقلال۔ علامۂ عصر مولانا شبیر احمد عثمانی کا سلسلہ و شجرۂ نسب خاندان ولی اللہی سے ملتا ہے۔ جس میں بڑے بڑے جلیل القدر محدث و مفسر پیدا ہوئے۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کے علوم و معارف کے جانشین اور سیاسی و علمی امور کے ترجمان تھے۔ آپ پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم کا عکس اور پرتو سایہ فگن رہا۔ انہوں نے احیاء اسلام کی جس سیاسی اور علمی تحریک کا آغاز کیا۔ آپ نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں زندگی کے آخری لمحہ تک معمار پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کا ساتھ دیا اور پاکستان بننے کے بعد اور قرارداد مقاصد پاس کرانے سے قبل قائدِ اعظم کے جانشین دستور اسلامی کے سلسلہ میں جو حیلہ سازیاں کر رہے تھے۔ آپ نے انہیں کھلے لفظوں میں چیلنج کیا کہ:۔

"اگر اسلامی دستور کو آئندہ حسب وعدہ پاکستان میں رائج کرنے کو پسِ پشت ڈالا گیا تو میرا راستہ اور ہوگا اور آپ کا اور! نہ صرف یہ بلکہ میں قوم کو بتادوں گا کہ اہلِ اقتدار دستور اسلامی کے سلسلہ میں اچھی نیت نہیں رکھتے۔"

(تجلیات عثمانی صہ ۴۶)

قرارداد مقاصد اسی چیلنج کا نتیجہ تھی اور اسی مردِ حق کی تخلیق جو پاکستان کی دستور اسمبلی نے پاس کی۔ جسے آئینِ پاکستان کے دیباچہ کی حیثیت دی گئی۔ مگر اربابِ اقتدار کو اسے صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ اسلئے نظامِ اسلام کے وہ نظارے

یہاں دیکھنے نصیب نہ ہوئے جو سعودی عرب میں نظر آرہے ہیں۔

مکتبِ فکر آپ متحدہ ہندوستان کی مایہ ناز یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کے متعلم اور معلم رہے۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کے ممتاز شاگردانِ رشید میں سے تھے جن کے سامنے مولانا مفتی کفایت اللہ، مفتیِ ہند۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا سید انور شاہ کشمیری نے بھی زانوئے تلمذ تہ کئے تھے۔

خاندانی اور علمی نسبت کا اثر بچپن سے نمایاں تھا۔ آپ اپنے ہم عصروں کے ساتھ کھیل کود یا سیر و تفریح میں قطعاً شریک نہ ہوتے تھے۔ لہو ولعب سے آپ کو طبعاً نفرت تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی تعلیم کا ایسا شوق لگا کہ مدرسہ کے اوقات سے فارغ ہونے کے بعد بھی آپ اساتذہ کی خدمت کے لئے پہنچ جاتے اور ان سے درس اخلاقیات حاصل کرتے رہتے تھے۔ شام کو گھر واپس لوٹتے اور رات بھر عبادت کرتے۔ شب بیداری کی عادت جب تجاوز کر گئی۔ تو صحت پر برا اثر پڑنے لگا۔ والدہ آپ کو عبادتِ شاقہ سے منع کرتی کہ اتنی شب بیداری مضرِ صحت ہے۔ جب صحت ہی نہ رہے گی تو پڑھو گے کیا؟ جب مشفق والدہ کا اصرار بڑھا تو فرمایا:۔

"اماں! اگر آپ مجھ کو حقیقی آرام دینا چاہتی ہیں تو شب بیداری سے منع نہ فرمادیں۔ اس ریاضت و عبادت سے مجھے جب اس فانی زندگی میں آرام ملتا ہے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آئندہ زندگی میں بھی حقیقی آرام میسر آجائے گا۔"

(حیات شیخ الاسلام صد ۱۳)

اس جواب نے جب آپ کی والدہ کو لاجواب کر دیا۔ تو وہ ماتا کی ماری آپ کے شفیق استاد حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پہنچی اور آپ سے تمام صورت حال بیان کر کے شاکی ہوئیں کہ:۔ "حضرت وہ کہنا نہیں مانتا۔ آپ اس کو منع فرمائیں۔" چنانچہ حضرت نے آپ

کو بلایا اور صرف اتنا فرمایا:۔

"شبیر! تم نے اپنی شب بیداری کی وجہ سے اپنی والدہ کو شکایت کا موقع دیا ہے۔"

جس پر آپ رو پڑے اور شب بیداری میں حدِ اعتدال پر آگئے۔ انیس بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

درس و تدریس

آپ کی علمی قابلیت و ذہانت کی وجہ سے آپ کو مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرسی مل گئی۔ مگر دو سال بعد آپ کو دیو بند واپس بلا لیا گیا۔ جہاں آپ اٹھارہ سال تک برائے نام تنخواہ پر بے لوث خدمت سرانجام دیتے رہے۔ چونکہ آپ نے اسی درسگاہ سے فیض حاصل کیا تھا۔ اسلئے آپ اس کو ایک احسانِ عظیم تصور کرکے پوری تنخواہ نہ لیتے تھے اور فرماتے تھے:۔

"میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اگر میں ان دنوں کی تنخواہ لے لوں۔ جن دنوں دارالعلوم سے غیر حاضر رہتا ہوں۔ پوری توجہ وانہماک سے ایک یا زیادہ دفعہ اپنے فرائض مکمل طور سے ادا نہ کرسکوں تو کہیں قیامت کو مجھ سے مواخذہ نہ ہو جائے۔" (ایضاً صد ۲۲)

علماء کرام کی صف میں اتنی بلند کردار شخصیت ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ ۱۸ سال دارالعلوم دیو بند میں علمی خدمات سرانجام دینے کے بعد وہاں کی فضا ناسازگار پاکر آپ ڈابھیل ضلع سورت چلے گئے۔ جہاں جامعہ اسلامیہ کے نام سے ایک اسلامی دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ یہ دینی درسگاہ تقریباً بارہ سال یعنی تقسیم ہند تک ترقی کرتی رہی۔

دو قومی نظریہ

دیو بند کی فضا سازگار ہونے پر آپ اس کی اعزازی خدمت بھی سرانجام دیتے رہے اور جن دنوں مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ہم خیال کانگرس کی حمایت میں سرگرم عمل تھے۔ آپ دارالعلوم کے طلباء و اساتذہ کو

کانگرس کی حمایت سے روکنے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہے۔ آپ بھی اپنے استاد و مرشد حضرت شیخ الہند کی طرح دو قومی نظریئے کے حامی تھے، فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"ہندوستان میں جو سیاسی کشمکش اس وقت جاری ہے۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل تنفّر بلکہ اشتعال انگیز جھوٹ اور سب سے بڑی اہانت آمیز دیدہ دلیری یہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ فرزندانِ اسلام کی مستقل قومیت سے انکار کر دیا جائے۔ دنیا میں مسلمانوں کی جو مختلف قومیتیں ہیں۔ وہ سہولتِ تعارف کے لئے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں پھر یہ محدود قومیتیں اسلامی قومیت کے بحرِ ناپیدا کنار میں گر کر ایک ایسی قوم کی تشکیل میں شامل ہو جاتی ہیں۔ جہاں ان کے سارے امتیازات اور تفرقے ختم ہو جاتے ہیں اس عالمگیر قومیت کا بیان مسلم شریعت کی اس حدیث میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام روحا میں ایک قافلے نے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ آنحضرتؐ نے ان سے دریافت فرمایا تم کون قوم ہو؟ جواب میں انہوں نے یہ نہ کہا کہ ہم حجازی۔ نجدی یا یمنی ہیں۔ یا قریش یا ہذیل یا تمیم یا کچھ اور ہیں۔ سب سے زیادہ قبائلی تعصب رکھنے والے ملک میں انکا جواب صرف یہ تھا کہ "ہم مسلمان ہیں"۔ گویا وطنی اور نسلی تعصب کے سب بت ٹوٹ چکے تھے اور بجز اسلام کے اب کوئی قومیت ان کے نزدیک باقی نہ رہی تھی۔

اس اساسی نقطہ نظر سے لامحالہ کل غیر مسلم قومیں دوسری قومیں سمجھی جائیں گی اور اب اس چیز کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے امتزاج سے کوئی متحدہ قومیت صحیح معنی میں بن سکے"۔

کانگرس مولویوں نے جب اس معاہدہ کا سہارا لینا چاہا۔ جو مدینہ میں مسلمانوں اور

اور یہودیوں کے مابین ہوا تھا تو آپ نے انہیں یہ بتلا کر خاموش کر دیا کہ :-

"اس معاہدہ میں مسلمان اور یہود کے متعلق " ملۃ واحدہ " کے لفظ نہیں محض " امۃ واحدہ " کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ اس معاہدہ کی اہم دفعہ جسے نظر انداز کیا جا رہا ہے ۔ یہ تھی کہ اگر کسی معاملہ میں فریقین (مسلمان اور یہود) کے مابین نزاع ہو گی تو آخری فیصلہ وہ ہو گا ۔ جو اللہ اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صادر فرمائیں گے ۔ کیا قومیت متحدہ کے علمبردار آج کوئی ایسی شرط ماننے یا منوانے کیلئے تیار ہیں ؟"

اسکا جواب بغلیں جھانکنے کے سوا کانگرسیوں کے پاس اور کچھ نہ تھا ۔

مجتہدانہ فیصلہ

مولانا شبیر احمد عثمانی جمعیتہ العلمار ہند کی مجلس عاملہ کے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۶ء تک رکن رہے ۔ جمعیتہ العلمار ہند مسلمانوں کی ایک فعال اور مؤثر تنظیم تھی ۔ لیکن اس نے اپنی اخیر عمر میں جب کانگرس سے پینگیں بڑھائیں تو اسکا یہ رویہ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا اور آپ نے اس سے دل برداشتہ ہو کر جمعیتہ العلمار اسلام کی بنیاد رکھی ۔ جسکا اجلاس کلکتہ میں ۲۶ تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ہوا ۔ اس میں آپ نے جو تاریخی پیغام بھیجا ۔ اسکے اہم نکات یہ تھے :-

۱ - سب سے زیادہ اشتعال انگیز جھوٹ یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمانان ہند کی مستقل قومیت کا انکار کر دیا جائے ۔

۲ - میں ایک طویل مدت کے غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کو حصول پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید و حمایت کرنی چاہیئے ۔ اگر اس وقت مسلم لیگ ناکام ہو گئی تو پھر شاید مدت دراز تک مسلمانوں کو اس ملک میں پنپنے کا موقعہ نہیں ملے گا ۔

۳ - وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ مسلمان مسلم لیگ کے بازو مضبوط کریں ۔

۴. مسٹر محمد علی جناح سیاسیاتِ حاضرہ کے داؤ پیچ سے مسلمانوں میں سب سے زیادہ واقف ہیں۔

۵. پھر وہ (قائدِ اعظم) نہ کسی قیمت پر خریدا جاسکتا ہے اور نہ کسی دباؤ کے سامنے سر جھکا سکتا ہے۔

علامہ عثمانی فرماتے تھے کہ :-

"ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔ جس کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لئے ضرورت ہے کہ اسکا کوئی مستقل مرکز ہو جہاں سے اس کے قومی محرکات اور عزائم فروغ پاسکیں اور جہاں سے وہ مکمل آزادی اور مادی اقتدار کے ساتھ اپنے خدائی قانون کو بے روک ٹوک نافذ کرسکے۔ بلکہ اس بے مثال قانونِ عدل و حکمت کا عملی نمونہ قائم کرکے دنیا کو وہ مشعلِ ہدایت دکھلاسکے۔ جسکی آج ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے"

(عصر جدید۔ کلکتہ ۲۱، نومبر ۱۹۴۵ء)

مسلم لیگ میں شرکت

ایک عالم باعمل کبھی بلا سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھاتا وہ ہر قدم اٹھانے سے قبل کئی بار اس بات پر غور کرتا ہے کہ اسکا یہ قدم کہیں عنداللہ یا عندالرسول موجب ناراضی تو نہ ہوگا۔ اور آیا اسکا کوئی جواز کتاب و سنت میں موجود ہے؟ مسلم لیگ میں شمولیت کا فیصلہ کرنے کے لئے آپ کو کئی مرتبہ اس مسئلہ کے حسن و قبح پر غور کرنا پڑا۔ بالآخر امام محمد بن حسن شیبانی (تلمیذ امام اعظم ابوحنیفہؒ) کی کتاب السیر الکبیر کی یہ تفریح آپ کے کام آئی کہ اگر خوارج کی جنگ مشرکین بت پرستوں کے ساتھ ہو جائے تو اہل حق مسلمانوں کو کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کفار و مشرکین کے مقابلہ میں خوارج کی مدد کریں۔ کیونکہ وہ اس وقت کفر (صریح) کے فتنہ کو دفع کرنے اور نقشِ اسلام کو ظاہر کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ چونکہ فقہ حنفی کا سارا مدار امام محمدؒ کی

ہی تصنیفات پر ہے۔ اس لئے آپ نے اس تصریح کی روشنی میں یہ فیصلہ فرمایا:۔

"اتفاق سے آج ہندوستان میں مسلم لیگ کا مقابلہ بھی کفار و مشرکین سے ہے اور مسلم لیگ میں شمار ہونے والے کلمہ گو مدعی اسلام ہیں۔ جو مسلمانوں کے قومی استقلال۔ سیاسی اقتدار۔ نفسِ کلمۂ اسلام کے اعلاء اور ملّتِ اسلامیہ کو مِن حیث المجموع، مضبوط۔ طاقتور اور سربلند کرنے کے لئے آئینی جنگ ان کفار اور مشرکین کے مقابلہ پر کر رہے ہیں۔ پھر مسلم لیگ میں شامل ہونے والے بے شمار آدمیوں میں ان چند باطل پرستوں کی تعداد اہلِ حق کی نسبت عشرِ عشیر بھی نہیں۔"

(خطبہ صدارت میرٹھ۔ مسلم لیگ کانفرنس ۲، دسمبر ۱۹۴۵ء)

اس فیصلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عثمانی کی نظر ان مسائل پر کتنی گہری تھی اور آپ کا اجتہاد کتنا صحیح تھا۔

شرفِ جانشینی اسی لئے جب بھی کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو آپ کے استادِ مکرم حضرت شیخ الہند وہ مسئلہ آپ کے ہی سپرد فرماتے۔ مثلاً حضرت شیخ الہند کی مالٹا سے واپسی کے بعد جب ترکِ موالات کی تحریک کے سلسلہ میں ان سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے اپنے تینوں شاگردوں مولانا مفتی کفایت اللہ۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو جمع کر کے فرمایا کہ آپ یہ فتویٰ لکھیں سب نے کہا کہ آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں گے۔ حضرت شیخ الہند نے یہ عذر فرمایا کہ:۔

"مجھ میں انگریزوں کی نفرت کا جذبہ شدت لئے ہوئے۔ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا (کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل سے نہ ہٹا دے)" (سوانح قاسمی جلد ۲۔ حاشیہ ص ۹۲)

ان ہر سہ حضرات نے ترک موالات پر جو فتوے لکھے۔ ان میں حضرت شیخ الہند کو مولانا عثمانی کا فتویٰ پسند آیا جو اٹھائیس صفحات پر مشتمل تھا اور جمیعتہ علمار ہند کے دوسرے سالانہ جلسہ منعقدہ۔ ۱۹ تا ۲۱، نومبر ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند کی زیرِ صدارت پڑھا گیا اور جس کا تذکرہ قرآن کریم مطبوعہ مدینہ پریس مترجمہ شیخ الہند میں تفسیر عثمانی سورہ آل عمران صہ۶۸ کے حاشیہ نمبر۸ پر موجود ہے۔

اسی طرح حضرت شیخ الہند کو مالٹا سے واپسی کے بعد جہاں جہاں سے بھی عقیدت مندوں نے بلایا آپ نے مولانا عثمانی کو ہی اپنے قائمقام یا ترجمان کی حیثیت سے بھیجا۔ اس طرح حضرت شیخ الہند نے آپ کو اپنی زندگی میں اپنا قابلِ فخر جانشین بنا دیا تھا۔

گائے کی قربانی تحریک ترک موالات۔ خلافت اور کانگریس میں اگرچہ ہندو مسلم اتحاد کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس آڑ میں اسلامی شعائر اور امتیازات کو مٹانے کی بھی در پردہ ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں۔ جن کا پتہ اس وقت چلا۔ جب ۱۹۲۱ء میں جمیعتہ علمار ہند کا سالانہ اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت لاہور میں منعقد ہوا اور اس میں ہندو مسلم اتحاد کی تقویت کے لئے گائے کی قربانی ترک کرنے کی کانا پھوسی ہونے لگی اور بالآخر بریلوی مکتب فکر کے مولوی فاخر صاحب نے اٹھ کر گائے کی قربانی کو ترک کرنے اور ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے اس اسلامی آزادی کو محدود کرنے کی پر زور تائید کر دی اور علی الاعلان حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام لے کر ان کو مخاطب کر کے کہا کہ:-

"اس تجویز کی مخالفت میں کسی کی پرواہ نہیں کی جائے گی"

(تجلیات عثمانی صہ۴۸)

مولانا شبیر احمد عثمانی اگرچہ اپنی تقریر کر چکے تھے۔ مگر وہ اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے اٹھے اور فرمایا:-

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ازواج مطہرات کے کہنے پر شہد کھانے سے اجتناب کرنے کا ارادہ ہی ظاہر فرمایا تھا کہ اس پر خدائے قدوس کی بارگاہ سے فوراً وحی آئی یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ (اے نبی اللہ نے جس چیز کو آپ کے لئے حلال کیا ہے۔ اسکو کیوں حرام کرتے ہیں۔ اپنی ازدواج کی خوشنودیاں آپ کو مطلوب ہیں؟) جب نبی اکرمؐ کو بھی کسی چیز کے خود حلال وحرام کرنے کا اختیار نہ تھا تو کسی کو یہ کب حق پہنچتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر میں غیر مسلموں کی خوشنودی کے لئے کتر بیونت اور حلال سے ممانعت کی تلقین کرے۔"

(ایضاً)

حق گوئی

یہی بات آپ نے حکیم اجمل خان۔ مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری کے سامنے دہرائی۔ جس کی مورخ اسلام مولانا سیّد سلیمان ندوی نے آپ کو ان الفاظ میں داد دی:۔

"گائے کی قربانی ترک کرنے کے مسئلہ میں بھی جس کو حکیم اجمل خان نے اٹھایا تھا۔ حضرت شیخ الہند کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت واشگاف تقریر فرمائی تھی۔ یہ ترجمانی اور نیابت مولانا شبیر احمد صاحب کے لئے نہ صرف فخر وشرف کا باعث بلکہ ان کی سعادت مندی اور ارجمندی کی بڑی دلیل ہے۔"

(معارف)

آپ کی تقریر کے بعد یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا اور پھر کسی کو گائے کی قربانی ترک کرنے کے جواز میں آواز نکالنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ یہ حقیقت سب پر آشکارا تھی کہ مولانا عثمانی حق گوئی۔ حق کوشی اور حق طرازی میں کبھی کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔

اسی لیئے آپ نے ترکِ موالات والے خطبہ میں اپنے اس مسلک کا کھلے طور پر ان الفاظ میں اظہار کر دیا تھا کہ

"مسلمانوں کی فلاح سے متعلق شرعی حیثیت سے جو میری معلومات ہیں۔ ان کو بلا کم و کاست آپ کے سامنے رکھدوں اور اس کی بالکل پرواہ نہ کروں کہ حق کی آواز سننے سے حضور وائسرائے بہادر مجھ سے برہم ہو جائیں گے یا مسٹر گاندھی یا علی برادران یا کوئی اور ہندو یا مسلمان"۔

(خطبہ ترکِ موالات صہ۲)

مولانا عثمانی حق بات کہنے میں بڑے بیباک اور نڈر واقع ہوئے تھے اور ہر معاملہ میں اپنی رائے بڑی آزادی سے پیش کرنے کے عادی تھے اور اس قومی جہاد کو جہادِ اکبر تصور کرتے تھے۔ حق بات کہنے میں آپ شاہ وگدا میں کوئی تمیز نہ کرتے تھے۔ شاہ افغانستان غازی امان اللہ خان کی بیگم ثریا کے پردہ اتارنے پر ملک کے اخبارات میں بالعموم اور پنجاب کے اخبارات" زمیندار" وغیرہ میں بالخصوص مضمون نگاروں نے اس پر بڑی لے دے کی۔ مگر کسی کو خود شاہ افغانستان کو تنبیہہ کرنے کی جراُت نہ ہوئی یہ صرف مولانا عثمانی کی ذات بابرکات تھی۔ جنھوں نے شاہ امان اللہ خان تک پہنچانے کیلئے یہ پیغام دیا۔

"کاش! کوئی صاحبِ ہمت دولت علیہ افغانستان کے امیر غازی اور ان کی ملکہ معظمہ ثریا جاہ کے سمع ہمایوں تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ پہنچادے۔ اے ابو عبیدہ تم دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل حقیر اور کمتر تھے۔ اللہ نے اسلام کے ذریعہ سے تمہاری عزت بڑھائی۔ پس جب کبھی تم غیر اللہ کے ذریعہ سے عزت حاصل کرو گے۔ خدا تم کو ذلیل کرے گا"۔

جراُت و بیباکی

نظام حیدر آباد دکن علامہ عثمانی کی تقریر میں بڑے ذوق و شوق سے سنتے تھے۔ اور آپ سے اتنے متاثر تھے کہ قیام حیدر آباد کے دوران

نظام اپنے خاصے سے علامہ عثمانی کے لئے کھانا بھیجتے تھے اور کبھی اپنے دسترخوان پر بلاکر مولانا کے ہمراہ کھانا کھانے کا شرف حاصل کرتے تھے۔ تین منٹ ملاقات کا وقت دیگر آپ سے مل کر نظام اتنے محظوظ ہوتے تھے کہ ایک ایک گھنٹہ لطف گفتگو میں گزار دیتے تھے نظام نے استدعا کی کہ آپ ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ پر دارالافتاء کی صدارت قبول فرماویں مگر آپ نے انکار کر دیا۔ تاہم نظام کے زیادہ اصرار پر آپ نے صرف دوسو روپیہ ماہوار وظیفہ لینا قبول کرلیا جو تقسیم ہند تک آپ کو ملتا رہا۔ مالی منفعت آپ کے نزدیک بہت بڑی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ مگر اس وظیفہ سے آپ کی حق گوئی متاثر نہ ہوئی اور آپ نظام کی موجودگی میں کھری کھری سناتے رہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:-

"ایک وقت ایسا آیا کہ جب نظام پر تفضیلیت کا غلبہ تھا اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے تو مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر فرمائی۔ جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشین طریقے سے بیان کئے تھے۔ اس دن لوگوں کو آپ کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی اور ان کے بیباکانہ اظہار حق کی سب نے تعریف کی۔"

(معارف اعظم گڑھ)

حسن خطابت

مولانا عثمانی بڑے خوش بیان مقرر تھے۔ جب تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو مجمع پر چھا جاتے تھے۔ آپ کا ایک ایک لفظ علم و عرفان کا سفینہ اور ایک ایک بات حقائق معارف کا دفینہ ہوتی تھی۔ آپ کی جادو بیانی کا مولانا ابوالکلام آزاد بھی لوہا مانتے تھے۔ قاری محمد کامل عثمانی دیوبندی کا بیان ہے کہ:-

"خلافت کے زمانہ میں بمقام الٰہ آباد ایک جلسہ ہوا۔ جس میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں شریک تھے۔ دونوں قریب قریب کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ناگاہ مولانا عثمانی کی تقریر کے کسی حصہ

نے ابوالکلام کو جھٹکا دیا اور اپنی طرف جذب کر لیا۔ گردن جھک گئی اور مولانا ابوالکلام ایسے محو تقریر ہوئے کہ مولانا عثمانی کی تقریر ختم ہو گئی اور سر اس طرح نیچے جھکا رہا۔ جب آزاد کے کان آواز سے لطف اندوزی نہ کر سکے تو سر اٹھا کر دیکھا۔ مولانا عثمانی بیٹھ چکے تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد نے پھر دوسرے اجلاس میں آپ سے تقریر کی فرمائش کی۔"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان دہلی لکھتے ہیں کہ

"مولانا عثمانی تقریر کے وقت عقل کو کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہونے دیتے تھے۔ جو بات کہتے تھے۔ ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ ناپ تول کر کہتے تھے۔ تحریک خلافت کا زمانہ حد درجہ اشتعال انگیز اور جذبات کی برانگیختگی کا عہد تھا اس زمانہ میں آپ نے کبھی بھی تقریراً یا تحریراً ایسی کوئی بات نہ کہی۔ جو صرف جذبات کا نتیجہ ہو"

(برہان۔ دہلی)

۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو آپ نے نوابزادہ لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کو قرارداد مقاصد کے متعلق تجویز پیش کرنے پر پاکستان کی مرکزی پارلیمنٹ میں یوں مبارک باد پیش کی :-

"یہ مبارک باد فی الحقیقت میری ذات کی طرف سے نہیں۔ بلکہ اس پسی ہوئی اور کچلی ہوئی روح انسانیت کی جانب سے ہے۔ جو خالص مادہ پرست طاقتوں کی حریفانہ حرص و آز ، رقیبانہ ہوس ناکیوں کے میدانِ کارزار میں مدتوں سے بڑی کراہ رہی ہے۔ اسکے کراہنے کی آوازیں اس قدر درد انگیز ہیں کہ بعض اوقات اس کے سنگدل قاتل بھی گھبرا اٹھتے ہیں۔ اور اپنی جارحانہ حرکات پر نادم ہو کر تھوڑی دیر کے لئے مداوا تلاش کرنے

لگتے ہیں۔ مگر پھر علاج اور دوا کی جستجو میں وہ اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ جو مرض کا اصل سبب ہے۔ اسی کو دوا اور اکسیر سے سوا سمجھ لیا جاتا ہے۔

یاد رکھئے۔ دنیا اپنے خود ساختہ اصولوں کے جال میں پھنس چکی ہے۔ اس سے نکلنے کے لئے جسقدر پھڑپھڑائے گی۔ اسی قدر جال کے حلقوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہوتی جائے گی۔ وہ صحیح راستہ گم کر چکی ہے اور جو راستہ اب اختیار کر رکھا ہے۔ اس پر جتنے زور سے بھاگے گی۔ وہ حقیقی فوز و فلاح کی منزل سے دور ہی ہوتی چلی جائے گی“۔

یہ اس روز کی طویل تقریر کا ابتدائی ٹکڑہ ہے۔ جس سے مولانا عثمانی کے شوکتِ بیان کا کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ جس سے جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے اخبار الجمعیۃ کی اس رائے کی توثیق ہوتی ہے کہ :-

”ہمیں حلقۂ علماء میں ایسا قادر الکلام مقرر اور ایسا بلیغ البیان خطیب شاید عرصہ تک میسر نہ آسکے گا۔ جب آپ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم و کمال کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور علم و عرفان کی سوتیں رہ رہ کر ابل رہی ہیں“۔

(الجمیعۃ ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

آپ کی تحریر ہو یا تقریر سلاست و فصاحت۔ متانت و بلاغت۔ شگفتگی و جامعیت کا مرقع ہوتی تھی۔

شوخیٔ تحریر

آپ کی تحریر کی شوخی اور اس کے ادبی رنگ کا اندازہ آپ کے ایک مضمون کے مندرجہ ذیل ٹکڑہ سے لگ سکتا ہے۔ جو آپ نے دار العلوم دیوبند کے دار الحدیث کی تعمیر کے سلسلہ میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کو متوجہ کرنے کے لئے لکھا۔ یہی رنگ آپ کی کم و بیش ہر تحریر پیش کر رہی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ :-

"عشق و محبت کی بحث میں تم نے لیلیٰ مجنوں کے تذکرے پڑھے۔ قیس و فرہاد کی داستانیں سنیں اور یہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ رات کے وقت جب شمع روشن ہوتی ہے تو ہزاروں پروانے اپنی چھوٹی چھوٹی ہستیوں کو کس، اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ شمع کی لَو پر نثار کرتے اور تن من کو جلا دیتے ہیں۔ لیکن تم کو کبھی ایسے پروانوں کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا جنھوں نے شمع کی آگ میں اپنے آپ کو اسلئے جلایا ہو کہ وہ جلنے سے بچ جائیں اور اس لئے فنا کیا ہو کہ وہ پھر کبھی فنا نہ ہوں۔ چمن میں خاموش پھولوں کے اردگرد سینکڑوں دفعہ بلبلوں کے چہچہے سنے ہوں گے۔ پر ایسا ایک دفعہ بھی نہ سنا ہوگا کہ شاہدِ گل تو خود چہچہا رہا ہو اور شور مچانے والی بلبلیں ساکت و صامت رہ کر اس کے ایک ایک لفظ کو چن رہی ہوں"۔

اس تمہید کے بعد کچھ آگے چل کر علامہ عثمانی نے لکھا،

"عرب کے خشک ریگستانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک غنچہ میں چٹک ہوئی۔ اور ایک ایسا پھول کھلا۔ جس کی مست کر دینے والی مہک کے سامنے مشک و گلاب کی بھی حقیقت نہ رہی اور جب بلبلوں کے دماغوں میں اس کی مدہوش کر دینے والی خوشبو پہنچی۔ تو انہوں نے جمع ہو کر خوب شور مچانا شروع کیا۔ اس پر چمنستان نبوت کا وہ گلِ سرسبد گویا ہوا اور اپنے نغمۂ طرب افزا سے سب کی زبانیں خاموش کر دیں پھر کیا تھا بلبلیں اس کے لحن داؤدی سننے کے لئے گردنیں جھکا جھکا کر اور پَر سمیٹ کر بیٹھ گئیں اور جو لفظ بھی اس کی زبان سے نکلا۔ اس کو اٹھا لیا اور جو کلمہ بھی سنا۔ اسکو فوراً دل کی تختی پر لکھ لیا"۔

(القاسم ماہ فروری ۱۹۱۷ء)

متذکرہ بالا اقتباسات ادبیت کے شاہکار ہیں۔ جو پورے شوکت دبدبہ کے ساتھ حقائق کو حسین استعاروں میں پیش کر رہے ہیں۔ یہی رنگ اخیر وقت تک آپ کی تحریروں میں موجود رہا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۴۶ء میں جمعیتہ العلماء اسلام کانفرنس لاہور کے خطبہ صدارت میں عرب کی حالت کا یوں نقشہ کھینچا:۔

"دیکھئے! دنیا کی فضاء کس قدر بھیانک اور کیسی تاریک نظر آرہی ہے۔ شیطانی طاقتوں نے کس قدر پرے جما رکھے ہیں امن و امان کی ایک کرن بھی کسی طرف نظر نہیں آتی۔ تیرہ و تاریک گھٹاؤں نے دن کو رات بنا دیا ہے۔ ان ہی خوفناک اندھیروں میں مکہ کی پہاڑیوں پر ایک چمک دکھائی دی۔ رحمت کا بادل زور سے گرجا اور کڑکا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جبل النور کی چوٹی سے دنیا کا ہادی اور شہنشاہ اکبر کا پیغمبر اعظم چمکتا ہوا اور گرجتا ہوا بارانِ رحمت کے ساتھ نزول اجلال فرما رہا ہے"۔

خراجِ تحسین حکیم الامت مجدد اعلیٰ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاں سے شاذ ہی کسی کو داد ملتی تھی۔ کیونکہ کوئی ان کے معیار کو نہ پہنچتا تھا۔ مگر علامہ عثمانی نے ان کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ۱۱۔۱۲ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ کو دارالعلوم دیوبند میں مجلس اصلاحِ نصاب کا اجلاس ہوا۔ جس کے حضرت تھانوی سرپرست تھے اور اس میں شرکت کے لئے مدرسہ فتحپوری دہلی سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس اجلاس کی کارروائی مولانا عبیداللہ سندھی نے تحریر کی جو بعد ازاں شائع ہوئی اس میں مولانا سندھی لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا کہ مولوی شبیر احمد صاحب مدرس اوّل مدرسہ فتحپوری دہلی کو چونکہ مولانا مرحوم کی کتابوں سے ایک خاص مناسبت ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا عمامہ ان کو دوں۔

آپ اس امر کا اعلان فرمائیں۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب نے حضرت مولانا کی اس قدر افزائی کا اعلان فرمایا۔ اس کے بعد حضرت سلطان العلماء مدظلہم (شیخ الہند مولانا محمود الحسن) سے اجازت لے کر مولانا اشرف علی صاحب عم فیضہم نے اپنا عمامہ مولوی شبیر احمد صاحب کے سر پر رکھا۔"

(روئداد موتمر الانصار ص ۵۹-۶)

استاد کے سامنے شاگرد کی یہ عزت افزائی کتنی بڑی سعادت تھی۔ اسی مجلس موتمر الانصار کے اجلاس اوّل بمقام مراد آباد میں علامہ عثمانی نے اپنا تاریخی مقالہ "الاسلام" جب پڑھا تو حضرت تھانوی نے اپنی تقریر میں آپ کی یوں حوصلہ افزائی فرمائی:۔

"جو دلائل عقلیہ وجود صانع حقیقی اور ضرورت نبوت و رسالت پر مولوی شبیر احمد صاحب نے بیان فرمائی ہیں۔ میں اب ان سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔"

(روئداد موتمر الانصار ص ۱۱۰)

مولانا عثمانی حضرت تھانوی سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ مگر آپکے علم و فضل کی وجہ سے حضرت تھانوی آپ کی بڑوں جیسی عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے وعظ کے دوران آپ نے مولانا عثمانی کو اپنے برابر کھڑا کر کے فرمایا:۔

"اگر کوئی میرا معتقد نہ مانے تو وہ جانے۔ میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ یہ مولوی شبیر احمد صاحب جن کی تقریر آپ نے سنی۔ میرے چھوٹے ہیں۔ مگر میں ان کو بڑا سمجھتا ہوں۔ ان کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ یہ سب کچھ کر لیں گے اب ہم کو موت کا ڈر نہیں رہا۔ کیوں کہ ہماری جماعت میں کام کے آدمی پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنا وعظ شروع کیا۔"

(ماہنامہ القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ ص ۳۹-۳۸)

حضرت تھانوی نے ارباب مسلم لیگ اور قائد اعظم محمد علی جناح کو تبلیغ کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً

جو وفد بھیجے۔ تو آپ نے ایک وفد کا علامہ عثمانی کو بھی امیر منتخب کیا؛۔

"۴، جون ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ارباب لیگ کو تبلیغ کرنے کی غرض سے حضرت تھانوی نے اس اجلاس کے زمانہ میں ایک تبلیغی وفد بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپ نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس وفد کا امیر مقرر فرمایا"۔

(سیرتِ اشرف صہ)

سلطان ابن سعود نے اپنے دور تسلط میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعض مزارات کے قبے لوگوں کو شرکیہ رسوم کی ادائیگی سے روکنے کے لئے منہدم کرا دیئے تھے۔ جس پر عالم اسلام میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں شاہِ حجاز سلطان ابن سعود نے ۱۳۴۳ھ میں موتمر اسلامی کے نام سے ایک خاص مجلس مکہ معظمہ میں بلائی۔ جس میں مختلف ممالک کے علماء کرام مدعو تھے۔ متحدہ ہندوستان کی طرف سے مجلس خلافت نے بھی ایک وفد اس اجلاس میں بھیجا۔ جس میں مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ شامل تھے۔ دوسرا وفد جمعیۃ العلماء ہند کی طرف سے بھیجا گیا۔ اس میں مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ۔ اور مولانا عبدالحلیم وغیرہ شریک تھے۔

شاہ سعود نے اس اجلاس خاص میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "کتاب و سنت سے ہم کو کوئی چیز الگ نہیں کر سکتی۔ خواہ دنیا راضی ہو یا ناراض! یہود و نصاریٰ مشرکین کو ہم اس لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ الفاظ شاہ ابن مسعود نے قبروں پر سجدہ کرنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے۔ مولانا عثمانی نے اپنی فقہی بصیرت سے یہ جواب دیا کہ:۔

"قبروں پر سجدہ کرنے والے مسلمان اس حکم میں نہیں آتے۔ جیسے یہود یا نصاریٰ یا بت پرست آتے ہیں۔ ہم انہیں دوسرے مشرکین کی طرح کافر نہیں کہیں گے۔

کیونکہ ہو سکتا ہے کہ سجدہ کرکے وہ اظہارِ عقیدت کر رہا ہو۔ اور اپنی عاجزی یا مسجود کا احترام سجدہ سے ارادہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے والدین اور ان کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ جسکا مقصد صرف احترام یوسف علیہ السلام یا اللہ کی قدرت پر سجدۂ حیرت و عظمت تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا۔ وہ سجدہ تھا۔"

اسطرح علامہ عثمانی نے مزارات پر سجدہ کو جائز قرار نہ دیا اور نہ ہی اسے عبادت قرار دیا۔ بلکہ فیصلہ نیتوں کے جاننے پر چھوڑا کہ ساجد کس نیّت سے سجدہ کر رہا ہے۔ مقصدِ سجدہ معلوم کئے بغیر ہم کو ساجد پر کفر کا فتویٰ لگانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اسطرح مولانا عثمانی نے بت پرستوں اور قبروں پر سجدہ دینے والے مسلمانوں کے مابین جو فرق واضح کیا۔ اس پر سلطان ابن سعود کا ماتھا ٹھنکا۔ سلطان ابن سعود کی مجلس علماء کے اعلیٰ رکن شیخ عبدالعزیز صدیقی کا بیان ہے کہ :-

"جلالت الملک سلطان ابن سعود مذہبی تقریروں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ شبیر احمد عثمانی کی تقریر سے بہت محظوظ اور متاثر ہوئے اور فرمایا کہ وہ لوگ سجود لغیر اللہ میں تقسیم کرتے ہیں اور شرک کے مراتب و مدارج بیان کرتے ہیں۔ یہ چیز پہلی دفعہ ہمارے کانوں نے سنی۔"

(ذاتی ڈائری ص ۲۷-۲۶)

شاہ ابن سعود نے خود حضرت عثمانی سے فرمایا:-

"میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے خیالات اور بیان میں بہت رفعت اور علو ہے۔ اور دقیق مسائل پر مشتمل ہے۔ لہٰذا میں ان تفاصیل کا جواب نہیں دے سکتا۔ اسکا جواب علماء بہتر دے سکیں گے۔ انہی سے یہ مسائل طے ہو سکتے ہیں۔" (ذاتی ڈائری شیخ الاسلام ص ۲۴)

تصنیف و تالیف

حضرت مولانا عثمانی اگرچہ صلبی اولاد سے محروم تھے۔ لیکن حق تعالیٰ نے آپکو ایسی معنوی اولاد سے سرفراز فرمایا۔ جسے تاقیام قیامت موت نہیں چھین سکے گی اور اس سدا بہار پھول پر کبھی خزاں نہ آئے گی۔

اس میں سرفہرست تفسیر عثمانی ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا نے ترجمہ قرآن کے بعد حواشی لکھنے شروع کئے ابھی سورہ بقرہ اور سورہ نساء تک ہی فوائد مکمل کئے تھے۔ کہ آپ کو آپ کے خالق نے واپس بلا لیا۔ اور اس نامکمل کام کی تکمیل کی سعادت علامہ عثمانی کے حصہ میں آئی اور آپ نے بقیہ ۲۶ پاروں کے حواشی تحریر فرمائے۔ جسکا افغانستان میں فارسی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ یہ واحد ترجمہ و تفسیر ہے۔ جسے بلا استاد پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد آپ نے بدوران قیام ڈابھیل شرح بخاری شریف بھی لکھی اور تین جلدوں میں مسلم شریف کی مستند شرح فتح الملہم تحریر فرمائی جسے پوری دنیائے اسلام نے پسند کی۔

آپ کے مقالات ہیں:- ۱۔ الاسلام (۱۹۱۱ء) ۲۔ العقل والنقل (۱۹۱۶ء)۔ ۳۔ اعجاز القرآن۔ ۴۔ الشہاب (۱۹۲۴ء)۔ ۵۔ معارف القرآن (۱۳۳۱ھ)۔ ۶۔ الدار الآخرہ (۱۹۱۲ء)۔ ۷۔ ہدیہ سنیہ (۱۹۱۸ء)۔ ۸۔ قرآن کریم میں تکرار کیوں ہے (۱۳۲۸ھ رمضان)، ۹۔ تحقیق خطبہ جمعہ (۱۹۱۴ء) ۱۰۔ سنیما بینی۔ ۱۱۔ لطائف الحدیث (۱۹۱۵ء) ۱۲۔ تشریح واقعہ دیوبند (۱۳۳۳ھ رمضان) ۱۳۔ حجاب شرعی (۱۹۲۷ء) ۱۴۔ سجود الشمس (ربیع الاول ۱۳۳۳ھ) ۱۵۔ خوارق عادات (معجزات) (۱۹۲۷ء) ۱۶۔ الروح فی القرآن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے خطبات ترکِ موالات ۱۹۲۰ء۔ مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ ۱۹۴۵ء۔ جمیعۃ العلماء الاسلام کانفرنس لاہور ۱۹۴۶ء، خطبہ صدر ڈھاکہ ۱۹۴۹ء۔ تقریر قرارداد مقاصد ۱۹۴۹ء اور مراسلات سیاسیہ ۱۹۴۵ء۔ مکالمۃ الصدرین ۱۹۴۵ء۔ پیغام موتمر کل ہند کلکتہ تاریخ پاکستان کے اہم جزو ہیں اور اپنے دور کے سیاسی مد و جزر پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایسی سدا بہار تحریریں ہیں

جن سے ہر وقت رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

تصوف و تقویٰ

علامہ عثمانی بڑے نازک طبع اور رقیق القلب تھے۔ خوف و خشیت کا اکثر طبیعت پر غلبہ رہتا تھا۔ اسی لئے نماز بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے اور توبہ و استغفار کی سخت تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ:۔

"تمام احکام بجا لا کر پھر اللہ سے معافی مانگو۔ کیونکہ کتنا ہی محتاط شخص ہو۔ اس سے بھی کچھ نہ کچھ تقصیر ہو جاتی ہے۔ کون ہے جو دعویٰ کر سکے کہ میں نے اللہ کی بندگی کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ بلکہ جتنا بڑا بندہ ہو۔ اسی قدر اپنے کو تقصیر وار سمجھے اور اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہے ہے کہ اے غفور و رحیم! تو اپنے فضل سے میری خطاؤں اور کوتاہیوں کو بھی معاف فرما"۔

تعلق باللہ پر آپ زیادہ زور دیتے تھے اور یہاں تک فرماتے تھے:۔

"علاوہ قیام لیل کے، دن میں بھی (گو مخلوق سے معاملات و علائق رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن دل سے) اسی پروردگار کا علاقہ سب پر غالب رکھیے اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اس کی یاد میں مشغول رہیئے۔ غیر اللہ کا کوئی تعلق ایک آن کے لئے ادھر سے توجہ کو نہ ہٹنے دے۔ بلکہ سب تعلقات کٹ کر باطن میں اسی ایک کا تعلق باقی رہ جائے۔ یا یوں کہہ لو کہ سب تعلقات اسی ایک تعلق میں مدغم ہو جائیں"۔

تعلق باللہ سے ہی خوف پیدا ہوتا ہے۔ جسکے حصول کا یہ طریقہ فرمایا:۔

"ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی یا دشمنی نہ روک سکے اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بننا سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا ڈر اور اس کی شانِ انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ، کے مضمون کا بار بار مراقبہ کرنے سے پیدا

ہوتا ہے۔ جب کسی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں تو قلب خشیتِ الٰہی سے لرزنے لگے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے گا۔"

یہ وہ اصول زندگی ہیں۔ جن پر آپ خود بھی عمل پیرا رہے اور دوسروں کو ان پر عمل کرنے کرنے کی ترغیب و تبلیغ فرماتے رہے۔

دورِ آزمائش جنگِ پاکستان کا ابتدائی دور قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے لئے بڑی آزمائش کا دور تھا۔ تمام مقتدر علمار نیشنلسٹ مسلمان احرار اسلام اور خدائی خدمتگار کانگرس کے پشت پناہ تھے۔ قائدِ اعظم کافر اعظم قرار دیئے جا چکے تھے مسلم لیگ سروں۔ خان بہادروں۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایک جماعت بن چکی تھی۔ عوام گومگو کی حالت میں تھے۔ ان کی ہر مرتبہ تان اس بات پر آکر ٹوٹتی تھی کہ علمار لیگ کے ساتھ نہیں۔ جسکا قدرت نے پہلے سے یہ انتظام کیا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کو حضرت قائدِ اعظم کا پشت پناہ بنا دیا۔ جن کی تائید و اعانت کے بعد قائدِ اعظم کو دوسرے علمار کے تعاون کی ضرورت نہ رہی۔ قدرت کی طرف سے قائدِ اعظم کی دوسری امداد یہ ہوئی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی ایسے متبحر عالم۔ متقی و پرہیز گار سیاستدان اور شعلہ بیان مقرر کو قائدِ اعظم کا دستِ راست بنا دیا۔ جنھوں نے بڑی سیاست سے کام لیتے ہوئے رائے عامہ کو ہموار اور تیار کرنے کے لئے سب سے پہلے جمعیۃ العلمار اسلام کی بنیاد رکھی اور اسکی متعدد اور مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کرکے اور ان میں اپنا پیغام بھیج کر یا خود پہنچ کر غیر شعوری طور پر لیگ کے حق میں فضا سازگار کی۔ خود جمعیۃ العلمار ہند سے مئی ۱۹۴۵ء میں علیحدہ ہوکر جمعیۃ العلمار اسلام کی اہمیت بڑھائی اور پورے پانچ ماہ نہایت خاموشی کے ساتھ ہوا کا رخ مسلم لیگ کی طرف موڑنے کے بعد مسلم لیگ میں شمولیت

کا اعلان کیا۔ جس سے قائدِاعظم کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔ اور انہوں نے عوامی محاذ مولانا عثمانی کی سپرد کرکے خود آئینی محاذ کو سنبھالے رکھا۔ قائداعظم کے دل میں مولانا عثمانی کی کتنی قدر واہمیت تھی۔ اسکا ان واقعات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ ۱۹۴۶ء کی دہلی کی عظیم الشان کنونشن میں علامہ عثمانی کو جب جائے قیام سے مقام کنونشن پر پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ تو قائدِاعظم نے آپ کی آمد تک کے لئے کارروائی اجلاس روک دی۔ اور جس وقت حضرت عثمانی کنونشن میں پہنچے تو ہزاروں کے مجمع میں قائداعظم کچھ دور تک آپ کے استقبال کے لئے بڑھے اور تمام مقتدر حضرات بہ ادب کھڑے ہو گئے۔

۲۔ جس وقت ریفرنڈم سر پر آیا۔ تو اس وقت آپ نے سلہٹ کے ریفرنڈم کے لئے مولانا ظفر احمد عثمانی سے اور سرحد کے ریفرنڈم کے لئے مولانا شبیر احمد عثمانی سے درخواست کی کہ وہ یہ مہم سر کریں۔ کیونکہ قائدِاعظم جانتے تھے۔ کہ ان علاقوں کو علماء حق ہی زیر کر سکتے ہیں۔ یہاں کسی دوسرے کا کام نہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانی نے علالت طبع کے باوجود سرحد کے طولانی اور طوفانی دورے کرکے خان برادران اور ان کے سرخپوشوں کو شرمناک شکست دی۔

۲۔ ریفرنڈم جیتنے کے بعد جب آپ حضرت قائدِاعظم کو مبارک باد دینے گئے۔ تو قائدِاعظم نے فرمایا:۔

"اس مبارک باد کے مستحق آپ ہیں۔ میں خواہ سیاست دان سہی۔ لیکن آپ نے بروقت مدد کرکے مذہب کی روح لوگوں میں پھونک دی"

(تجلیات عثمانی ص۲۹۶)

سلہٹ کا محاذ بھی مولانا ظفر احمد عثمانی نے جیت لیا۔ اسطرح ان حضرات نے مسلم لیگ کو دورِ آزمائش میں کامیاب کرایا۔ اگر یہ اکابر علماء ربانی بروقت مسلم لیگ کی مدد کو نہ پہنچے

تو دونوں جگہ ریفرنڈم کا نتیجہ ہندوؤں کے حق میں نکلتا۔ جبکی اس وقت کے تمام مسلم پریس نے تائید کی۔

اعتراف خدمات روزنامہ امروز نے اپنے امروز و فردا کے کالم میں ۱۷؍ دسمبر ۱۹۵۱ء کو لکھا۔

"مولانا عثمانی کی زندگی اور ان کے کارناموں سے پاکستانی عوام اچھی طرح آگاہ ہیں۔ کیونکہ ان کے تبحر علمی، ان کی راست بازی اور حق گوئی و حق شناسی نے کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کو راستہ سمجھایا۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ قائدِ اعظم کی سیاسی بصیرت اور قانونی مہارت کے ساتھ ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانی کے تبحر دینی اور فیض روحانی نے مسلمانوں کو وہ قوت بخشی کہ انہوں نے صدیوں کا راستہ چند برس میں طے کر لیا۔"

روزنامہ "احسان" لاہور نے اپنی ۱۴؍ دسمبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں آپکو یوں خراجِ تحسین پیش کیا۔

"جب کانگرس کے نام پر ہندو امپریلزم کے پھیلتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے علامہ عثمانی مسلم لیگ کے ہمنوا بنے تو عوامی اعتماد اور ہر دلعزیزی کی جس راہ کو طے کرنے میں دوسرے لیڈروں کو سالہا سال صحرا نوردی کرنی پڑی۔ اسے آپ نے چند ہفتوں میں طے فرما لیا۔"

مولانا نصراللہ خان عزیز ایڈیٹر تسنیم نے ۲۰؍ دسمبر ۱۹۴۹ء کے شمارہ میں لکھا۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تحریکِ پاکستان کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں اور بھی کئی عناصر کارفرما تھے۔ مگر اس تحریک کو مذہبی تقدس بخشنے والی ذات تنہا مولانا شبیر احمد عثمانی کی تھی۔ اگر وہ بھی ادھر نہ آجاتے تو عام مسلمانوں کو یہ یقین دلانا مشکل تھا کہ یہ تحریک مذہبی درجہ رکھتی ہے ..... اس

مقصد کا اعتبار قائم کرنے کے لئے مولانا شبیر احمد عثمانی کی حمایت سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی ۔"

پیشین گوئی

پاکستان بننے سے قریباً ایک سال قبل آپ نے لاہور کانفرنس کے خطبہ صدارت میں ہی پاکستان کے متعلق یوں پیش گوئی فرمادی تھی کہ:۔

" ہمارا عقیدہ ہے کہ تقدیر نے ہمیں پاکستان کے تحفظ کے لئے انتخاب کیا ہے اور یہ چیز آئندہ نسلوں کو ورثہ میں ملے گی ۔ امروز شاید ہمارا مذاق اڑائے ۔ لیکن ہماری آنکھیں صبح فردا کے اس دلفریب خندہ کا نظارہ کر رہی ہیں ۔ جس کے پردہ سے ہماری کامرانیوں کا مہر منیر طلوع ہوگا ۔ اس صبح امید کی نمود تک ہم نومیدیوں کی شب تار کو اپنی قربانیوں کے نور سے روشن رکھیں گے اور اسلام کے سچے فرزندوں کی طرح ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے ۔"

(خطبہ لاہور صہ ۱ - ۷)

(۱۵)

چوہدری رحمت علی

ہونہار طالب علم

۱۸۹۲ء میں موضع موہیر تحصیل و ضلع ہوشیار کے چوہدری شاہ محمد کے ہاں موتی موتی اور روشن آنکھوں والا ایسا لڑکا پیدا ہوا۔ جس کی آنکھیں ہر وقت بے قرار رہتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ تیز دماغ لڑکا کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔ جو صاحب نظر اسے دیکھتا، یہی خیال قائم کرتا۔ اس نے بھی ابتدائی تعلیم دین قصبہ کی مسجد میں پائی۔ مڈل قصبہ راہوں اور میٹرک اینگلو سنسکرت ہائی سکول جالندھر سے پاس کرنے کے بعد اس نے ۱۹۱۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور کا رخ کیا۔ جبکہ جنگِ بلقان و طرابلس ختم ہو چکی تھی۔ اور جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ترکی برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکا تھا۔ پنجابی طلباء تحریکِ مجاہدین میں شرکت کے لئے ہجرت کر کے سرحد پار جا رہے تھے اور آزادیٔ ہند کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ دور نہ صرف اسلامیانِ ہند کے لئے بلکہ مسلمانانِ عالم کے لئے بڑا نازک دَور تھا۔ اور دول یورپ عالم اسلام کو اپنے زیرنگیں رکھنے کے لئے مختلف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھیں۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ مگر ہندو ایسی آزادی چاہتا تھا۔ جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنا سکے اور ہزار سالہ اسلامی حکومت کا بدلہ چکا سکے۔ جس کے لے مسلمان تیار نہ تھے۔ اس لئے مسلم لیگ نے حکومت خود اختیاری کے حصول کو اپنے منشور میں داخل کر لیا تھا۔ اور اسکے لئے جدوجہد بھی شروع کر دی تھی۔ جس سے طلباء زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔ جن میں چوہدری رحمت علی شامل تھے۔

بقول خالدہ ادیب خانم:-

"بچپن میں جن اثرات نے چوہدری رحمت علی کے خیالات کی تشکیل کی تھی۔

ان میں قومیت مذہب سے مخلوط تھی اور انہیں ہندوؤں سے جو واسطہ رہا۔ اس نے انہیں ہندوؤں کی طرف سے کسی قسم کی مروت یا ہمدردی سے قطعاً ناامید کردیا تھا..... اور اسکے ذہن پر جو جذبہ مستولی تھا۔ وہ مسلمانوں کے مقدر کا مسئلہ تھا۔"

(اندرونِ ہند)

جسکی خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب اندرونِ ہند میں یہ وجہ بیان کی ہے:۔
"(مجوزہ) پاکستان کی کل آبادی چار کروڑ بیس لاکھ ہے۔ جن میں سے تین کروڑ بیس لاکھ مسلمان ہیں۔ ان کے نسلی منابع وسطی ایشیا سے متعلق ہیں۔ اور معاشرتی طور پر ان کی نوعِ تہذیب ہندوؤں سے قطعاً مختلف ہے۔ معاشرتی۔ اخلاقی اور سیاسی نظام کے طور پر اسلام، پاکستانی ملت کی کلید اور امتیازی خصوصیت ہے۔"

(ایضاً)

اسلئے چوہدری رحمت علی اپنے طالب علمی کے زمانہ سے بڑے انہماک کے ساتھ سیاسی حالات کا مطالعہ کرنے لگا اور ان سے متاثر رہنے لگا۔

مسلم ریاست

نوجوان طلبا میں یوں بھی جوش زیادہ ہوتا ہے اور اگر طبیعت تیز اور حساس ہو تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہتی ہے۔
اس دیدہ ور نوجوان کیلئے ہندوؤں کا آئے دن کا متعصبانہ روّیہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ وہ انگریزوں کی سیاسی اور ہندوؤں کی اقتصادی غلامی کو اسلامیانِ ہند کی توہین سمجھتا تھا۔ اور اس دوہری غلامی سے نجات پانے کے لئے تجاویز سوچتا رہتا تھا۔ جب تک کوئی جماعت تیار نہ ہو۔ اکیلا انسان کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اسلئے چوہدری رحمت علی نے اپنے داخلہ کے دوسرے ہی سال ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج

لاہور میں متحدہ ہندوستان کے نامور ادیب اور مورخ کے نام پر "بزمِ شبلی" قائم کی۔ جس کے متعدد اجلاس ہوتے رہے۔ ایک دن چوہدری صاحب نے بزمِ شبلی کے پلیٹ سے مسلمانوں کی آزادی کے لئے تقسیم ملک کی یہ تجویز پیش کردی:۔

"ہندوستان کا شمالی حصہ مسلم اکثریت پر مبنی ہے۔ اور اسے ہم مسلمان ہی کہیں گے۔ ہم اسے ایک آزاد مسلم ریاست بنائیں گے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم متحدہ قومیت کو خیرباد کہہ دیں اور ملکی طور پر ہندوستان سے قطع تعلق کرلیں۔ جتنی جلدی یہ ہوجائے۔ یہ ہمارے ملک اور ہمارے مذہب دونوں کے لئے بہتر ہے۔"

("پاکستان"، از چوہدری رحمت علی)

چوہدری صاحب کی یہ اہم اور دوراندیشانہ تجویز اس بات کی شاہدِ عدل ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ان کے شعور و مزاج میں کتنی پختگی اور سنجیدگی موجود تھی۔ کس طرح وہ ایک بالبصیرت سیاستدان کی طرح ملکی اور ملّی حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور مسلمانوں کی آزادی و ترقی کے لئے اسوقت ملکی تقسیم کو کتنی اہمیت دے رہے تھے۔ جبکہ ابھی اربابِ مسلم لیگ نے اس طرف کوئی فیصلہ کن قدم بھی نہ اٹھایا تھا اور نہ اس حد تک سوچا تھا۔

مطالبۂ تقسیم

"بزمِ شبلی" میں چونکہ ہندو سکھ اور عیسائی طلبار بھی شریک تھے۔ اس لئے انہوں نے اس مشترکہ پلیٹ فارم سے مسلم مفادات کے تحفظ اور ملک کی تقسیم کی اس تجویز پر سخت احتجاج کیا۔ جو بے سود ثابت ہوا۔ کیونکہ اس نوجوان مجاہد کو اس بات کا یقین کامل ہوچکا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بقار و تحفظ کا تمام تر دار و مدار تقسیم ہند پر ہے۔ جب تک مسلمان اپنی جداگانہ قومیت کا لوہا منوانے کے لئے علیحدہ اور آزاد وطن نہ بنائیں گے۔ ہندو انہیں زندہ نہ رہنے دیں گے۔ چوہدری رحمت علی نے غیر مسلموں کے اس احتجاج کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے علانیہ کہا کہ:۔

"میرا یقین اور ایمان ہے کہ ملتِ اسلامیہ علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ جس کے لئے صدیوں کی تاریخ گواہ ہے۔ اسے حق ہے کہ وہ اپنے لئے الگ خطۂ وطن کا مطالبہ کرے۔ اگر تمہیں میرا مؤقف پسند نہ ہو تو تم اپنی راہ چلو۔ میں اپنی ڈگر پر چلوں گا۔ انجام کار دیکھیں گے کہ کون ایک ترقی پذیر ملک ملت کا قیام عمل میں لاتا ہے۔"

یہ کہہ کر آپ نے بزم شبلی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ اور اپنے ہم مسلک وہم مشرب نوجوانوں کے ہمراہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ جداگانہ قومیت کے متعلق پروپاگنڈا کرتے رہے کالج میں جب زیر تعلیم تھے۔ تو "کریسنٹ" کے ایڈیٹر بن گئے اور اسکے ساتھ ہی کالج یونین کے سیکرٹری بھی کچھ عرصہ رہے۔ صحافت اور قیادت کے میدان میں سرگرمیاں دکھلانے سے آپ کو تحریر وتقریر کا بہت اچھا ملکہ حاصل ہوگیا۔ اور خدمتِ ملت کا ایک بہترین موقعہ ہاتھ آگیا۔ جس سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

دَورِ ملازمت

۱۹۱۹ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے آپ نے ملازمت کے میدان میں قدم رکھا۔ پہلے پہل منشی محمد دین فوق کے اخبار "کشمیر" میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پھر اچی سن کالج لاہور میں بطور لیکچرر تعینات ہوئے۔ جہاں ۱۹۲۲ء تک آپ نے یہ فرائض انجام دیئے۔ اسی دوران آپ کو نواب مزاری کے بچوں کا اتالیق مقرر کردیا گیا۔ بعدازاں آپ اس جاگیر کے مشیر اور نواب مزاری کے سیکرٹری مقرر ہوئے اس عرصہ میں آپ نواب مزاری کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا بڑا گہرا مطالعہ کرتے رہے۔ لیکن نواب مزاری کی بے اعتدالی کی وجہ سے ان کی ملازمت آپ کو راس نہ آئی۔ ۱۹۲۷ء میں جب ان کی اسٹیٹ یعنی جاگیر بحال ہوئی تو آپ نے ان کی ملازمت

ترک کردی۔ آپ کو معاوضہ کے طور پر جو رقم ملی۔ اس سے اور کچھ نواب موصوف کی مالی امداد سے آپ انگلستان چلے گئے۔ وہاں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور ڈبلن یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کیں۔ آپ اگرچہ ایک ذہین قانون دان تھے۔ مگر سیاست سے گہری دلچسپی کی وجہ سے آپ نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا اور وہاں "پاکستان نیشنل موومنٹ" کی داغ بیل ڈالی۔

سیاسی نظریہ چوہدری رحمت علی کو اپنے ملک کے مستقبل کی بڑی فکر تھی۔ آپ اس نظریہ کے مالک تھے کہ:۔

"ہندوستان ایک ملک نہیں ہے۔ نہ یہ کسی ایک قوم کا وطن ہے۔ تاریخ میں پہلی بار انگریزوں نے برعظیم ہند کے مختلف حصوں کو ملا کر ایک حکومت بنائی ہے۔ اس حکومت میں ان لوگوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔ جو کبھی متحد نہ ہو سکے۔ تاریخ کی ابتدا سے برطانوی حکومت کے قیام تک یہ سب لوگ علیحدہ علیحدہ رہے اور برعظیم ہند میں متعدد حکومتیں قائم رہیں۔ ان ہی میں سے ایک ہماری قوم ہے۔"

ترکیہ ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے اپنے قیام لندن اور پیرس کے دوران ۱۹۲۶ء میں چوہدری رحمت علی سے ملاقات کی۔ اس وقت چوہدری صاحب اپنی عمر کی تیس ۳۰ منزلوں سے گزر چکے تھے۔ خالدہ ادیب خانم کے سوالات کے جواب میں چوہدری صاحب نے اپنی پاکستان نیشنل موومنٹ کے قیام کی یہ وجہ بتائی کہ:۔

"میرا مجوزہ پاکستان یعنی پنجاب، مغربی سرحدی صوبہ۔ کشمیر۔ سندھ اور بلوچستان، مسلمانوں کا وطن تھا۔ میں نے پاکستان کا نام ان ہی پانچ صوبوں کے نام سے اخذ کیا ہے۔ مسلمان ان علاقوں میں بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ سے آباد ہیں۔ ان کی اپنی تاریخ، تہذیب اور تمدن ہے۔ پاکستان

اور ہندوستان کا فرق ہمیشہ اظہر من الشمس رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

گول میز کانفرنس میں وفاق ہند کی جس تجویز پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستانی، ہندوستانی قوم کی ایک اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ اور ہندوستان کی برتری کے تسلّط کا شکار ہو جائیں گے۔ ہمارے قومی وجود کے لئے اسی سنگین خطرہ نے ہمیں پاکستان نیشنل موومنٹ کے قیام پر آمادہ کیا۔ جو اسی نظریہ پر مبنی ہے۔ جسے صدیوں سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ہم نے گول میز کانفرنس اور ہندو نمائندوں کو یہ تجویز بھیجی اور آخر میں مشترکہ پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ مگر انگریزوں اور ہندوؤں نے قومی احترام اور انصاف کے متعلق ہمارا مطالبہ مسترد کر دیا۔ تاہم، ہم نے آخر دم تک جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس جدوجہد میں ہمیں سخت جاں گسل مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس سرزمین پر ہمارے آباؤ اجداد نے نسبتاً کہیں مشکل اور پیچیدہ صورت حال کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔ ہمارے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اور ہمیں علم ہے کہ پاکستان ہمارا مقدّر ہے۔"

(اندرونِ ہند صہ ۲۵۲)

ہندو مسلم تصادم

خالدہ ادیب خانم نے جب اس نوجوان مجاہد سے ہندو مسلم نظریات کے تصادم کے سلسلہ میں سوال کیا۔ تو آپ نے انہیں تبلایا کہ :-

" یہ تصادم نہ تو مذہبی ہے اور نہ اقتصادی۔ حقیقت یہ ہے کہ دو قوموں

کی امنگوں کے درمیان یہ ایک بین الاقوامی ٹکراؤ ہے ـــــ مسلمان اپنی بقا کے لئے کوشاں ہیں اور ہندو اپنی برتری کے لئے! ـــــ وقت آنے پر بھائی بھائی جدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ احساس بڑا تکلیف دہ ہے۔ تاہم ملت کا مفاد تمام چیزوں پر مقدم ہے۔"

جب موصوفہ نے آپ سے "متحدہ قومیت" کے بارے میں سوال کیا تو اس مجاہد پاکستان نے انہیں بتلایا کہ یہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ کیونکہ:۔

"ہم ہندوستانی نہیں ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں۔ ہندوستان کو متحد کرنا اور بات ہے اور پاکستان کو غصب کر لینا، الگ بات ہے۔ لہٰذا ایک "متحدہ قوم" کی خاطر اپنی قوم کے نصیبے پر مہر لگا دینا، ہماری خوشحالی کے حق میں، غداری، اپنی تاریخ سے بے وفائی اور انسانیت کے خلاف ایک جرم ہوگا۔"

سیاسی سرگرمیاں

انگلستان میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو پاکستان نیشنل لبریشن موومنٹ کی طرف سے ایک کتابچہ بعنوان NOW OR NEVER شائع کر کے گول میز کانفرنس کے مندوبین اور برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان میں تقسیم کیا گیا۔ جو بمنزلہ ایک یادداشت کے تھا۔ اور اس پر چوہدری رحمت علی آکسفورڈ کے طالب علم۔ خان محمد اسلم خان خٹک۔ صاحبزادہ شیخ محمد صادق لندن میں قانون کے ایک طالب علم اور لندن کے ایک ویٹرنری کالج کے طالب علم عنایت اللہ خان کے دستخط تھے۔ اس کتابچہ کا دیباچہ اس تحریک کے بانی چوہدری رحمت علی نے خود لکھا تھا۔ جس میں تحریر تھا کہ:۔

"میں پاکستان کے ان تین کروڑ مسلمانوں کی طرف سے یہ اپیل جاری کر رہا ہوں جو ہندوستان کے پانچ شمالی یونٹوں ـــــ پنجاب شمال مغربی

سرحدی (افغان) صوبے، کشمیر، سندھ اور بلوچستان میں آباد ہیں۔ کہ پاکستان کو مذہبی، سماجی اور تاریخی بنیادوں پر ایک علیحدہ وفاقی آئین دے کر ان کی قومی حیثیت کو، جو ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے بالکل الگ ہے۔ تسلیم کیا جائے اور ہندوستانی تاریخ کی اس مبارک ساعت کے موقع پر، جبکہ برطانوی اور ہندوستانی نمائندے برِعظیم کیلئے وفاقی طرز کے دستور کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اپنے مشترکہ ورثے کے نام پر اور پاکستان میں آباد اپنے تین کروڑ مسلمان بھائیوں کی جانب سے، ہم، آپ کے نام یہ اپیل جاری کر رہے ہیں۔ اور ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ سیاسی تصلیب اور قومی استیصال کے خلاف جدوجہد میں ہماری حمایت کی جائے۔"

چوہدری صاحب موصوف اور ان کے ساتھیوں نے گول میز کانفرنس کے انگریز اور ہندوستانی ارکان میں یہ کتابچہ تقسیم کیا۔ جس پر مجوزہ پاکستان کا نقشہ اور اس کا سبز جھنڈا بھی چھپا ہوا تھا۔ کچھ نمائندوں سے ملاقاتیں کر کے انہیں اپنا نقطۂ نظر بھی سمجھایا۔ لیکن کسی نے طالب علموں کی اس تجویز پر سنجیدگی سے غور نہ کیا۔

ناقابل عمل تجویز؟

گول میز کانفرنس کے مندوبین نے اگرچہ اس مجاہد پاکستان کے پیش کردہ منصوبہ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن اس کے ایک برطانوی رکن سر ریجینالڈ کریڈاک نے اس سیاسی مجذوب کی بڑ کو [illegible] نہ سمجھا۔ اور انہوں نے اسکے نظریہ کے متعلق گول میز کانفرنس کے مسلم اراکین سے استفسارات شروع کر دیئے۔ ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے متعلق مشترکہ کمیٹی کے روبرو جو شہادتیں ہوئیں۔ پاکستان کے متعلق صاحب موصوف کے سوالات معہ جوابات بھی ان ہی شہادتوں کے ساتھ شامل کر دیئے گئے۔ جو ۱۹۳۴ء میں اشتہری

آفس لندن نے شائع کئے۔ جنکی تفصیل درج ذیل ہے۔ جوجی الانہ نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے:۔

"سوال نمبر ۹۵۹۸ سر ریجنیالڈ کریڈاک:۔ کیا کوئی مندوب یا کوئی شاہد میرے سوال کا جواب دینا پسند کرے گا اور مجھے یہ بتائے گا کہ آیا پاکستان کے تحت صوبوں کے وفاق کی کوئی سکیم موجود ہے؟

جواب از عبداللہ یوسف علی۔ سی۔ بی۔ اے:۔ جہانتک مجھے علم ہے یہ محض ایک طالب علم کی سکیم ہے۔ اسے کسی ذمہ دار شخص نے پیش نہیں کیا۔

اس پر سر موصوف نے کہا کہ یہ درست ہے کہ کسی ذمہ دار شخص نے اب تک ایسی کوئی تجویز پیش نہیں کی۔ لیکن آپ کے کہنے کے مطابق آپ ہندوستان میں بڑی تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ اور شاید ایسا ہو۔ جب یہ طالب پختہ عمر ہوں گے۔ تو یہ سکیم پیش کی جائے گی۔ کسی نہ کسی صورت میں لوگوں کے ذہن میں یہ سکیم ضرور موجود ہوگی۔

ظفر اللہ خان! آپ کا سوال کیا ہے؟

سر ریجنالڈ:۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا آپ لوگ پاکستان کے متعلق کسی سکیم سے واقف ہیں؟

ظفر اللہ خان:۔ ہمیں اسکا جواب مل گیا ہے۔ کہ ایک طالبعلم کی تجویز ہے اور اس میں کوئی قابل غور بات نہیں ہے۔

سوال نمبر ۹۵۹۹۔ منجانب آئزک فوٹ:۔ پاکستان کیا ہے؟

جواب۔ سوال نمبر ۹۵۹۹۔ منجانب ظفر اللہ خان:۔ جہاں تک ہم نے اس پر غور کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ محض ایک قیاس اور ناقابل عمل تجویز ہے۔ اس کا مقصد بعض صوبوں کا وفاق بنانا ہے۔

سوال نمبر ۹۶۰۰:۔ منجانب سر ریجنالڈ۔ مجھے کچھ خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جن میں بعض مسلم

صوبوں کو پاکستان کے تحت یکجا کرنے کی تجویز کا ذکر ہے۔

جواب سوال نمبر ۹۶۰۔ منجانب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین :۔ غالباً یہ کہنا کافی ہوگا کہ اب تک کسی نمائندہ یا فرد یا تنظیم نے ایسی کسی سکیم پر غور نہیں کیا ہے۔"

اس کاروائی سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اس مجاہد پاکستان کی جس تجویز کو گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین نے درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسے محض اسلئے نظر انداز کر دیا کہ یہ ایک طالب علم کی تجویز ہے۔ اسے برطانوی مندوبین نے نظر انداز نہ کر کے بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ کہ جنھوں نے ابھی طالب علمی کے زمانے میں پاکستان کے لئے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ بڑے ہو کر ضرور اسکے لئے کوئی نہ کوئی انقلابی قدم اٹھائیں گے۔ اسی لئے انہوں نے پاکستان کی نسبت معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ یہ چوہدری موصوف کی مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ وہاں پہلی دفعہ "پاکستان" کا لفظ لوگوں کے کانوں میں پڑا۔ اور زیر بحث آیا۔

کل ہند وفاق

گول میز کانفرنس میں جب گول میز کانفرنس کے مندوبینوں اور حکومت برطانیہ کے نمائندوں کے سامنے کل ہند وفاقی حکومت زیر غور آئی تو چوہدری صاحب نے اسے مسلمانوں سے ناانصافی اور بے وفائی پر محمول کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"گول میز کانفرنس کے مسلمان شرکار نے ایک ناقابل معافی غلطی کر کے مسلم اقوام کے ساتھ شرمناک بے انصافی کی ہے۔ انہوں نے ہندو قوم پرستی کے نام پر ہندوستان کی بدقسمت ملت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانا قبول کر لیا ہے۔ انہوں نے بغیر کسی احتجاج یا جھجک کے بغیر کسی استدلال اور وضاحت کے، کل ہند وفاق کے خطوط پر بنائے جانے والے دستور کی منظوری کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ منظوری مسلمانان ہند کے لئے سزائے موت

کے پروانے پر دستخط سے ہرگز کم نہیں"۔ (اب ورنہ کبھی نہیں)

چوہدری صاحب نے اس امر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ہم مسلمانانِ پاکستان بالکل جداگانہ قومیت کے حامل ہیں۔ اگر ہم مجوزہ ہندوستانی وفاق میں شامل کیے جاتے ہیں۔ تو ہم اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں دس گنا کم ہوں گے۔ یہ ایک اور دس کا تناسب ہمارے لئے انتہائی مہلک ہوگا۔ مسلمانوں کے آنے والے انتہائی تباہ کن دور کا صحیح احساس کرانے کے لیے ہم آپ کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد پورے عالم اسلام کے دسویں حصہ کے برابر ہے۔ ہمارے پانچ صوبوں کا مجموعی علاقہ اٹلی سے چار گنا ہے۔ ان کی آبادی آسٹریلیا کی آبادی سے سات گنا، کناڈا سے چار گنی اور اسپین سے دوگنی زیادہ اور اٹلی اور فرانس کی مجموعی آبادی کے برابر ہے"۔

(ایضاً)

چوہدری صاحب نے اپنے مبنی برحقیقت مطالبہ پر زور دیتے ہوئے کہا:۔

"یہ حقائق ایسے ہیں کہ انہیں دنیا میں کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔ یہ اس قدر ٹھوس ہیں کہ ہم ان کی بنا پر ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنی علیحدہ قومیت کی بنا پر مسلمانوں کے لئے علیحدہ وفاق پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا وفاق ہوگا۔ جو ہندوستان سے الگ ہوگا"۔

(ایضاً)

جہادِ حریت

چوہدری رحمت علی نے اس مسئلہ کو گول میز کانفرنس کے خاتمہ کے ساتھ ختم نہ ہونے دیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی تحریکِ پاکستان

میں جان ڈالنے کے لیے رسالوں۔ کتابچوں۔ پمفلٹوں اور دستی اشتہاروں کے ذریعہ مہم شروع کردی۔ وقتاً فوقتاً اپنے موقف کی تائید میں اخباروں اور رسالوں میں مضامین اور بیانات شائع کراتے رہے۔ یہاں تک کہ "پاکستان" نامی ایک ہفت روزہ اخبار جاری کردیا۔ ۱۹۳۵ء میں پاکستان نیشنل لبریشن موومنٹ کی طرف سے اس کے صدر چوہدری رحمت علی کے دستخطوں سے "پاکستان" نامی ایک کتابچہ شائع کیاگیا اور اسے ہندوستان کے طالب علموں اور نوجوانوں میں تقسیم کرکے یہ آواز انگلستان سے ہندوستان پہنچائی گئی آزادی کی یہ آگ آہستہ آہستہ سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۷ء میں شمال مغربی ہند میں پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی۔ اسطرح انگلستان میں شروع کی گئی تحریک ہندوستان میں بار آور ہونے لگی اور اس نے یہاں پر پرزے نکالنے شروع کیے۔

۱۹۳۳ء میں NOW OR NEVER کے نام سے جو کتابچہ شائع ہوا۔ اس کا دوسرا حصہ ۱۹۴۰ء میں THE MILLAT OF ISLAM AND THE MANACE OF INDIANISM کے نام سے شائع کیاگیا۔ جس کے ذریعہ شمالی ہند میں پاکستان بنگال۔ آسام میں بانگستان اور حیدرآباد دکن میں عثمانستان بنانے کی تجویز اس بنا پر پیش کی کہ :۔

اگر ہم ہندوؤں کے انڈیا میں رہنے پر آمادہ ہوگئے تو ہم دائمی طور پر انڈین ازم (ہندیت) میں پڑے سڑتے رہیں گے :

۱۹۴۲ء میں مذکورہ بالا پاک پلان کا تیسرا حصہ "THE MILLAT AND THE MISSION" کے نام سے شائع کیاگیا۔ اس کے ذریعہ مذکورہ بالا تین حصوں کے علاوہ چوہدری رحمت علی نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان کے اندر مسلم علاقوں والی مزید سات ریاستیں حیدرستان۔ صدیقستان۔ فاروقستان۔ موپلستان۔ ناصرستان وغیرہ بنائی جائیں

جن پر مشتمل ایک "پاک کامن ویلتھ آف مسلم نیشنز" قائم کی جائے۔

پاکستان کی وجہ تسمیہ

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ۱۹۴۰ء میں آپ کی ایک اور کتاب موسومہ بہ "پاکستان دی فادرلینڈ آف پاک نیشن" بھی چھپی۔ جس میں آپ نے "پاکستان" کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ۔

"میں نے ۱۹۳۳ء میں اپنے اعلان "ناؤ آر نیور" میں پہلی مرتبہ اپنے وطن کے لئے لفظ "پاکستان" استعمال کیا۔ یہ نام میں نے اپنے مشترکہ ہندوستانی اور ایشیائی وطن کے لئے ایجاد کیا تھا۔ یہانتک تو لفظ پاکستان کا ذکر تھا۔ اب اس کی تشکیل کے متعلق بھی سن لیجئے۔ پاکستان فارسی اور اردو زبان کا لفظ ہے۔ اسے "ہندوستان اور ایشیاء" میں واقع ہمارے وطنوں کے مختلف علاقوں کے حرف سے مرتب کیا گیا ہے۔ یعنی پنجاب۔ افغانیہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کشمیر۔ ایران۔ سندھ (بشمول کچھ و کاٹھیاواڑ) افغانستان اور بلوچستان! ——— اس کا مطلب ہے پاک لوگوں کی سرزمین۔ یعنی روحانی طور پر پاکیزہ اور صاف ستھرا۔"

چوہدری رحمت علی نے جس تندہی سے لندن میں بیٹھ کر "پاکستان" کا مہرہ آگے بڑھایا اور اسے دنیا سے متعارف کرایا۔ اس سے ہندو لیڈر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس لئے بابو راجندر پرشاد نے اپنی کتاب "تقسیم ہند" میں اس مجاہد پاکستان کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا کہ:۔

"رحمت علی دو قومی نظریئے کے ایک انتہائی سخت گیر مبلغ ہیں"۔ (ص ۱۸۵)

لندن میں چوہدری صاحب دو کمروں کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ رہائش کے لئے مخصوص تھا۔ اور دوسرا اس وقت پاکستان کے دفتر کا کام دے رہا تھا۔ وہیں ہم مشرب اکٹھے ہوتے۔ پاکستان کے منصوبے پر بحث مباحثہ ہوتا۔

اور اخبارات کو وہیں انٹرویو دیئے جاتے ۔ پاکستان کی تحریک سے آپ کی لگن کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ پاکستان کے متعلق آپ سے ایک جرمن اخبار کا نمائندہ انٹرویو لے گیا۔ تو چوہدری صاحب یہ دیکھنے کے لئے، اس رپورٹر کے پیچھے خود جرمنی گئے کہ وہ کہیں پاکستان کے خدوخال میں گڑبڑ نہ کردے۔

خلوصِ کار

چوہدری صاحب بڑے جفاکش اور مستعد نوجوان تھے۔ اسی میٹنگ روم کے ایک کونہ میں آپ نے ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ خود ہی آپ آفس سیکرٹری۔ خود ہی ٹائپسٹ اور خود ہی آفس کلرک تھے ساری ساری رات مسودے لکھتے۔ صبح اٹھ کر ٹائپ کرتے اور پمفلٹ تیار کر کے خود ہی طلبا میں جا کر وہ تقسیم کرتے ہر دوسرے ہفتے ایک پمفلٹ ضرور تیار کر کے تقسیم کرتے۔ اور ان کی اشاعت کے اخراجات بھی طلبا سے جمع کرتے۔ آپ کی اس لگن اور خلوص کو دیکھ کر آپ کے روز افزوں اخراجات کی کفالت کے لئے ایک نوابزادے نے اپنی عیاشانہ عادتیں بدل ڈالیں اور موٹر تک فروخت کر کے اس تحریک پاکستان کے لئے مالی امداد مہیا کرتا رہا۔

خود چوہدری صاحب ہندوستان چھوڑ کر محض اسلئے انگلستان بدر ہو کر بیٹھے رہے کہ وہ ان نوجوانوں میں پاکستان کا جذبہ پیدا کریں۔ جو وہاں زیرِ تعلیم تھے۔ اور جنھوں نے ہندوستان واپس آکر اعلیٰ عہدے سنبھالنے تھے۔ تاکہ وہ اپنے عہدِ اقتدار میں پاکستان کا مہرہ آگے بڑھانے میں مدد دیں۔

پاکستان بننے کے بعد وہ اپنے سپنوں کا تاج محل دیکھنے کے لئے یہاں آئے۔ مگر ادھورا پاکستان پا کر آپ کو سخت صدمہ ہوا اور واپس جا کر پھر ایک رسالہ THE GREATEST BETRAYAL نامی شائع کر کے پاکستان سے کی جانیوالی زیادتیوں اور بے انصافیوں کا رونا رویا۔ اسی صدمہ سے آپ ۱۲ار فروری ۱۹۵۱ء کو لندن ہی سے راہیٔ ملکِ عدم ہوئے اور آپ کو کیمبرج میں عمانویل کالج کی سیڑھیوں

کے قریب دفن کیا گیا۔

آپ نے اپنا نادر کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی کے حوالے کر دیا تھا۔ جس میں قیمتی اور نایاب کتابوں کے علاوہ تاریخی دستاویزات تھیں۔ جن میں وہ خطوط اور پمفلٹ بھی شامل تھے۔ جو آپ کو علامہ اقبالؒ۔ قائدِ اعظمؒ۔ سر عبداللہ ہارون۔ ملک برکت علی اور سر سکندر حیات خان وغیرہ کی طرف سے موصول ہوتے رہے تھے۔

اعترافِ حقیقت چودھری رحمت علی کی شخصیت کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ :-

۱۔ جرمنی کے اخبارات کے نمائندوں نے لندن جا کر ان کا انٹرویو لیا اور اسے اپنے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع کیا۔

۲۔ ترکی کی شہرہ آفاق خاتون خالدہ ادیب خانم نے ان سے باقاعدہ ملاقات کر کے ان کی تحریک کی تفصیلات معلوم کیں اور انہیں اپنی معروف کتاب INSIDE INDIA (اندرونِ ہند) میں انکا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا۔

۳۔ شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ان کی تحریک کے ساتھ گہری وابستگی ظاہر کر کے ان کو خطوط لکھے۔

۴۔ اچھوت رہنما ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکر۔ چوہدری خلیق الزمان۔ چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان۔ سید شریف الدین پیرزادہ سابق وزیرِ خارجہ و اٹارنی جنرلِ پاکستان نے خصوصیت کے ساتھ ان کی تحریک کا تذکرہ اپنی تصنیفات میں کیا اور اس پر مقالے لکھے۔

۵۔ حکومت برطانیہ ان کی تحریک سے اتنی خائف و پریشان تھی کہ وہ ہندوستان کے وفود کے ارکان سے خاص طور پر یہ سوال کرتی رہی کہ وہ چوہدری رحمت علی کی تحریک سے متاثر تو نہیں۔

۶۔ کانگرس اور ہندو پریس چوہدری صاحب کی تحریک سے اتنا خواس باختہ ہوا کہ وہ مدتوں اس تحریک کے خلاف مہم چلاتا رہا۔ اور جب ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور پاس ہوئی تو اسے سب سے پہلے ہندو اخبارات نے "قراردادِ پاکستان" کا نام دیا۔ اور اپنے افتتاحی مقالوں میں بڑی وضاحت سے لکھا کہ یہ وہی مطالبہ ہے۔ جو ۱۹۳۳ء میں چوہدری رحمت علی نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر پیش کیا تھا۔

فی الواقعہ قائدِاعظم نے ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں لیگ کے اجلاس میں جو صدارتی تقریر کی۔ اس میں، یا اصل قرارداد، یا اسکے محرک و مؤید کی تقاریر میں، کہیں بھی لفظ پاکستان موجود نہ تھا۔ البتہ سیّد حسن ریاض کے قول کے مطابق :-

"بیگم محمد علی نے اپنی تقریر میں اسے پاکستان کی قرارداد کہا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ چوہدری رحمت علی کی کوشش اور سعی سے یہ لفظ مشہور ہو چکا تھا۔ وہ اس سے واقف تھیں اور ان کو یہ آسان معلوم ہوا کہ تقسیم ہند کی قرارداد کی بجائے اسے قراردادِ پاکستان کہیں۔ پھر ہندو اخبارات نے طعن وطنز کے طور پر اس نام کو اتنا اچھالا کہ یہ زبانِ زدِ عوام ہو گیا۔"

بالآخر مسلم لیگ نے بھی عوامی مطالبے کے پیشِ نظر اس قرارداد کا نام قراردادِ پاکستان اور اسکی بنا پر بننے والے ملک کا نام پاکستان رکھ دیا۔ اسطرح چوہدری رحمت علی کا خواب حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگیا ؎

نقشۂ دنیا پہ یہ جو نقشِ پاکستان ہے
یہ تو صرف اک منچلے انسان کا فرمان ہے

اس مجاہدِ پاکستان کا خیال تھا کہ شاید پاکستان ان کی زندگی میں منصۂ شہود پر نہ آئے اسی لئے اس نے خالدہ ادیب خانم سے کہا تھا کہ :-

"شاید پاکستان کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں۔ مگر میں اسکے لئے جدوجہد

جاری رکھوں گا۔"

مگر حق تعالےٰ نے آپ کی بے غرضانہ اور مخلصانہ جد وجہد کا نتیجہ آپ کو زندگی میں ہی دکھا دیا۔ ۱۴ ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ وہ اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے دوسرے سال ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے اور کچھ عرصہ لاہور میں "کس نمے پرسد کہ بھیّا کون ہو" کے مصداق بن کر انگلستان واپس چلے گئے۔ جہاں ۱۹۵۱ء میں آپ کا انتقال ہوا اور آپ کو وہیں آرام کی نیند سلا دیا گیا۔ اسطرح پاکستان کے اس مجاہد کو اس پاکستان کی خاک نصیب نہ ہوئی۔ جسکے لئے وہ عمر بھر جد وجہد کرتا رہا اور ملک سے دُور بیٹھ کر بحالتِ "جلاوطنی" ملک وملّت کی ناقابلِ فراموش خدمت سرانجام دیتا رہا۔

(۱۶)

نواب بہادر یار جنگ

عاشقِ قرآن

حسین و جمیل۔ دراز قد۔ متبسّم نورانی چہرہ۔ نرگسی آنکھیں۔ خشخشی گھنی داڑھی۔ پرکشش انداز۔ حق جو۔ حق گو۔ حق پسند۔ سحر بیان۔ منصف مزاج۔ مردم شناس۔ مخلص و خدا ترس۔ ارادے کا پختہ۔ بات کا دھنی۔ سیف الاسلام۔ اقبال کا قلندر۔ لسان الملک۔ شرافت و ہمدردی کا پیکر۔ عظمت انسانی کا مظہر۔ بُلبلِ ہزار داستان۔ دولت کا آفریدہ۔ عیش کا پروردہ۔ فکرِ آخرت سے مغلوب۔ صدلوزئی پٹھان نواب بہادر یار جنگ ۳/ فروری ۱۹۰۵ء کو اس دنیائے رنگ و بو میں تشریف لاتے۔ ابھی ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ان کی والدہ انہیں اپنی آغوشِ تربیت سے محروم کر کے دوسری دنیا کو کوچ کر گئیں اور ان کی تربیت ان کی زاہد و عابد نانی کے حصہ میں آئی۔ جس نے انہیں بچپن سے قرآن خواں اور نماز کا عادی بنا دیا۔ اگر خدانخواستہ کبھی صبح کی تلاوت کا ناغہ ہو جاتا تو اس روز ان کی نانی ان سے نہ بولتی اور انہیں کہتی:-

"آج تم نے اللہ سے باتیں نہیں کی ہیں۔ مَیں تم سے بات نہ کروں گی"۔

اللہ والی کی اس تعلیم و تربیت نے آپ کو بھی اللہ والا بنا دیا۔ آپ کو کلامِ الٰہی سے عشق ہو گیا۔ علامہ اقبال کے اس فرمان نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ؎

تیرے ضمیر پہ جبتک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

آپ نے بہت جلد علومِ قرآن پر اتنا عبور حاصل کر لیا کہ جسطرح خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی سے کلام کرتے تھے۔ اسی طرح یہ عاشقِ قرآن و حدیث کے حوالے کے بغیر بات ہی نہ کرتے تھے۔ مثلاً:-

۱۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"طریقِ مصطفوی کا سالک بے کھٹکے انتم الاعلون کا مخاطب ہوتا ہے۔ امت وسط بن جاتا ہے۔ خیر امت ہو جاتا ہے اور انا جعلنا کم خلائف فی الارض کا مصداق قرار پاتا ہے۔"

۲۔ اسی خط کا ایک اور پیرا:۔

"مجھے ہر وقت اپنی بے راہ روی کا اندیشہ رہتا ہے۔ ڈرتا ہوں۔ دعائیں کرتا ہوں اور امرھم شوریٰ بینھم کو اپنا دینوی سہارا سمجھتا ہوں۔"

۳۔ والد ماجد کی وفات کے بعد آپ پر جب جائیداد کے انتظام کی ذمہ واری آپڑی تو آپ نے کہا:۔

"جیسے ہی والد کا انتقال ہوا اور انتظام میرے ذمہ ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اب اس حدیث شریف کا اطلاق مجھ پر بھی ہو رہا ہے کہ کلکم راع وکلکم مسئول حق رعیتہ (تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا) اسی لئے میں نے یک لخت تمام جاہلانہ رسومات روک دیئے۔"

درسِ قرآن آپ ہر قدم اٹھانے سے پہلے اس امر کا جائزہ لے لیتے تھے۔ کہ کہیں خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فرمان کی نافرمانی تو نہیں ہو رہی۔ اس تصور کے بعد انسان کا کوئی قدم غلط نہیں ہو سکتا۔

آپ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد آپ روزانہ اپنی مسجد میں ایک گھنٹہ قرآن کریم کی تفسیر سنایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ

"مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے۔ تو وہ یہی خدمتِ قرآن ہے۔"

آپ کا مقصدِ حیات مسلمانوں کو منفرداً و مشترکاً منہاجِ نبوت پر دیکھنا تھا۔ اسی لئے آپ نے اپنی ساری عمر مسلمانوں کو یہی درس دیتے گزار دی کہ :-

اگر مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے ۔ یہی (قرآن) ان کی پناہ گاہ ہے۔"

تلاوت قرآنِ کریم کی تاکید کرتے ہوئے آپ نے جو گرامی نامہ مورخہ ۱۴ر مارچ ۱۹۴۴ء کو مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت لاہور کو لکھا جس سے آپ کی قرآن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ :-

"اگر آپ بھائی کا مشورہ پسند کریں تو اب جب کہ اقبال اور رومی کا آپ مطالعہ کر چکے ہیں۔ قرآن کے قریب ہونے کی کوشش کیجئے۔ اس سلسلے میں اپنے چند تجربوں کو بطور مشورہ عرض کر دونگا۔ آجکل کے اندازِ فکر و بیان سے جو لوگ متاثر ہیں۔ وہ تلاوتِ قرآن کی ابتدائی منزلوں میں کچھ پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہاں ان کو قرآن سے عدم موانست کی وجہ سے ابتداءً کچھ بے ربطی۔ عدم تسلسل اور پراگندہ خیالی (نعوذ باللہ) نظر آنے لگتی ہے۔ طالبِ قرآن کی یہی منزل سب سے کڑی ہے۔ اگر اس الجھن کو برداشت کر کے وہ آگے بڑھ گیا۔ تو قرآن اس سے خود قریب ہونے لگتا ہے۔ ایک اور نکتہ عرض کر دونگا کہ گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال میں ہر عہد کے علمار نے قرآن کو اپنی ضرورت، اپنے ماحول کے مطابق پڑھنے، سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مفسر کا رنگ جدا نظر آتا ہے۔ اور بعض ایسے مقامات بھی ملتے ہیں۔ جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کم فہم لوگوں نے اپنے آپ کو قرآن کا تابع بنانے کی بجائے قرآن کو اپنے دعاوی کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔

اسی لئے میں اپنے نوجوان تعلیم یافتہ احباب کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ تلاوتِ قرآن کے ابتدائی مراحل میں اپنے آپ کو کسی مفسر کے حوالہ نہ کریں۔ قرآن کا کوئی اچھا ترجمہ اپنے سامنے رکھیں اور پھر قرنِ اول کے ایک بدوی کی طرح جو وسطِ صحرا سے گرد آلود ہاتھ پاؤں کے ساتھ آتا تھا۔ اور قرآن کی ایک آیت سن کر منطق و فلسفہ۔ معانی و بیان۔ علم کلام و اصول تفسیر سے ناواقفیت کے باوجود ایمان کے سوز سے منور ہو کر واپس جاتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کا ترجمہ اور ان کی تفسیر موضح القرآن زبان اردو کی غرابت اور متروک محاوروں کے باوجود آپکے لئے مفید ثابت ہوگیا۔"

تلاوتِ قرآن کے دوران اکثر آپ پر رقت طاری ہو جاتی۔ اور دل کی کہانی کا آنکھوں کی زبانی پتہ چل جاتا۔ دیکھتے دیکھتے سسکیاں بندھ جاتیں اور کبھی اسی عالم میں اٹھ کر گھر چلے جاتے۔ آپ نے مجلس اتحاد المسلمین کے ارکان اور عام مسلمان حضرات پر لازم قرار دیدیا تھا کہ وہ روزانہ کم از کم تین آیات ترجمہ کے ساتھ پڑھا کریں اور مجلس کی ہر شاخ کو ہدایت بھیج دی کہ ہر جگہ مسجد میں قرآن کا ترجمہ سنانے اور تفسیر بیان کرنے کا انتظام ہونا چاہیئے۔

مسلم لیگ سے وابستگی

اسی قرآن نے تو آپ کو مسلم لیگ کا نقیب بنا دیا۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۴۲ء کو آپ نے اپنے دوست مولانا محمد علی پروفیسر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کے خط کا جو جواب لکھا۔ اس میں آپ نے مسلم لیگ سے تعلق وابستہ کرنے کی مندرجہ ذیل وجوہات لکھیں :-

"مسلم لیگ کے ساتھ اس لئے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا قائد اسی منہاج نبوت کی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ پاکستان کے دستورِ حکومت

کی تحریک اس سال کے اجلاس میں نہ آسکی ۔ اور مجلس موضوعات نے اس کو قبل از وقت اور خلاف مصلحت قرار دیا ۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس مقصد کو مقصدِ حیات سمجھنے والوں کا ایک خاصہ بڑا گروہ لیگ میں پیدا ہو گیا ہے ۔ اور آپ حیران ہونگے کہ یہ سب کے سب دیوانے ۔ داڑھی منڈے اور اصطلاحاً غیر عالم نہیں ۔ ان کی مایوسی سے دل کو رنج ہوا ۔ آخری اجلاس کی تقریر میری یا وہ گوئیاں تھیں ۔ اس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث رہی ۔ اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اللہ نے میری زبان سے اعلان کروایا کہ پاکستان کا دستور، الٰہی دستور اور وہاں کی حکومت، قرآنی حکومت ہوگی اور سب سے بڑھ کر قابلِ مسرت یہ کہ جب میں دورانِ تقریر اس مقام پر پہنچا ۔ تو قائدِ اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکا مار کر فرمایا ۔ تم بالکل درست کہتے ہو ۔ اور میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ قائدِ اعظم سے میرے قول پر سندِ تصدیق مل گئی "۔

اس مردم شناس نے اسی خط میں قائدِ اعظم کی مشکلات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ۔
"راہ کی مشکلات کا کچھ نہ پوچھیئے ۔ قائدِ اعظم کی راہ میں انگریز ہے اور ہندو ہیں ۔ اور خود ان کی جماعت کے منافقین ہیں "۔

اخلاق و قابلیت مجاہدِ ملت نواب بہادر یار جنگ صرف قرآن کے قاری یا اس کی تفسیر سنانے والے ہی نہ تھے ۔ اس کے صحیح معنوں میں عامل بھی تھے ۔ اطاعت اللہ و اطاعت الرسول میں ہی شب و روز بسر کرتے تھے ۔ اور اسی لئے عنداللہ محبوب اور عندالناس مقبول تھے اور حق تعالےٰ ہر میدان میں انہیں کامیاب و کامران اور سرخرو فرما رہا تھا ۔

آپ کے والد پانچ لاکھ روپے قرض چھوڑ گئے تھے۔ آپ نے ان کی وفات کے بعد اس حسنِ قابلیت کے ساتھ اپنی جاگیر کا انتظام کیا کہ آٹھ سال کے اندر سب کا قرض ادا کر دیا۔ جاگیر کے حالات سدھر گئے۔ رعایا خوش اور خوشحال ہوگئی۔ گھر کا ماحول خوشگوار ہوگیا۔ غیر اسلامی رسوم اور کافرانہ رواج ختم کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں آپ نے فریضۂ حج کی ادائیگی کا عزم کیا۔ جس کو بھی آپ کے اس ارادہ کا پتہ چلا۔ اس نے آپ کے حسنِ اخلاق و ایثار کی بنا پر یہی کہا کہ نواب صاحب۔ کیا آپ مجھے ہمراہ نہ لے جائیں گے؟ وہاں انکار کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا۔ جسکا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ کے ہمراہ صرف آپ کے خاندان کے اسّی افراد آپ کے خرچ پر سفرِ حج پر روانہ ہوئے۔ دیگر لوگ ان کے علاوہ تھے۔

سیاحتِ عالمِ اسلام

اس سفر کی غرض و غایت صرف ایک فریضہ کی ادائیگی نہ تھی۔ بلکہ عالمِ اسلام کے حالات کا جائزہ لینا بھی تھا۔ کیونکہ کتاب انسان کو اتنا دیدہ ور اور صاحبِ نظر نہیں بنا سکتی۔ جتنا مشاہدہ بناتا ہے۔ بدورانِ سفر جب فلسطین کے ایک اخباری نمائندہ نے آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا:۔

"میرے اس سفر کی مختلف اغراض ہیں۔ ان میں سب سے مقدم قرآن شریف کی اس آیتِ کریمہ پر عمل ہے کہ قُل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلکم (کہہ دو کہ وہ زمین پر سیر کر کے دیکھیں کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ جو تم سے پہلے تھے۔) اس کے بعد عصرِ حاضر کی مسلم اقوام کے حالات کا عینی مشاہدہ کرنا ہے۔ تاکہ ان اقوام کے درمیان روابط کے قوی کرنے کے امکانات کو پیدا کیا جائے۔" (سفر نامہ بلادِ اسلامیہ بہادر یار جنگ)

سلطان ابنِ سعود نے اپنی ملاقات میں ایک اہم نکتہ یہ اٹھایا کہ جب تک مسلمانوں کے عقائدی اختلافات دور نہ ہوں۔ مسلمانوں کا اتحاد ممکن نہیں۔ نواب صاحب نے اس سے اتفاق نہ کیا کیوں کہ یہ مسئلہ لاینحل ہے اور یہ تجویز پیش کی کہ ان اختلافات کے علی الرغم مشترکہ یا غیر اختلافی امور میں اتحاد ممکن ہے۔ جس سے سلطان ابن سعود نے اتفاق کیا۔ ترکی میں مغربی تہذیب کے رواج کے بعد ترکی ٹوپی کا پہننا چونکہ ترک کر دیا تھا اور نواب صاحب ترکی ٹوپی پہننے کے عادی تھے۔ اسلئے جب ترکی میں گئے تو بڑی عمر کی ترکی عورتیں اس ٹوپی کو محبت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ جوان عورتیں اس پر حقارت کی نظر ڈالتی تھیں۔ سنجیدہ اور تعلیم یافتہ مرد اسے حسرت بھری آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ ایک مرد نے آپ سے ٹوپی مانگ کر اپنے سر پر رکھ لی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگا کہ ”میرا بادشاہ یورپین ٹوپی کو پسند کرتا ہے۔ اسلئے میں بھی اسے پسند کرتا ہوں۔ لیکن میرا دل قدیم ترکی ٹوپی کو پسند کرتا ہے۔

عالم اسلام کی سیاحت کرنے کے بعد دکن کے اس ابن بطوطہ کا مجموعی تاثر یہ تھا۔

”مسلمانوں کی بے راہ روی۔ ان کی اندھی تقلید۔ خود ناشناسی۔ خدا ناآشنائی ہر بازار میں جنسِ ایمان کی کمی اور ہر دماغ میں سودائے خام پایا۔ ترقی کے دعوے سنے۔ تنزل کے اعمال دیکھے۔ عقل نے سمجھایا۔ دل نے تصدیق کی کہ تہ بہ تہ تاریکی بلا ایمان کی شمع جلائے دور نہ ہوگی“

(حیات بہادر جنگ)

قابلِ رشک استعداد

نواب بہادر یار جنگ کے بچپن کے ساتھی اور قریبی دوست ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی آپ کے بچپن کے حالات پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

”مرحوم کی طالب علمانہ زندگی بہت جلد ختم ہوگئی۔ اور وہ ابتدائی عمر

میں ہی دنیا کے دھندوں میں پھنس گئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علمی اداروں کی باضابطہ تعلیم یا امتحانوں کی کامیابی کی اسناد نہیں رکھتے تھے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ علم محض مدرسوں یا کالجوں میں حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ مکتب اور مُلّا انسان کی صلاحیتوں کو جو اکتسابِ علم کے لئے فطرت کی طرف سے ودلیعت کی جاتی ہیں۔ نقصان پہنچاتے ہیں چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں ؎

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق
نہ خرد بادہ کش از کارگہ شیشہ گراں

تاریخ عالم میں اور خصوصاً مشرق کی تاریخ میں اکثر علمائے نے باضابطہ مدرسوں میں نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی کوششوں سے علم و فن میں کمال حاصل کیا۔ مولوی محمد بہادر خان (یہ آپ کا اصلی نام ہے) کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے فطری ذوقِ علم کی تشفی خود اپنے طور پر مطالعہ سے کی اور علم کی جن شاخوں سے آپ کو دلچسپی تھی۔ ان میں اس قدر یدِطولیٰ حاصل کیا کہ باضابطہ اسناد رکھنے والوں سے بدرجہا آگے بڑھ گئے"۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے صرف تفسیر۔ فقہ۔ حدیث اور عربی باضابطہ مولانا شمس صاحب تفسیر شمسی اور مولوی سعدۃ اللہ مدرس مدرسہ دارالعلوم سے پڑھی۔ عربی میں اتنی استعداد حاصل کرلی کہ مصر میں جب پہلی بار آپ نحاس پاشا سے ملے اور اہم مسائل پر عربی میں گفتگو کی۔ تو ترجمان پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے دن اس تاریخی ملاقات کی جو پریس رپوٹ مصر کے اخباروں میں چھپی تو آپ کی تصویر کے نیچے یہ تعارفی نوٹ لکھا ہوا تھا۔

"حیدر آباد کا ایک نواب جو عربی فصّاح میں گفتگو کرتا ہے"

انتقال سے قریباً دو سال قبل جب مصر کے قونصل جنرل حیدر آباد آئے تو آپ نے ان

کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا۔ جس میں وزیر اعظم۔ اعلیٰ سرکاری افسران۔ علماء و مشائخ مدعو تھے۔ اس اجتماع میں آپ نے بزبان عربی فصیح و بلیغ پرجوش و اثر آفرین تقریر کر کے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور خود قونصل نے اپنی جوابی تقریر میں اپنی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ:-

"ہندوستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عربی میں ایسی بے تکلفی اور فصاحت کے ساتھ تقریر کر سکتے ہیں۔"

فارسی بھی آپ نے کسی سے نہیں پڑھی تھی۔ از خود مطالعہ سے اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ایک دن خود فرمانے لگے:-

"گو میں نے فارسی سبقاً کسی سے نہیں پڑھی۔ لیکن کوئی آجائے مقابلہ کیلئے۔"

آپ کی جب غازی نادر پاشا سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے آپ کی فارسی دانی کا ان الفاظ میں اپنے مصاحبین سے ذکر کیا:-

"نواب صاحب در زبان فارسی خیلے خوب گپ می زنند۔"

"گپ" ایران کے محاورہ میں بامحاورہ گفتگو کو کہتے ہیں۔

آپ کو انگریزی پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ لیکن انگریزی کی چوتھی پانچویں کتاب سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے باوجود آپ اتنی اچھی اور رواں انگریزی بولتے تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ انگریزی میں بول لینا اتنا مشکل نہیں۔ جتنا قائدِ اعظم جیسے انگریزی دان کی تقریر کا فی البدیہہ ترجمہ کرنا مشکل تھا۔ لیکن الٰہ آباد اور کراچی کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں قائدِ اعظم کے فرمان پر آپ نے ان کی انگریزی میں فصیح و بلیغ صدارتی تقریر کا ایسا صحیح اور معیاری ترجمہ سنایا کہ سامعین انگشت بدنداں رہ گئے۔

مسلم لیگ کے الیکشن کے سلسلہ میں جب قائدِ اعظم کی حقیقت شناس نظروں نے سرحدی گاندھی عبدالغفار خان کی سحر کاریوں کے توڑ کے لئے آپ کا انتخاب

کیا تاکہ سرحد میں جا کر آپ کانگرسی اثر کو زائل کر کے مسلم لیگ کو کامیاب کرائیں۔ تو آپ نے دو مہینہ کے اندر ایک اہل زبان افغانی پشتو سیکھ لی اور بقول سردار اورنگ زیب خان آپ نے وہاں پشتو میں تقریریں کر کے کانگرسی اثر زائل کر دیا۔

ان کے علاوہ آپ دیہاتی اردو۔ مرہٹی اور تلنگی زبانیں بھی جانتے تھے۔ اور دکن کے جن علاقوں میں یہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ وہاں مجلس اتحاد المسلمین کے جلسوں میں انہی زبانوں میں خطاب کرتے تھے۔

اشتراکی جراثیم

زبان دانی کے علاوہ آپ کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ "آوازِ دوست" کے خالق مسٹر مختار مسعود کی طرح جس وقت چاہیں اور جس موضوع پر چاہیں تقریر کرالیں۔ ایک مرتبہ نظام دکن کے بھائی نواب بصالت جاہ کی زیرِ صدارت سیرت النبی کا خصوصی جلسہ تھا اور آپ کو بھی سیرت پر تقریر کرنی تھی۔ ان دنوں وہاں کے تعلیمی اداروں میں بھی اشتراکیت کے جراثیم پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب آپ سیرت پر تقریر کرنے کے لئے سٹیج پر تشریف لائے تو آپ کو ناکام بنانے کے لئے یونیورسٹی کے ایک اشتراکیت زدہ طالب علم نے فوراً بڑھ کر کہا کہ آپ اشتراکیت اور اسلام پر روشنی ڈالیں۔ بس پھر کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ آپ نے بغیر تیاری اسی وقت اس پر ایک ایسی پرمغز۔ مدلل۔ مؤثر اور فی البدیہہ تقریر فرمائی کہ اشتراکی سازشیوں کے پتے پانی ہو گئے اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی فرطِ محبت سے اٹھ کر آپ کو لپٹ گئے اور فرمایا:-

"نواب، ہم تو تم کو عوام کا استاد سمجھتے تھے۔ مگر تم تو ہمارے بھی استاد ہو! واہ وا وا وا!! ہماری تو آنکھیں کھل گئیں" (حیات بہادر یار جنگ)

شعر و شاعری

گو آپ کی طبع شاعرانہ تھی۔ جس کی تائید آپ کی نثر کرتی تھی۔ مگر پھر بھی جب موٹر میں بیٹھے کچھ فرصت کے لمحات مل جاتے۔ تو بڑے

سلیقہ سے معیاری شعر کہتے۔ مگر حتی الوسع شعر گوئی سے بچتے اور فرماتے :۔

"میں بالارادہ اس جذبہ کو دباتا ہوں کیونکہ شاعر بالعموم عمل سے دُور ہوتے ہیں اور مجھے کچھ کام کرنا ہے۔"

آپ کا تخلص خُلق تھا۔ شاہنشہ اقلیم خطابت مشہور تھے۔ آپ کے اشعار بھی آپ کی شانِ عبدیت کے مظہر تھے۔ جس کا اندازہ اس رباعی سے لگایا جا سکتا ہے ؎

دولت کو جہاں کی آنی جانی سمجھو
عزت کو خدا کی اک نشانی سمجھو
اتراؤ نہ اپنی خوش بیانی پر خلق
اس کو بھی خدا کی خوش بیانی سمجھو

جذبۂ تبلیغ

نواب صاحب کی ابتدائی عمر تو مجاہدۂ نفس میں گزری اور جب آپ صاحبِ اختیار و اقتدار ہوئے تو آپ نے وانذر عشیرتک الاقربین (اے محمدؐ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ) کے امر ربی کے تحت گھر سے تبلیغ شروع کی۔ ان کی اصلاح کرنے کے بعد آپ میدان میں نکلے اور لا اکرہ فی الدین کے قرآنی مسلک کے تحت وہ کام شروع کیا۔ جو مسلمان شہنشاہوں نے اپنے ایک ہزار سالہ عہدِ حکومت میں نہ کیا تھا۔ بودر جو پاک طینت۔ درویش صفت۔ اربابِ عزیمت بزرگانِ دین نے کر دکھایا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں محض تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آپ نے بھی ۱۹۲۷ء میں ایک مجلس بنام انجمن تبلیغ الاسلام قائم کی اور گھر کے آرام کو ترک کر کے مسلسل تین برس تک حیدر آباد کے گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ کی بادیہ پیمائی کر کے تبلیغ کا فرض کفایہ اس خوبی سے ادا کیا کہ صرف آپ کے ہاتھ پر پانچ ہزار غیر مسلم مسلمان ہوئے اور مجموعی طور پر آپ کی انجمن کے ذریعہ بیس ہزار غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔

آپ کے تبلیغی کارناموں کے نتائج اور حسنِ خطابت کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے فرمایا:۔

"اس سے بڑھ کر نواب صاحب کی اور کیا تعریف کی جائے کہ جب آپ کی تقریر ہو چکتی ہے۔ تو ہزاروں بے نمازی، نمازی ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں راہ گم کردہ، راہِ راست پر آجاتے ہیں۔ ہزاروں بے عمل، عمل کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ خود میری آنکھوں نے بارہا کیا ہے۔" وعظ گوئی" پر نواب صاحب کا بڑا احسان ہے کہ ان کی تقاریر کی وجہ سے وعظ کا گرا ہوا معیار پھر انتہائی بلند ہو گیا۔ یا تو یہ عالم تھا کہ انگریزی پڑھے لکھے مذہبی باتیں سننا گوارا ہی نہ کرتے تھے یا اب یہ ہے کہ نواب صاحب کی تقاریر کی وجہ سے ہر ایک ان کو بڑی دلچسپی اور تن دہی سے سنتا ہے اور ان کی ٹوٹی پھوٹی تقلید کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔"

(بحوالہ صدر)

عوام و خواص کے قطع نظر آپ کی ایمان افروز اور بصیرت آفرین تقریر سننے کے لئے بسا اوقات خود نظام حیدر آباد بھی آجاتے تھے۔ وکٹری پلے گراؤنڈ میں مجلس میلاد کے اندر آپ نے حیاتِ طیبہؐ کی جامعیت پر جو معرکۃ الآرا تقریر فرمائی۔ اس میں خود خسروِ دکن موجود تھے۔ اس اثر آفرین تقریر سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ دوسرے ہی دن "بہادر یار جنگ" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

آپ صرف تقریر کرکے یا کسی کو مشرف بہ اسلام کرکے چلے نہ جاتے تھے۔ بلکہ اس بات کی خاص طور پر پڑتال کرتے تھے کہ جو اچھوت مسلمان ہوتے ہیں۔ ان سے مسلمان کیسا سلوک کرتے ہیں۔ اگر کہیں سے کوئی شکایت آتی کہ وہ ان کے ساتھ مساویانہ سلوک نہیں کر رہے یا مل جل کر نہیں کھاتے۔ تو آپ فوراً وہاں پہنچ کر ڈیرے ڈال دیتے۔ وہاں

کے لوگوں کو سمجھاتے ۔ جسکا نتیجہ یہ نکلتا کہ تیسرے دن دونوں ایک ہی دسترخوان اور ایک ہی پلیٹ میں کھاتے نظر آتے اور تب آپ واپس آتے ۔ ہندوؤں نے مسلمان ہونے والے اچھوتوں پر روزی کے دروازے بند کر دیئے ۔ جب آپ کو اس بات کی خبر پہنچی ۔ تو آپ نے اپنی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ ان کے معاشی تقاضے پورے کرنے کے لئے وقف کر دیا ۔ یہ سب آپ کی شخصیّت کے کارنامے تھے ۔ ورنہ دنیادار خطیبوں اور واعظوں کے حالات تو سب کے سامنے ہیں ۔

آپ کی تبلیغ کا دائرہ صرف عوام تک محدود نہ تھا ۔ حکام تک بھی وسیع تھا ۔ یہانتک آپ خود نظام دکن کو بھی نہ بخشتے تھے ۔ نظام کو بھی آپ کی تقریر سننے کا اشتیاق رہتا تھا ۔ ایک بار ۱۹۳۰ء میں نظام کسی اطلاع کے بغیر آپ کی تقریر سننے سامعین میں آکر چپکے سے بیٹھ گئے تو نواب صاحب نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول یاد دلایا کہ :-

"حاکم رعایا کا نوکر ہوتا ہے ۔ جاہ و جلال عارضی ہے ۔ بطور ایک مومن اور سچے مسلمان کے اپنی رعایا کی دیکھ بھال اور خدمت کرنا آپ کے فرائض اولین میں شامل ہے ۔ جس پر نظام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "

حق گوئی و حق پسندی

دین کے معاملہ میں آپ مصلحت وقت کی پروا نہیں کرتے تھے ۔ آپ کو علامہ اقبال سے بڑی عقیدت تھی ۔ آپ نے اپنے گھر "بیت الامت" میں درسِ اقبال شروع کر رکھا تھا اور آپ کہا کرتے تھے کہ :-

"کسی کا مہدی کوئی اور ہو تو ہو، میرا مہدی اقبالؔ ہے "

اور اگر یہ کہا جائے کہ نواب صاحب اپنے دور کے مہدی تھے ۔ تو بے جا نہ ہوگا ۔

درسِ اقبال کے خاتمہ پر ایک مرتبہ شام کی نماز کا وقت آپہنچا۔ جس کے لئے صحن میں انتظام تھا۔ اسلئے لوگ نماز کے لئے صحن کی طرف کھسکنے لگے۔ نواب صاحب نے اپنے ایک بڑے عقیدت مند کو نماز سے راہِ فرار اختیار کرتے دیکھا تو نواب کا چہرہ حمیتِ ایمانی کے جوش سے سرخ ہوگیا اور کڑک کر فرمایا:۔

"جناب نماز کا وقت ہوچکا ہے۔ آپ کدھر جا رہے ہیں؟ اگر آئندہ سے نماز پڑھنے کا ارادہ نہیں تو میرے گھر میں قدم رکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ کی ہماری دوستی کس کے لئے ہے"؟

یہ صاحب کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ آل انڈیا بلکہ عالمی شہرت کے مالک تھے۔ اور نواب صاحب کے محبوبوں میں سے تھے۔ مگر دین کے معاملہ میں آپ نے اپنی دوستی اور اسکی عالمی شہرت پر حق پسندی کو ترجیح دی۔ جو ایک مردِ مومن کا شعار ہے اور اسی حق پسندی کی وجہ سے آپ پر عوام۔ حکام۔ مسلمان اور غیر مسلم سب بڑے خلوص سے اعتماد کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کی زبان آپ کے دل کی رفیق تھی۔ منافقت کو تو کبھی پاس بھٹکنے کی جرأت ہی نہ ہوسکتی تھی۔ آپ بدوران گفتگو یا تقریر چھوٹے چھوٹے، چبھتے ہوئے فقروں میں راہِ حق کی اس حسین انداز سے نشاندہی کردیتے تھے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اکثر حاضرین سے فرماتے:۔

"پچاسوں در کی جبہ سائی چھوڑ کر انسان صرف ایک بارگاہ کی ناصیہ فرسائی کرنے لگ جائے تو ساری کائنات اسکی ہو جائے گی۔ پچاسوں کو خوش کرنے کی کوشش، ایک کو بھی راضی نہ کرا سکے گی"۔

آپ کی حق گوئی نے عوام و خواص کو اتنا آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ کہ اگر کسی جلسہ کے اختتام پر لوگ اٹھ کر جا رہے ہوں اور اس وقت نواب صاحب کی تقریر کا اعلان کر دیا جاتے۔ تو لوگ فوراً پلٹ آتے تھے اور اگر کسی جلسہ میں آپ کی تقریر کے اشتیاق

میں کسی دوسرے کی تقریر نہ سننا چاہتے ہوں اور آپ کو پتہ لگ جاتا۔ تو فوراً اٹھ کر یوں گرجنے لگتے :-

"کوئی سنے یا نہ سنے۔ کوئی بیٹھے یا چلا جائے۔ میں خود مولانا کو آخیر تک سنوں گا۔ میں تو انہی کا لیکچر سننے آیا ہوں۔ جب تک وہ اپنا لیکچر ختم نہ کریں گے۔ میں ہرگز ایک لفظ بھی بولنا شروع نہ کرونگا ——— ہے کہیں اس دور میں صداقت و شرافت کی ایسی مثال"۔

(صدقِ جدید)

طنز و مزاح آپ کی ترہیب ہو یا ترغیب، طنز و مزاح، سب میں تبلیغِ دین کا پہلو شامل ہوتا تھا اور بڑے دلنشین انداز میں شامل ہوتا تھا۔

آپ اپنا قومی لباس ترکی ٹوپی۔ اچکن۔ پاجامہ پہنے، بلادِ اسلامیہ کی سیر کے دوران اٹلی کے ساحل سے گزر رہے تھے تو وہاں کے ایک باشندے نے آپ کے لباس پر اعتراض کیا کہ یہ لباس اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تو آپ نے اسے اتنا کہہ کر خاموش کر دیا کہ :-

"میرا لباس بہ حیثیت مجموعی خوش وضع ہے اور اٹھنے بیٹھنے میں مزاحم نہیں ہوتا۔ البتہ اس میں ایک نقص ہے جو تمہارے لباس میں نہیں پایا جاتا وہ یہ کہ اس سے انسانی جسم کی فطری تراشش ظاہر نہیں ہوتی"۔

کیونکہ انگریزی لباس خواہ زنانہ ہو خواہ مردانہ، وہ جسم کے تمام اعضاء کا پورا حدود اربعہ پیش کر رہا ہوتا ہے۔

ایک زنانہ عربی مدرسہ کے معائنہ کے دوران باتوں باتوں میں استانیوں سے کہا :-

"وہ عورت ہی کیا۔ جس کو گھر سے باہر رہنے میں، جلسوں اور کلبوں میں

مزہ آئے۔ ایسی تعلیم سے تو وہ تعلیم بہتر ہے۔ جو تم یہاں دے رہی ہو"
پھر لڑکیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"شاید تم کو معلوم ہو گا کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم ابدان اور دوسرا علم دین۔ علم دین کو دیگر علوم پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ تمہارے سوچنے اور عمل کے طریقوں کو درست بناتا ہے۔ خدا کا خوف اور سچی محبت سکھاتا ہے۔ اور روحانی ترقی میں مدد دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسکا سیکھنا شروع میں کچھ غیر مانوس سا معلوم ہو گا۔ لیکن کچھ دشوار نہیں۔ امید ہے کہ تم ہمت سے کام لو گی۔ کیا وجہ ہے کہ سات سمندر پار والوں کی زبان سیکھتی ہیں۔ تو تم کو آجاتی ہے۔ اور عربی زبان جو تمہارے قرآن کی زبان ہے۔ مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کوشش کرنے سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوتا"۔

غربا پروری جو دوسخا میں ہندو پاک کا کوئی عوامی لیڈر ان کے مقام کو آج تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ سخاوت اور اعانت صرف مسلمان حاجتمندوں تک محدود نہ تھی۔ اگر کوئی ہندو بھی آجاتا تو خالی واپس نہ جاتا۔ پھر یہ سخاوت اکائیوں دہائیوں تک نہ ہوتی۔ سینکڑوں اور ہزاروں تک ہوتی۔ آپ کی عادت تھی کہ غریب طلبار کے وظائف مقرر کرتے۔ بعض کو خود اپنے ہاں رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے۔ عام طلبار کی ہمت بڑھانے اور دین کی طرف رغبت دلانے کے لئے تاریخ اسلام میں اول دوم آنے والوں کو انعامات سے نوازتے جو حصولِ تعلیم کے لئے علی گڑھ جانا چاہتے۔ ان کو اس شرط پر قرضِ حسنہ دیتے کہ:۔

"عجلت نہ کرنا۔ جب تمہیں اللہ تعالےٰ فراخی دے تو تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دینا"

مگر واپس لینے کی نیت نہ رکھتے۔ اسکے علاوہ آپ نہ دیکھنے والے ہاتھ سے جو کچھ

دیتے۔ اسکا راز تو آپ کی وفات پر کھلا۔ تبلیغ دین کی وجہ سے اور ہندؤوں کے دھڑا دھڑ مسلمان ہونے کی وجہ سے جو ہندو آپ کو خونخوار شیر کہتے تھے۔ وہی آپ کی سخاوت کے گیت گا رہے تھے۔ دکن کے نامور بیرسٹر سری کرشن نے دارالسلام میں تعزیتی تقریر کے دوران ایسے کئی واقعات سنائے کہ آپ نے کئی ان ہندوؤں کی ڈگریاں بیباق کیں۔ جن کی بدولت ان کی املاک نیلام ہو رہی تھیں۔ آپ جن غریب مسلمانوں کی خفیہ طور پر مالی امداد کرتے۔ ان کا پتہ تو آپ کے جنازہ کی روانگی کے وقت چلا۔ آپ کی رہائش گاہ بیت الامت سے جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو لوگ یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ:۔

"پچاسوں بیوائیں۔ سینکڑوں بے یار و مددگار روتے روتے نیم مردہ ہو چکے تھے۔ اور ان کی سسکیوں کے ساتھ اگر کوئی آواز آتی تھی تو یہی کہ "اب ہم کس کے سہارے جئیں" لوگ سمجھتے تھے کہ بہادر یار جنگ کی داد و دہش مجلس اتحاد المسلمین یا لیگ کے فنڈ ہی تک محدود تھی۔ آج یہ بھید کھلا کہ خفیہ ہاتھ سینکڑوں کا سہارا بنا ہوا تھا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ چار میل کی طویل مسافت محمد بہادر خان کے جنازہ نے جن کندھوں پر طے کی۔ وہ غریبوں ہی کے کندھے تھے۔ یہ غریب اس غریب نواز کی نعش سے کچھ اسطرح لپٹے رہے کہ دوسروں کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہ دیا۔"

(حیات بہادر یار جنگ ۳۵۵)

اصابت رائے نواب بہادر یار جنگ کی نظر سے متحدہ ہندوستان یا بلاد اسلامیہ کا کوئی رہنما چھپا ہوا نہ تھا۔ ہر ایک کے متعلق آپ نہایت نچی تلی، مبنی بر حقیقت رائے رکھتے تھے۔ بلاد اسلامیہ کے سفر کے دوران جب

امان اللہ خان، شاہِ افغانستان نے آپ سے دریافت کیا کہ ہندوستان کے مسلمان میری نسبت کیا کہتے ہیں۔ تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہوں جس پر وہ زیادہ متوجہ ہوئے۔ آپ نے جواب دیا:-

"آپ ایک ایسے بادشاہ تھے۔ جو سڑک بنائے بغیر اس پرنئے زمانہ کی موٹر دوڑانی چاہتے تھے اور آپ کی جلد بازی کی وجہ سے آپ کی حکومت کی موٹر ٹوٹ گئی"

اسی طرح مفتی اعظم سید امین الحسینی کے متعلق آپ کی رائے تھی کہ اس وقت عالمگیر اخوت اور عالمگیر مفاد کو سمجھنے والا اور برتنے اور عمل کرنے کا مقصد رکھنے والا فلسطین ہی میں ایک شخص ہے اور وہ امین الحسینی ہے۔ عربوں کے متعلق آپ کی یہ رائے کتنی صحیح تھی کہ :-

"یہودیوں کا فلسطین سے خارج کرنا اتنا آسان نہیں۔ جتنا یہاں کے عربوں نے سمجھ رکھا ہے"

(دکن کا ابنِ بطوطہ)

قائدِ اعظم کے متعلق آپ کی یہ رائے تھی کہ :-

"قائدِ اعظم سے بڑھ کر گاندھی کے بدلتے ہوئے پینتروں کو سمجھنے والا حکومت کی چال بازیوں اور مکر سازیوں کو تاڑ لینے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا"

اعترافِ قائدِ اعظم بے لوثی۔ بے ریائی۔ بے غرضی۔ بے نفسی اور خلوص میں قائدِ اعظم اور قائدِ ملت میں رائی برابر فرق نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس تھے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے محبت اور عقیدت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ دونوں لیڈر جب ایک دوسرے کو ملتے تو ان کے چہروں

پرمسرت وبشاشت کی ایک لہر دوڑ جاتی اور فرطِ مسرت سے انکا چہرہ دمک اٹھتا۔ قائدِ اعظم اپنے رفیقوں اور خادموں کی تعریف کے قطعاً عادی نہ تھے۔ اگر ان کی زبان سے کسی کی تعریف میں تحسین و آفرین کے کلمات نکلے ہیں۔ تو وہ صرف قائدِ ملت نواب بہادر یار خان کے حق میں نکلے اور فرمایا:-

"اعلیٰ حضرت حضور نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ نواب بہادر یار جنگ کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں۔ لیکن بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین اور رہبر ثابت ہوئے۔ نواب صاحب نے مسلمانانِ حیدر آباد کی تنظیم میں اپنی جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ ہم سب کے لئے باعثِ فخر و مسرت ہے — خدا انہیں عمر دراز عطا کرے۔ آمین۔"

قائدِ ملت کو قائدِ اعظم سے کتنی والہانہ محبت و عقیدت تھی۔ اسکا اندازہ ان باتوں سے بآسانی لگایا جا سکتا:-

جب قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ کی خبر آپ تک پہنچی! اور ساتھ ہی بچ جانے کی بھی!! تو شکر و امتنان کی کیفیت آنسوؤں کے سیلِ رواں نے بیان کر دی۔ روتے روتے آپ کی سسکیاں بندھ گئیں۔ گھنٹے بعد جب یہ سیلاب رکا۔ مجلس اتحاد المسلمین کے مخلص کارکن مولوی حبیب محمد خان سے فرمایا:-

"خان صاحب آپ کیا جانیں قائدِ اعظم کو، ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں — اگر آج خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو ملتِ اسلامیہ ہند کی کشتی کو سنبھالنے والا تھا بھی کوئی اور؟"

رات ساری اسی عالم میں روتے روتے کٹ گئی اور صبح ہوئی تو پہلی ٹرین سے سیدھے قائدِ اعظم کو ملنے کیلئے بمبئی چل پڑے اور یہ دعا کرتے گئے:-

"اے اللہ تو میری عمر کو گھٹا کر قائدِ اعظم کو عمرِ طویل عطا فرما۔"

حقیقتِ سیاست

پاکستانی سیاست کے بارے میں بھی نواب صاحب دو ٹوک رائے رکھتے تھے۔ آپ نے کبھی مجمع کو خوش رکھنے کی کوشش نہ کی۔ جس بات کو سچ اور حق سمجھتے تھے۔ برملا، ببانگِ دہل کہہ دیتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ میں آپ نے تقریر کرتے ہوئے "سیاست کی حقیقت" یوں بیان فرمائی:-

"سن لو۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر نہیں ہے۔ وہ شیطانی سیاست ہے۔
میرے دوستو! جسمانی ناپاکی دور ہو سکتی ہے۔ لیکن ذہن و فکر اور قول و عمل کی ناپاکی وہ گندگی ہے۔ جس کو دھونے کے لئے خدا نے انبیاء جیسی ہستیاں پیدا کی تھیں۔ کیا ان ناپاکیوں کا مرکز بن کر۔ جھوٹ کو اپنا روزمرہ کا شعار بنا کر مکروفریب میں مبتلا رہ کر۔ ظلم و استبداد کو جاری رکھ کر، ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں؟ اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے۔ اور ہمیں ہندوستان کے دونوں شمالی گوشوں میں خود مختار حکومتیں مل بھی گئیں۔ تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہونگی؟ پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کرو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان کے حصول کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے۔ بلکہ پاکستان میں رہنے کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے۔"

اگر اہل پاکستان اس مردِ حق کی اس حق گوئی پر عمل کرتے۔ تو پاکستان کے دو ٹکڑے نہ ہوتے اور نہ پاکستان کو سوشلزم کی بھینٹ چڑھانے کی سعی کی جاتی۔

حسنِ خطاب حق تعالےٰ نے آپ کو جو پرشکوہ شخصیت اور مومنانہ بلند کرداری بخشی تھی۔ زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کی جو دولت عطا کی تھی۔ اس نے آپ کے حسنِ خطابت کو بڑا دلکش اور مؤثر بنا دیا تھا۔ چودھری خلیق الزمان آپ کی خطیبانہ برتری کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں :-

"خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بڑے آتش فشاں مقرر تھے۔ مگر جس قسم کی گہر باری اور تاریخی دولت مسلمانوں کو نواب بہادر یار جنگ کی تقریروں سے ملتی تھی۔ وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔ زبان کی لطافت، خیالات کی پاکیزگی اور نزاکت، الفاظ کی بندش، ان کا تسلسل سب مل کر ایک معجزہ تھے۔ مسلم لیگ کے اجلاسوں میں وہ سب سے آخر میں بولتے تھے۔ اور گھنٹوں لوگ مبہوت سنتے رہتے"۔

(شاہراہِ پاکستان)

جسکے چند نمونے درجِ ذیل ہیں۔ اتحاد المسلمین کے ایک اجلاس کی صدارت کے دوران فرمایا :-

"ہر مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے لئے خدا کی فوج کا ایک سپاہی ہے اور اگر عہدِ حاضر کے مسلمان، سپاہیت کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں۔ تو وہ یقیناً اپنے رسولؐ کی پیروی سے غفلت برت رہے ہیں ..... خون کے آنسو رلاتی ہے۔ وہ نزاکت و نسوانیت جو ہمارے نوجوانوں میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے"۔

"میں "خداوندانِ مکتب" کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ان "شاہین بچوں"

کو" خاکبازی کا درس" دینا ملت کے لئے قبر تیار کرنے کے مترادف ہے۔
یہ عشرت انگیز ماحول کے نوجوان معاشی زندگی کے مصائب کو کیونکر برداشت
کرسکیں گے۔ اور اگر ضرورت پڑے۔ تو ملک وملت کے لئے بخون وخاک
غلطیدن کی رسم کس طرح ادا کرسکیں گے"۔

نواب صاحب کی نظرِ بصیرت نے اس دَور کے نوجوانوں کے حالات کا اندازہ کرکے انہیں
متنبہ کیا کہ:۔

"جن قوموں نے رازِ حیات اور سترِ زندگی کو پہچانا۔ ان کی رفعت ومرتبت
کا پہچاننا دنیا والوں کے لئے مشکل ہوگیا۔ لیکن جن امتوں نے عالمِ ذلّت و
رسوائی میں بھی شمشیر وسناں سے بیگانہ ہوکر چنگ ورباب سے دوستی
کی۔ وہ دنیا میں کسی کے لئے قابلِ رشک نہیں رہیں"۔

آل انڈیا تبلیغ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے شیدایانِ تبلیغ کو اس راستہ کے
نشیب وفراز سے یوں آگاہ کیا:۔

"اشاعتِ پیغامِ الٰہی پر آمادہ ہونے والو! یہ وہ راستہ نہیں کہ جس
سے آبلہ پائی کے بغیر گزر جاؤ۔ یہ وہ لقمہ نہیں جو حلقوم کو زخمی کئے بغیر ہضم
ہوجائے۔ یہ وہ منزل نہیں ہے۔ جو ہفت خواں کو طے کئے بغیر ہاتھ آجائے
یہاں ترغیب کی سنہری زنجیریں ہیں۔ اور ترہیب کی آہنی طاقتیں!"

جب آپ نے حاضرین سے پوچھا کہ کیا خیال ہے؟ اس میدانِ خارزار میں کون قدم
رکھنا چاہتا ہے۔ تو آواز آئی "کہ ہم آپ کے لئے جان دینے کو تیار ہیں۔ تو آپ نے
خبردار کیا کہ:۔

"میرے لئے جان دیکر اپنی موت کو مردار نہ کرو۔ جو غیراللہ کے لئے
جان دیتا ہے۔ وہ مردار موت مرتا ہے اور تمہاری جان کی اس وقت

کوئی ضرورت نہیں ـــــ میرے آشیانہ پر بجلی چمک رہی ہے۔ اس کو جل جانے دو۔ یہ تمہارے لئے مبارک فال ہے۔ یہی ابر تمہارے گلشنِ حیات پر برسیں گے اور بہت جلد اس میں بہار آئے گی۔ مَیں اجڑے ہوئے آشیانے کی خاکستر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اٹھاؤنگا۔ ہوائیں چل رہی ہیں۔ ابر چھٹیں گے۔ آفتاب چمکے گا۔ دنیا دیکھے گی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ اور باطل کے پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔"

جوش اور ہوش

آپ ان زعما میں سے نہ تھے۔ جو قوم کے نونہالوں کو جوش دلا کر ان کو اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ آپ اپنے نوجوانوں کو ہمیشہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی تاکید کرتے تھے۔ تاکہ پھر پچھتانا نہ پڑے۔ جنوری ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کراچی میں، جب آپنے سب کچھ ملک و ملّت پر نچھاور کرنے کا اعلان کیا تو سارا مجمع بھی اس قربانی کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کا یہ جوش دیکھ کر آپ نے انہیں ہوش میں لانے کے لئے یہ مشورہ دیا:-

"اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے! مَیں نے اپنے جس عزم کا اظہار آج کیا ہے۔ وہ میری بارہ یوم کی شبانہ روز فکر و تعمق کا نتیجہ ہے۔ مَیں نے اس کی تیاری کی۔ اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ جاؤ! اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو، اپنے بچوں کی مسکراہٹوں کو، آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو۔ اپنی تجارت و ذرائع معاش کی ساری تباہیوں کا تصوّر کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو۔"

ـــ تصفیہ جوش کے عالم میں، دوسروں کی تقلید میں کر دیئے

جاتے ہیں۔ لبسا اوقات آنی اور اسی لئے فانی ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ جو شجر ملّت پر پھول بن کر چمکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بنیں۔ جو زمین میں جذب ہو جاتی ہے۔ اور جڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔ جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتی ہے۔ جو خود فنا ہوتی ہے اور پھلوں میں لذّت و شیرینی پیدا کرتی ہے"۔

"ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نظارہ بازوں کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہم بنیادوں کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہوں"۔

پاکستان کی بنیادیں بھی انہیں پتھروں پر استوار ہوئیں۔ لیکن جن کے لئے دنیا کی یہ لاثانی مملکت وجود میں آئی۔ وہ اس کی نگہبانی اور اس کی پاسبانی کے نااہل ثابت ہوئے۔ جس کی وجہ سے اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور جو کچھ بچ گیا ہے وہ سرخ زلزلوں کا شکار ہے۔

حسنِ تحریر

نواب صاحب صرف تقریر کے ہی دھنی نہ تھے۔ تحریر کے بھی دھنی تھے۔ آپ کے ایک سجادہ نشین دوست نے آپ کو اپنے ہاں عرس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے جو خط لکھا اس کا حرف حرف آپ کے سوزِ اندروں کا غمّاز ہے اور سنہری الفاظ میں لکھنے کے قابل! آپ انہیں لکھتے ہیں کہ:۔

"مجھ رندِ بادہ خوار سے پوچھو! یہ مشیخت تو کچھ تم کو بھاتی نہیں، دنیا کارگہِ عمل ہے۔ اس کو بھی تم نے عزت نشینی ہی میں گزار دیا تو اللہ میاں کے

سوال کا کیا جواب کہ زندگی میں کیا کر آئے۔ اللہ حجروں کی چار دیواری کے اندر نہیں۔ وہ آفاق کے ذرّہ ذرہ میں۔ بے کسوں کی آہ و بکا میں۔ بے وسیلوں کے نالہ و شیون میں۔ مظلوموں کی کراہ میں، دادخواہوں کی تڑپ میں، اس کے راستہ میں، رسوائیوں اور ذلت میں، ملے گا۔ باہر نکلو! اور دیکھو!! اشرف المخلوقات انسان، حاملِ بارِ امانت انسان، خلیفۃ اللہ انسان، کس طرح ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ اس کی سربلندیوں کا سامان کرو۔ یہی اصل عبادت، یہی اصل دین ہے۔ میری نہیں سنتے تو سعدیؒ کی سنو ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

خدا تم کو اچھا رکھے۔ اپنی محبت میں ایسا سرشار کرے کہ اس کی کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کی بے قراری تم کو تڑپا دے اور گوشہ عزلت سے باہر کھینچ لائے۔ ۲۴ر مئی ۱۹۳۸ء،،

حسنِ خاتمہ

اس دنیا میں ایسے حق گو انسانوں کو کبھی زیادہ دیر نہیں جینے دیا گیا۔ آپ کو خاموش کرنے کے لئے ریاست بدر کرنے کی دھمکی دی گئی۔ ایک سال کے لئے زبان بندی کا حکم جاری کر دیا۔ جب اسکا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو جاگیر ضبط کر لی گئی۔ معاشی دباؤ بھی جب ناکام رہا۔ تو کرایہ کے قاتلوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ایک ہندو جب آپ کے قتل کے ارادہ سے آیا تو اس صاحب ایمان سے خوف کھا کر اپنا پستول وہیں پھینک بیٹھا جسے آپ نے دھتکار کر باہر نکال دیا۔ اسکے بعد ایک مسلمان وکیل کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس نے مخلصانہ لیکر اور مونس و ہمدرد بن کر آپ کو ایک زہر آلود پان کھلا دیا۔ اسطرح اس وکیل نے حقِ وکالت ادا کر

نے آپ کو موت کی نیند سلا دیا۔ ۲۵ ؍جون ۱۹۴۴ء کی رات کو زمرۂ شہدا میں داخل ہو گئے اور ادھر اسلامیانِ ہند میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جب یہ خبر قائدِ اعظم کے کانوں تک پہنچی۔ تو قائدِ اعظم وفورِ غم سے بیخود ہو گئے۔ جب سنبھلے تو تڑپ کر فرمایا:۔

"نواب بہادر یار جنگ میرے عزیز دوست تھے۔ اور ان کی موت میرے لئے ایک جانگداز صدمہ ہے۔ نواب مرحوم مومن صادق تھے اور اسلام کے بہت بڑے داعی۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانانِ ہند کی زریں خدمات سرانجام دیں۔ تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ہمارے لئے قدرت کا بیش بہا عطیہ تھے"

(بے تیغ سپاہی صہ ۲۸۸)

مورخِ اسلام سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق:۔

"مرحوم کا مذاق مذہب آمیز سیاست تھا۔ ان پر دینی سیاست کا راز کھل چکا تھا۔ اور یہی راز وہ سب کو بتانا چاہتے تھے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا تھا۔ ان کا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہانتک کہ کراچی کے بعد سے لیگ کے خالص دنیاوی سیاسیوں پر ان کی تقریر بار ہونے لگی تھی"

اس ضمن میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو آپ کی ذات سے یہ توقع تھی:۔

"ہندوستان نے اگر کوئی دوسرا محمد علی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا۔ وہی اخلاص وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ۔ وہی نبض شناسی۔ وہی ہمت و عزم۔ بجز محمد علی کی انگریزی انشاء پردازی کے سب کچھ وہی ——
لیگ کی مذہبی بے راہروی کی جب کوئی شکایت سننے میں آتی تو دل کو برابر یہی اطمینان رہتا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر

سویرانشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرائیگی"۔

(صدقِ جدید ۱۹۴۴ء)

مگر قدرت نے آپ کو مسلم لیگیوں کی مذہبی بے راہروی کی اصلاح کا موقعہ دیئے بغیر آپ کو واپس بلاکر مسلم لیگیوں کو کڑی آزمائش وامتحان میں ڈال دیا۔ کہ وہ دینی سیاست کی راہ اختیار کرتے ہیں یا بے دین سیاست کی راہ!

آہ و بکا نواب بہادر یار جنگ جب اپنے اصلی وطن کو واپس لوٹ گئے۔ تو اس وقت نظام حیدر آباد دکن سے آپ کی وفاداریوں اور جان نثاریوں نے مرحوم کے حق میں یہ کلماتِ خیر کہلوائے:۔

"یہ بڑا نازک زمانہ ہے اور یہ وقت ان کی خدمات کا تھا۔ جو کام انہوں نے قوم و مذہب کے لئے انجام دیئے۔ وہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ انسان کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ سینکڑوں برس صبح و شام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے۔ جو اپنی صفات اور خدمات کی وجہ سے قوم میں ہر دلعزیز ہو جاتا ہے"۔

(قائدِ ملّت نمبر۔ روزنامہ تنظیم حیدر آباد دکن)

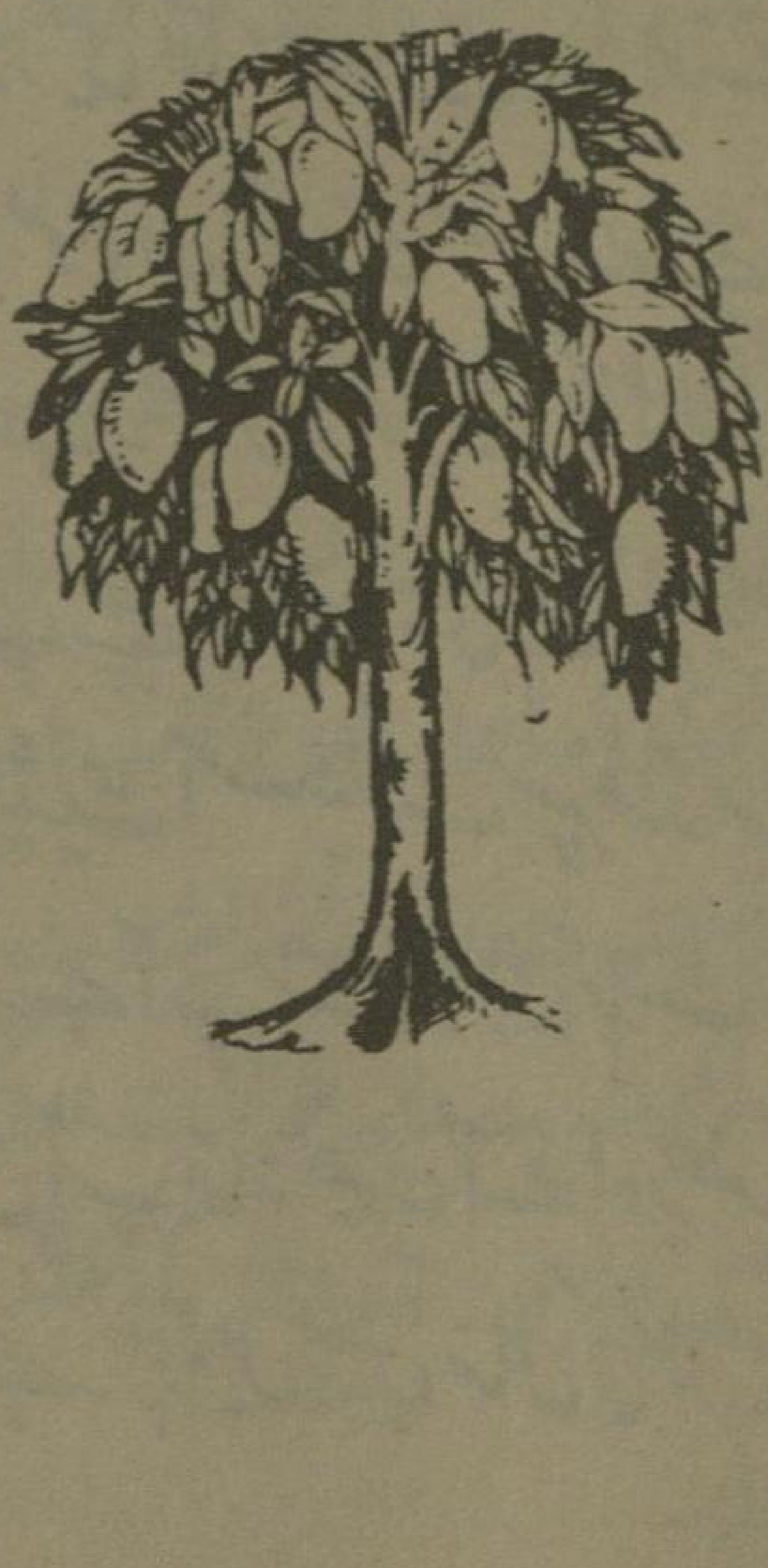
مولانا عبدالماجد دریا بادی نے آپ کی قبر کو آواز دی:۔

"خوش نصیب قبر خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لئے اللہ کے دین کا دلیر اور باہمت سپاہی آرہا ہے۔ وہ غریبوں کا سہارا تھا۔ بیکسوں کا والی تھا۔ ملّت کا پشت پناہ تھا"۔

ایسے دیندار قائد کو آج پاکستان ترس رہا ہے۔ مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ سابق صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ نے نواب صاحب مرحوم کے غم میں اٹھنے والی آہوں، نالوں، سسکیوں کی تفصیل یوں قلمبند فرمائی:۔

"عالم اسلام جس کے لئے رو رہا ہے۔ دکن رو رہا ہو۔ اس کا وطن رو رہا ہو۔ سی۔ پی میں۔ جس کیلئے ماتم کی صف بچھائی گئی۔ یو۔ پی میں جس پر آنسو بہائے گئے۔ اُف جس کیلئے مدراس چیخ رہا ہے۔ بمبئی والے دھاڑیں مار رہے ہیں۔ بہار کے باشندے کپڑے پھاڑ رہے ہیں۔ سندھیوں میں جسکا نوحہ پڑھا جا رہا ہے۔ پنجاب میں غم کا طوفان جس کے بعد اٹھا۔ اور کشمیر اور سرحد والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوا — کیا پوچھتے ہو کہ اس کو کھو کر مجھ جیسے بے کس انسان نے کسے کھو دیا ؎

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیمان گم شدے
ہم سلیمان، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے۔



(۱۷)

مولانا ظفر احمد عثمانی

تعلیمی دور جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی جب بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ اور اربابِ مسلم لیگ کو قدم قدم پر علمار ربانی کی امداد و اعانت کی ضرورت لاحق ہو رہی تھی۔ اس وقت محض اسلام کی سربلندی کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ہدایت پر جو علمار کرام اپنی خانقاہوں اور حجروں کو چھوڑ کر مردانہ اور مجاہدانہ وار میدانِ سیاست میں نکلے اور تعمیر پاکستان میں ممدو معاون ہوئے۔ وہ حضرت تھانوی کے مندرجہ ذیل مجازینِ صحبت یا خلفار ارشد تھے:۔

۱۔ علامہ شبیر احمد عثمانی۔

۲۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔

۳۔ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی۔

۴۔ مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی۔

مولانا ظفر احمد عثمانی ۱۸۹۵ء میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ وہیں قرآن حکیم اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ مزید تحصیل علوم اور انگریزی تعلیم کے لئے آپ ہردوئی۔ علی گڑھ اور میرٹھ کے سکولوں میں داخل رہے۔ مکینکل انجنیئرنگ کا ڈپلوما بمبئی کے ٹیکنیکل کالج کی چار سالہ تعلیم کے بعد حاصل کیا۔ آپ پہلے ہندوستانی تھے۔ جو بمبئی پورٹ ٹرسٹ کے میکینکل انجنیئرنگ کے شعبہ میں بحیثیت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تعینات ہوئے۔ اس سے قبل اس عہدہ پر ہمیشہ انگریز فائز رہے آپ ۱۹۳۰ء میں ٹرسٹ کی طرف سے ولایت بھیج دیئے گئے۔ رخصت کے ایام میں آپ تھانہ بھون آئے اور حضرت تھانوی کی مجالس میں شریک رہ کر فیضیاب ہوتے رہے۔ چوبیس پچیس سال کی عمر میں آپ حضرت تھانوی کے

دست مبارک پر بیعت ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ان کے مجاز صحبت قرار پائے۔ اور سرکاری ملازمت ترک کر کے تعلیم دین کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس میں یہانتک ترقی کی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر بن گئے۔ پاکستان آنے کے بعد دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو اللہ یار سندھ میں بطور شیخ الحدیث خدمت دین سرانجام دیتے رہے۔ آپ کی یادگار کتاب "اعلاء السنن" گیارہ جلدوں میں ہے۔ جو اہل حدیث کے بعض اعتراضات کے جواب میں لکھی۔ دوسری کتاب "احکام القرآن" کے نام سے حضرت تھانوی کے ارشاد پر کئی جلدوں میں تحریر کی۔ جس میں قرآن کریم سے تمام مسائل مسلک حنفیہ کے مطابق ایک جگہ جمع کر دیئے گئے۔

سیاسی دور

آپ کی زندگی کا سیاسی دور اس وقت شروع ہوا۔ جب انڈین نیشنل کانگرس، ہندوستان سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ، کے مقابلہ میں آئی۔ حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے تبلیغی قدم اٹھایا اور اس کے دوران مولانا ظفر احمد عثمانی کو تبلیغی وفد کے ساتھ قائداعظم کے پاس جانا پڑا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی راقم الحروف کے نام ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"پارٹیشن سے قبل قائداعظم سے حکیم الامت کے نمائندہ کی حیثیت سے ملنا ہوا۔ ان سے میری پہلی ملاقات مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ ۱۹۳۸ء کے موقعہ پر ہوئی۔ اور آخری بار ڈھاکہ میں ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ جبکہ قائداعظم گورنر جنرل کی حیثیت سے وہاں تشریف لے گئے۔ ہر دو دفعہ تبلیغ دین ہی کا فرض ادا کرنے کے لئے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ سیاسی امور پر میں نے خود گفتگو نہیں چھیڑی۔ قائداعظم کی گفتگو میں کوئی سیاسی پہلو ہوا تو اس پر گفتگو ہوئی۔

میری قائدِ اعظم سے مکاتبت نہیں ہوئی۔ حضرت حکیم الامت کی حیات میں ان کی مکاتبت کو کافی سمجھا۔ حضرت کے انتقال کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی پارٹیشن سے پہلے اور بعد قائدِ اعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خان کو ضروری امور کی ہدایت فرماتے رہتے تھے۔ میں نے صرف دو بار قائدِ اعظم کو بسلسلہ تبلیغ خط[1] لکھے۔"

(انداز سخن صد ۱۲۹)

تاکیدی نکات مولانا ظفر احمد عثمانی نے پہلے خط میں اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ پاکستان کے سکہ یا نوٹ پر تصویر نہ چھاپی جائے۔ دوسرے خط میں یہ تحریر تھا کہ "دستور پاکستان کی تکمیلِ انتظار میں ان امور سے غفلت نہ برتی جائے۔ جن کا شریعت اسلام نے فرض وواجب یا حرام و ناجائز ہونا صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ دستور پاکستان کو ان امور میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ جیسے نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ، جو ہمیشہ فرض رہیں گے۔ خواہ وہ دستور مکمل ہو یا نہ ہو۔ زنا شراب خوری۔ سود اور جوا، خواہ ریس کی صورت میں ہو یا قدیم طریقہ پر ہو۔ ہمیشہ حرام رہیں گے"۔ ان امور کی طرف توجہ دلائے کے بعد آپ نے لکھا کہ :-

"تمام ملازمینِ سرکار اور تمام ایسے اداروں کے متعلقین کو جنھیں سرکار سے امداد ملتی ہے۔ نماز کی تاکید کی جائے۔ رمضان کے احترام کا حکم دیا جائے۔ زکوٰۃ اور حج پر زور دیا جائے۔ اس میں کسی بات کی اصلاح کی ضرورت نہیں۔ ان پر ابھی سے عمل شروع کر دیا جائے۔ تاکہ پاکستان اور ہندوستان

---

[1] جن میں سے ایک خط کا راقم الحروف نے انگریزی ترجمہ کرا کر اس کے ہمراہ بھیجدیا۔ تاکہ قائدِ اعظم بآسانی پڑھ سکیں۔ یہ خط میری تصنیف "مشاہدات وواردات" میں چھپ چکا ہے۔

میں دیکھنے والوں کو فرق معلوم ہو۔ ورنہ کہا جائے گا کہ پاکستان بننے سے کیا نئی بات پیدا ہوئی؟

(ایضاً)

اور اسی امر کی حضرت تھانوی تاکید فرما گئے تھے کہ:-

" زعماء کا کام اس وقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں۔ اور ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اس پر موقوف ہے۔"

(ضمیمہ تنظیم المسلمین)

نہرو کی دھمکی

۱۹۴۵ء متحدہ ہندوستان کا نازک ترین سال تھا۔ ایک طرف مجلس احرار۔ نیشنلسٹ مسلمان۔ جماعت اسلامی۔ جمیعتہ العلماء ہند اور خدائی خدمتگار اپنی اپنی اغراض و مصالح کی بناء پر مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ بنائے ہوئے تھے۔ اور بالواسطہ یا بلاواسطہ کانگرس کی تائید کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف لکھنؤ میں ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو پنڈت جواہر لال نہرو ایک بہت بڑے جلسہ میں مسلمانوں کو یوں دھمکا رہے تھے:-

" اگر ہم نے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ تو ہم اسکی پوری تیاری کریں گے۔ اور جو کوئی ہماری مخالفت کرے گا۔ ہم اسے کچل دیں گے۔ ہم اپنے بنیادی اصولوں کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ ہم لڑنا جانتے ہیں۔ ہم نے حکومت برطانیہ سے بھی لڑائی کی ہے۔"

(حیات محمد علی جناح صد ۲۱۷)

تیسری طرف جمیعتہ العلماء ہند کانفرنس میں مولانا حسین احمد مدنی بوجوہ ذیل مسلمانوں کو لیگ کی بجائے کانگرس کی حمایت و امداد کی ترغیب دے رہے تھے:-

"جب کونسلوں اور میونسپلٹیوں میں ہندوؤں سے اشتراک عمل جائز ہے۔
تو دوسرے معاملات میں کیوں نہیں؟"

یہ وہ حالات تھے۔ جن کی بنار پر مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دیدیا اور مولانا حسین احمد مدنی کے مذکورہ بالا بیان کے جواب میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے فوراً یہ بیان دیا:۔

"مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ جہادِ آزادی میں اشتراکِ عمل اس شرط سے جائز ہے کہ حکم اہل مشرک غالب نہ ہو۔ مسلمان مشرکین کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوں۔ بلکہ مشرکین اسلامی جھنڈے کے نیچے ہوں۔ چنانچہ شرح سیر کبیر ص۱۴۲ جلد ۳ میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ اب فیصلہ اہلِ انصاف کے ہاتھ میں ہے کہ کانگرس میں اس وقت حکمِ شرک غالب ہے یا حکمِ اسلام؟

رہا مطالبۂ پاکستان! سو اس وقت جبکہ تمام ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا بحالت موجودہ کسی طرح ممکن نہیں۔ تو کم از کم ان صوبوں کو جہاں مسلم اکثریت ہے۔ اسلامی سلطنت بنالینا کہ وہاں اسلامی سلطنت، اسلامی اصولوں پر قائم کی جاسکے لازم اور ضروری ہے۔"

(ایضاً ص۴۵۳)

مولانا حسین احمد مدنی نے کونسلوں اور بلدیاتی اداروں کی جو مثال پیش کی تھی۔ اسکا جواب دیتے ہوئے مولانا ظفر احمد عثمانی نے فرمایا:۔

"ان محکموں میں ہندو مسلم اشتراکِ عمل، صرف حقوق غلامی میں اشتراک ہے۔ حکومت نے غلاموں کے سامنے روٹی کے چند ٹکڑے ڈال دیئے ہیں کہ ان کو حصہ رسدی تقسیم کرلو۔ ہندو مسلمان ان کو حصہ رسدی تقسیم کرتے ہیں۔ اگر کوئی فریق اپنا حصہ نہ لے۔ بھوکا مرے گا۔ اس کو اس اشتراکِ عمل

سے جسکا نام جہادِ آزادی رکھا گیا ہے، دور کی بھی نسبت نہیں۔ کانگرس کیساتھ اشتراکِ عمل، جہاد آزادی میں اشتراکِ عمل ہے۔ جس پر مذہبی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ موت وحیات کا مدار ہے۔" (ایضاً صد ۴۵۴)

تائیدِ شبیرؒ

اس زمانہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب فراش تھے۔ بوجہ طویل علالت سیاسیات میں سرگرمِ عمل نہیں ہو سکتے تھے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے جب آپ کو نزاکتِ وقت کا احساس دلایا۔ تو انہوں نے اس شرط پر سیاسی کاموں میں حصہ لینا منظور کر لیا کہ اگر وہ خود کوئی کام نہ کر سکے۔ تو پھر ان کی طرف سے مولانا ظفر احمد عثمانی حق نیابت ادا کریں گے۔ یہ تجویز انہوں نے منظور کر لی۔ اس کے بعد علالت ونقاہت کے باوجود مولانا شبیر احمد عثمانی نے متذکرہ بالا بیان کی تائید میں اپنا یہ بیان تحریر کر کے جاری فرمایا:۔

"کانگرس کے دائرہ میں، جہاں ہندو عناصر کے کھلے ہوئے غلبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مٹھی بھر مسلمان داخل ہو کر تو یہ امید کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات میں ان سب کو راہِ راست میں لے آئیں گے۔ لیکن مسلم لیگ کے متعلق جو خالص مسلمانوں کی جماعت ہے۔ کیا اس امید کے دروازے بند ہو چکے ہیں؟ یہ چیز کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے۔

مسلم لیگ کلمہ گو مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس میں ہزار عیب سہی۔ تاہم غیر مسلم قوموں کی نسبت تو وہ ہم سے قریب تر اور مفید تر ہے۔ اگر مسلم لیگ ناکام ہو گئی۔ تو قوی اندیشہ ہے کہ ایک سچا اصول ہی شاید ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے۔ اور مسلمانوں کے قومی وسیاسی استقلال کی آواز فضائے ہندوستان میں پھر کبھی سنائی نہ دے۔"

(عصر جدید کلکتہ ۲۱ر نومبر ۱۹۴۵ء)

ان بیانات نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ جو لوگ ابھی تک مسلم لیگ کی حمایت پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ وہ اس میں شامل ہو کر اس کے معین و معاون بن گئے۔

کڑا امتحان اسی اثناء میں قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خان کو مسلم لیگ نے الیکشن میں بطور مہرہ کے آگے کر دیا۔ پاکستان کے نام پر یہ پہلا الیکشن نومبر ۴۵ء میں لڑا جا رہا تھا۔ کانگرس کے گرگ کہن جانتے تھے۔ کہ اب جب مسلم لیگ کو حضرت تھانوی اور ان کے خلفاء کی حمایت حاصل ہو گئی ہے۔ تو وہ نوابزادہ کے الیکشن میں ضرور مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو استعمال کرے گی۔ اس لئے اس نے مسلم لیگ کو ناکام بنانے کے لئے نوابزادہ لیاقت علی خان کے مقابلہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی کے ایک عزیز محمد احمد کاظمی کو کھڑا کیا۔ تاکہ بوجہ قریبی رشتہ داری وہ کاظمی صاحب کی مخالفت نہ کر سکیں اور دوسری طرف کانگرس نے کاظمی صاحب کی امداد و حمایت کے لئے مولانا حسین احمد مدنی کو اس محاذ پر لا کھڑا کیا۔ جس پر نوابزادہ صاحب بہت گھبرائے مسلم لیگ کے ارباب اقتدار الگ پریشان تھے۔ کہ اب کیا کریں۔ اسی پریشانی کے عالم میں نوابزادہ صاحب نے سردار امیر اعظم خان کو (جو بعد میں پاکستان کے وزیر مملکت بنے) خط دے کر مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا شبیر علی کے پاس تھانہ بھون بھیجا۔ اور انہیں لکھا کہ اگر اس وقت آپ مسلم لیگ کی حمایت میں نہ نکلے تو اس کی کامیابی دشوار ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی مولانا ظفر احمد سے پرزور سفارش کی۔ جس پر انہوں نے اپنی رشتہ داری اور اپنے خاندانی مفاد کو نظر انداز کر کے ملی مفاد کی خاطر مسلم لیگ کے مقابلہ میں اپنے عزیز کی مخالفت کا دم بھر لیا اور سردار امیر اعظم کے ہمراہ سہارنپور۔ ڈیرہ دون۔ مظفر نگر اور بلند شہر کے اضلاع میں مولانا حسین احمد مدنی کے تعاقب میں پھر کر رائے عامہ کو مسلم لیگ کے حق میں ہموار کرتے رہے۔

پریشان کن حالات

یہ الیکشن جن حالات میں لڑا گیا۔ اس کا نقشہ خواجہ آشکار حسین نے یوں کھینچا ہے۔ جو "نقاد" اور "پیام" میں شائع ہوا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :-

"سب سے زیادہ مقابلہ خود لیاقت علی خان کے حلقہ میں تھا۔ مخالف امیدوار محمد احمد کاظمی تھے۔ کانگرس کی جانی و مالی امداد انہیں حاصل تھی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ مزید براں یہ علاقہ مولوی زادہ اور پیرزادہ تھا۔ مولوی ہی پیر بھی تھے اور ان کی اکثریت مسٹر کاظمی کے ساتھ تھی۔ لیکن مقابلہ میں لیگ کی انتخابی مشینری کا کوئی پرزہ بھی درست نہ تھا۔ لیاقت علی دہلی سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ انہیں پورے ملک کے انتخابات کی فکر تھی۔ اپنے حلقہ کا خیال کیسے ہوتا؟ جب حالات بدتر ہونے لگے تو انہیں سنبھالنے کے لئے علی گڑھ سے طلبار کی یلغار کی گئی۔ مجھے بھی پروفیسر حلیم نے ایک وفد کے ساتھ روانہ کیا۔ خورجہ۔ بلند شہر۔ ہاپوڑ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حالات کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر مظفر نگر سے ہدایات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں بھی یہی بدحالی تھی۔ لیاقت علی کے مینجر سردار اکرم خان۔ ان کے صاحبزادے امیر اعظم خان اور طلبار علی گڑھ کے سربراہ پروفیسر عمر علی سب دم بخود تھے۔ فیصلہ ہوا کہ پروفیسر عمر علی دہلی جا کر لیاقت علی خان کو لائیں۔ اور دوسری طرف کسی نہ کسی طرح (حضرت تھانوی کے خلیفہ) مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ اپنی موافقت میں حاصل کیا جائے۔ کیونکہ تنہا علامہ عثمانی کی تائید اس حلقہ میں خصوصاً مظفر نگر اور سہارنپور میں ناکافی تھی۔ دیوبند جاتے سب کو ڈر لگتا تھا۔ قرعہ فال میرے نام پڑا۔ میں وہاں پہنچا۔ دو دن کی ردو قدح کے بعد فتویٰ حاصل کیا

اور اسے اخبارات کو بھیج کر اور ضروریات کے مطابق پوسٹر چھپوا کر ہم سہارنپور پہنچے۔ وہاں حامیانِ لیگ نے کہا کہ یہاں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فتویٰ کے بغیر کام نہ چلے گا۔ میں نے دیوبند جا کر موصوف کا بھی فتویٰ حاصل کیا اور سہارنپور پہنچ کر اس کی طباعت کے انتظامات کرائے۔ ۲۷ر نومبر کو پولنگ ہونے والا تھا۔ ۲۴ر کو لیاقت علی سہارنپور پہنچے۔ میں نے فوراً مفتی صاحب کا فتویٰ پیش کر دیا۔ جسے دیکھ کر اچھل پڑے "

(پیام دہلی ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۵ء)

پہلی کامیابی اگر اس الیکشن کے لئے مولانا ظفر احمد عثمانی خود باہر نہ نکلتے اور مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا قاری محمد طیب اور مولانا مفتی محمد شفیع جو اس حلقہ انتخاب میں بے تاج بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیاقت علی خان کی پشت پناہی نہ کرتے تو کانگرس مسلم لیگ کو ٹاٹاؤں کے روپوں اور دوسری مسلم جماعتوں کے تعاون سے شکست فاش دینے میں کامیاب ہو جاتی۔ ان کے فتوؤں اور تقریروں سے نوابزادہ لیاقت علی خان تین ہزار ووٹوں کی کثرت سے یہ الیکشن جیت گئے۔ اور مسلم لیگ کو بے نظیر اور جمعیتہ علماء اسلام کو پہلی تاریخی فتح نصیب ہوئی۔ جس پر سب سے پہلے نوابزادہ صاحب نے تھانہ بھون مولانا ظفر احمد عثمانی کو مبارک بادی کا تار دیا۔ اور پھر ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو ان کے نام مندرجہ ذیل چھٹی نمبری ۵۰۵۰ ارسال کی:-

" محترم المقام زاد اللہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

میں انتہائی مصروفیتوں کے باعث اس سے قبل آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں اللہ پاک نے ہمیں بڑی نمایاں کامیابی

عطا فرمائی۔ اس سلسلہ میں آپ جیسی ہستیوں کی جدوجہد بہت باعثِ برکت رہی۔ آپ حضرات کا اس نازک موقع پر گوشۂ عزلت سے نکل کر میدانِ عمل میں اس سرگرمی کے ساتھ جدوجہد کرنا بے حد مؤثر ثابت ہوا۔ اس کامیابی پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ خصوصاً اس حلقہ میں جہاں سے ہماری لیگ نے مجھے کھڑا کیا تھا۔ آپ کی تحریروں اور تقریروں نے باطل کے اثرات بہت حد تک ختم کر دیئے۔

اب اس سے سخت تر معرکہ سامنے ہے۔ امید ہے اس عرصہ کے لئے آپ کو رخصت مل جائے گی اور آپ کی تحریریں اور تقریریں اور مجاہدانہ سرگرمیاں آنے والی منزل کی دشواریوں کو بھی معتد بہ حد تک ختم کر سکیں گی۔

والسلام مع الاحترام

لیاقت علی خان"

یہ حقائق ان حضرات کے لئے سرمہ بصیرت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے اپنی تحریروں میں علماء ربانی کے اظہر من الشمس کارناموں پر دھول ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

خواہشِ قائدِ اعظم

انتقال اقتدار کے فیصلہ کے بعد ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو جب مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع قائدِ اعظم کو مبارک باد دینے ان کی کوٹھی پر پہنچے تو قائدِ اعظم نے سرو قد اٹھ کر دربار اشرفیہ کے ان نمائندگان کا خیر مقدم کیا اور جب انہوں نے آپ کو مبارک باد پیش کی۔ تو قائدِ اعظم نے فرمایا:۔

"مولانا یہ مبارک آپ کو ہے کہ آپ کی کوششوں سے ہی یہ کامیابی ہوئی ہے"۔

مولانا ظفر احمد عثمانی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں:۔

"اسی ملاقات کے دوران قائدِ اعظم نے از خود فرمایا کہ" مولانا مجھے تو اس وقت

بڑا فکر سلہٹ اور فرنٹیئر کے ریفرنڈم کا ہے۔ اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو یہ بہت بڑا نقصان ہو گا۔ ہم نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ پاکستان اس ریفرنڈم میں کامیاب ہو جائے۔ اس پر قائدِ اعظم آبدیدہ ہو گئے۔ اور فرمایا کہ سرحد پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور سلہٹ کا علاقہ بھی مشرقی پاکستان کے لئے ایسا ہی ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ پاکستان اس ریفرنڈم میں کامیاب ہو۔

ہم نے کہا کہ ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ انشاء اللہ پاکستان اس میں کامیاب ہو گا۔ بشرطیکہ آپ اعلان کر دیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام جاری ہو گا۔ اور اسکا دستور اسلامی ہو گا۔ کیونکہ فرنٹیئر اور بنگال کا مسلمان سیاسی مصالح کو نہیں جانتا۔ وہ صرف اسلام کو جانتا ہے۔ اور اسی کے نام پر ووٹ دے سکتا ہے۔

اس پر قائدِ اعظم نے فرمایا:۔

اسلامی نظام

"مولانا! میں تو اس کا بارہا اعلان کر چکا ہوں اور جب پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی تو وہاں اسلامی دستور کے سوا اور کون سا دستور ہو سکتا ہے؟ آپ بخوشی اپنی تحریر و تقریر میں میرے حوالے سے اس کا اعلان کرتے رہیں اور ان کو پورا اطمینان دلائیں کہ میں نے قوم سے کبھی غداری نہیں کی۔ جو میں نے پہلے بارہا کہا ہے۔ وہ میں آج بھی کہتا ہوں کہ پاکستان کا نظامِ حیات اسلامی ہو گا۔ اور اسکا دستور کتاب و سنت کے موافق ہو گا۔

اس پر میں نے کہا کہ میں انشاء اللہ سلہٹ کا محاذ سنبھالوں گا اور حضرت مولانا شبیر احمد نے فرنٹیئر کے میدان کا وعدہ کیا۔ جس پر قائدِ اعظم

کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اور انہوں نے کھڑے ہو کر ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ خدا آپ کو اور آپ کے ذریعہ پاکستان کو کامیاب کرے"۔

(تعمیر پاکستان و علمار ربانی صہ)

پختونستان سٹنٹ اس تاریخی ملاقات کے وقت تک دنیا اسی طرح پختونستان کے لفظ سے ناآشنا تھی۔ جسطرح ۱۹۲۳ء سے قبل لفظ پاکستان سے۔ جب تک انگریزوں نے پاکستان کا مطالبہ منظور نہیں کیا تھا۔ سرحدی گاندھی اور بلوچستانی گاندھی نے پختونستان کا نعرہ بلند نہ کیا تھا۔ اور نہ کبھی یہ مطالبہ سامنے آیا تھا کہ صوبہ سرحد کا نام پختونستان رکھ دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ متحدہ ہندوستان اور مضبوط مرکزی حکومت کے حامی رہے۔ کیونکہ اس صورت میں زمامِ اقتدار ہندو کے ہاتھ رہتی تھی۔ لیکن جب انگریزوں نے ہندوؤں کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود قائدِاعظم کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ تو سرحدی گاندھی نے قائدِاعظم کی مذکورہ بالا ملاقات کے قریباً ایک ہفتہ بعد پختونستان کا نعرہ بلند کر دیا۔ اور سرحد میں ریفرنڈم جیتنے کے لئے اور مسلم لیگ کو ناکام بنانے کے لئے ملک اکبر علی خان آف بنوں کی دیہی قیامگاہ پر سرحد کی کانگرس پارٹی۔ خدائی خدمتگار صوبائی کانگرس پارلیمنٹری پارٹی۔ اور زئی پختون کی ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی۔ جس میں اس امر کا ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ تمام پختونوں کی ایک آزاد ریاست کا اعلان کیا جائے۔ جسکا دستور اسلامی جمہوریت پر مبنی ہو۔ اور جس میں سماجی انصاف کو مدِنظر رکھا جائے۔ یہ جلسہ پانچ روز تک جاری رہا۔ جس میں صوبہ کے پانچ سَو نمائندے شریک ہوئے اور آزاد قبائل سے وزیر۔ محسود اور پٹھانوں نے شرکت کی۔

اس جلسہ کی رپورٹ ایسوسی ایٹڈ پریس نے مہیّا کی۔ جو روزنامہ" آزاد" لاہور اور" انصاری" دہلی کی ۲۵ر جون ۱۹۴۷ء کے پرچہ میں شائع ہوئی۔

نہرو کی چال

سلہٹ اور فرنٹیئر دونوں مسلم اکثریت کے صوبے تھے۔ اسلئے وہاں ریفرنڈم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن چونکہ سلہٹ میں مولانا حسین احمد مدنی کا بڑا اثرو رسوخ تھا۔ جو ہر سال وہاں ماہِ رمضان گزارتے۔ تراویح میں قرآن شریف سناتے۔ تراویح کے بعد درسِ قرآن دیتے اور اعتکاف میں بیٹھتے اسلئے وہاں ان کے بڑے مرید اور معتقد تھے۔ اور ان کی وجہ سے ہندو سلہٹ کو اپنی جاگیر سمجھتے تھے۔ دوسری طرف فرنٹیئر میں عبدالغفار خان کی سرخپوش تحریک کا زور شور تھا۔ خدائی خدمتگار سارے صوبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور کانگرس اپنے ایجنٹوں، خان برادران کی حکومت کی وجہ سے فرنٹیئر کو اپنا زیرِ نگین سمجھتی تھی۔ اسلئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنے دوست ریڈکلف کو شیشہ میں اتار کر مسلم اکثریت کے ان دو صوبوں میں ریفرنڈم رکھا دیا۔ تاکہ وہ مولانا حسین احمد مدنی اور خان برادران کی مدد سے پاکستان کو ابتدا ہی میں لولا لنگڑا کر دیں۔ اور اگر وہ ریفرنڈم نہ جیت سکے۔ تو پختونستان کا سوال اٹھا کر پاکستان کو صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ سے محروم کر کے انہیں افغانستان میں شامل کرا دیں گے۔ چنانچہ اس امر کا سرحد کی کانگرسی وزارت کے وزیرِ مال اور سرحدی گاندھی کے سمدھی قاضی عطاء اللہ خان نے اعلان بھی کر دیا کہ پٹھان پاکستان کے مقابلہ میں افغانستان میں شمولیت کو ترجیح دیں گے۔ ملاحظہ ہو "انصاری" دہلی مورخہ ۱۲-۷-۴۷ء حالات کی اسی سنگینی سے قائدِ اعظم کو آبدیدہ ہو کر علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی سے ریفرنڈم جیتنے کی درخواست کرنی پڑی۔

نوعیتِ پروپاگنڈا

مولانا ظفر احمد عثمانی جس وقت سلہٹ پہنچے تو وہاں ان نکات پر پروپاگنڈا جاری تھا۔

"پاکستان میں لازمی طور پر اسمبلی ہوگی اسمبلی میں ہندو بھی ہوں گے۔

وہاں دستور اسلامی کس طرح نافذ ہو گا۔ اور جب دستور اسلامی نہ ہو گا۔ تو پاکستان دارالاسلام کیسے بنے گا"۔

شہر میں ارباب مسلم لیگ کے خلاف بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر عوام کو یقین دلایا کہ:۔

"ہندو اقلیت دستورِ اسلامی کے نفاذ کو قطعاً نہیں روک سکتی۔ کیونکہ وہ پاکستان کا مطلب خوب سمجھتی ہے۔ کہ وہ دارالاسلام ہی ہو گا۔ جو ہندو پاکستان میں رہیں گے۔ یہ سمجھ کر رہیں گے۔ آخر ایک ہزار سال جو ہم نے نصف عالم پر حکومت کی ہے۔ تو کیا ہمارے زیرِ نگین کفار نہیں بستے تھے؟ کیا اسوقت دستور اسلامی نہ تھا؟ کیا کفار ہمارے دستور سے اور قوانین سے خوش نہیں تھے"۔

سلہٹ میں ووٹنگ کے دوران گڑبڑ کرنے اور جعلی ووٹ بھگتانے کا بھی انتظام تھا۔ مگر مخالفین کی کوئی پیش نہ چلی۔ ریفرنڈم سے فارغ ہوتے ہی مولانا ظفر احمد عثمانی نے راقم الحروف کو جو رپورٹ ۱۸-۷-۴۷ کو بھیجی۔ اس میں تحریر تھا کہ:۔

"الحمدللہ کہ آج میں سلہٹ ریفرنڈم سے فارغ ہو کر ڈھاکہ پہنچا۔ اگر ہندو آفیسروں نے گڑبڑ اور بے ایمانی نہ کی (جسکا ثبوت ریفرنڈم کے دو دنوں میں مل چکا ہے اور کئی ہندو آفیسر اور ہندو عورتیں اس جرم میں گرفتار ہو چکی ہیں)۔ تو انشاء اللہ ستر ہزار ووٹوں سے ہم غالب رہیں گے۔ میرے سلہٹ پہنچنے اور چار تقریریں کرنے کے بعد بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جمیعتہ علماء ہند کے ارکان نے مخالفت چھوڑ دی۔ حالانکہ میرے جانے سے پہلے ان کے اشتہارات پاکستان کی مخالفت میں نکل رہے تھے۔ کل جس ٹرین سے ہم واپس آئے۔ مسلم لیگ کے رضاکاروں

نے اس کے انجن پر پاکستان کا جھنڈا لگا دیا تھا۔ اس شان سے انجن ڈھاکہ پہنچا۔ ڈھاکہ مسلم لیگ نے پانچ سو گولوں کی سلامی دی۔ جو انجن کی پٹڑی پر رکھے ہوئے تھے۔ انجن سٹیشن پر پہنچا تو تمام شہر گولوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ امید غالب ہے کہ انشاء اللہ سلہٹ پاکستان میں شامل ہوگا۔ اور سرحد پاکستان سے باہر نہ رہے گا۔"

(اندازِ سخن صد ۱۲۲)

حسنِ اعتراف

چونکہ منصوبۂ پاکستان اللہ والوں کی مخلصانہ مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ اسلئے بفضلہ تعالےٰ ہر میدان میں اللہ والوں کی دعاؤں سے مسلم لیگ کو فتح مبین حاصل ہوئی۔ سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم جیت کر مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جس نے ان الفاظ میں ان حضرات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

"صوبہ سرحد و سلہٹ کے استصواب میں ان ہی کی ذاتِ گرامی کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ان ہی کی قربانیوں نے ان دونوں صوبوں کو پاکستان میں شامل کراکر اسے دنیا کی پانچویں بڑی مملکت بنایا ہے۔"

یہ دونوں ایسے مورچے تھے۔ جو علماء ربانی کی قیادت کے بغیر فتح ہونے ناممکن تھے۔ اس تاریخی اور شاندار فتح نے قائدِ اعظم کے مشن کی تکمیل کر دی۔ اور جب ۲۷ رمضان المبارک یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعۃ المبارک جشنِ پاکستان منایا جانے لگا۔ تو ملک کی سب سے بڑی مقتدر ہستی یعنی قائدِ اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے علماء کرام کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو بخشا۔ کراچی میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے تلاوتِ قرآنِ مجید اور مختصر تقریر کے بعد اپنے متبرک

ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا پرچم آزاد فضا میں لہرا کر دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا۔ پاکستانی فوجوں نے پرچم پاکستان کو پہلی سلامی دی۔ اور سب نے مل کر یہ ترانہ گایا کہ :-

اونچا رہے نشان ہمارا

قائدِ اعظم سے پہلا شکوہ

تمام اسلامیانِ ہند کا خیال تھا کہ مجموعی طور پر چونکہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اسلئے سالم صوبہ پنجاب اور سالم صوبہ بنگال پاکستان میں شامل ہوگا۔ لیکن ہندو، وائسرائے ہند کی ملی بھگت سے شروع سے پاکستان کا تیا پانچہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اسلئے اس نے ان دو صوبوں کے اہم اضلاع ان سے خارج کرالئے۔ جبکا مولانا ظفر احمد عثمانی اور شبیر احمد عثمانی کو ازحد رنج تھا۔ چنانچہ اس امر کا شکوہ کرنے کے لئے ہر دو حضرات قائدِ اعظم کے پاس پہنچے۔ وہاں کیا کچھ گفتگو ہوئی۔ اسکی تحریری تفصیل مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنے قلمی راقم الحروف کو یہ لکھی :-

"۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو میں اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قائدِ اعظم کو ان کی کوٹھی پر ملے۔ اس وقت ہم تین تھے اور ایک پرائیویٹ سیکرٹری بطور ترجمان تھا۔ ہم نے قائدِ اعظم سے دو سوال کئے ایک یہ کہ آپ نے جس صورت میں پاکستان منظور کیا ہے۔ یہ اس قرارداد کے خلاف ہے۔ جو اب تک آپ نے ظاہر کی تھی۔ کہ پورا بنگال اور پورا پنجاب پاکستان میں شامل ہوگا۔ اس کی تقسیم در تقسیم سے پاکستان بہت چھوٹا ہوگا جس میں دس کروڑ مسلمانوں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دوسرے آپ نے ڈھائی مہینے کے بعد ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان لینا منظور کر لیا ہے۔ ڈھائی مہینہ میں تو ایک گاؤں بھی تقسیم نہیں ہو سکتا۔ پورا ملک کیسے تقسیم ہوگا۔ ہمیں اندیشہ

ہے کہ ۱۴ر اگست کو آپکے ہاتھ میں صرف پاکستان کا پروانہ ہوگا۔ پاکستان کے حصہ کا سامان وغیرہ کچھ نہ ہوگا۔"

قائدِ اعظم کی وضاحت

قائدِ اعظم نے پہلے سوال کا یہ جواب دیا کہ انگریز اور کانگرس کی زبان پر پاکستان کا نام ہی نہ آتا تھا۔ اب خدا خدا کر کے ہندوؤں کی زبان پر یہ آیا ہے۔ کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کر دی جائے۔ تو پاکستان منظور ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں اس کو منظور نہ کرونگا۔ اور پاکستان نہ بن سکے گا۔ مگر میں نے اسے منظور کر لیا۔ جس پر وہ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اور انکار نہ کر سکے پھر اس صورت میں اچھا ہے کہ ہندو پاکستان میں کم ہوگا۔ تو ہمیں زیادہ پریشانی نہ ہوگی۔ ورنہ مسلمانوں کی معمولی سی اکثریت سے ہمیشہ پریشانی رہتی۔

دوسرے سوال کا یہ جواب دیا کہ لارڈ مونٹ بیٹن بہت جلدی کر رہا ہے برطانیہ ۱۵ر اگست تک ہندوستان کو آزاد کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ اگر ہم نے اس وقت تک پاکستان نہ لیا تو وہ ہندوستان کانگرس کے حوالے کر کے چلتا بنے گا۔ جو ہمارے واسطے مضر ہوگا۔

ہم نے پھر سوال کیا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ جو ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ اور ہماری مساجد وغیرہ کا کیا بنے گا؟ کہنے لگے کہ جو حال پاکستان میں ہندوؤں کا ہوگا۔ وہی ہندوستان میں مسلمانوں کا ہوگا۔ ہم ان کو پریشان نہ کریں گے بلکہ امن و امان سے رکھیں گے۔ نہ یہ مسلمانوں کو تنگ کر سکیں گے۔

ہمارے اس سوال پر کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ ہندو بھی مسلمانوں

سے ایسا ہی سلوک کریں گے۔ کہنے لگے جو ہندو ہمارے ماتحت ہوں گے وہی ان مسلمانوں کی گارنٹی ہوں گے۔ وہ خود اس کے لیے ہندوستانی حکومت کو مجبور کریں گے۔"

(اندازِ سخن صہ ۱۲۳ - صہ ۱۲۴)

دوسرا شکوہ مارچ ۱۹۴۸ء میں جب قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل مشرقی پاکستان گئے۔ تو مولانا ظفر احمد عثمانی کو ان تمام جلسوں میں شرکت کرنی پڑی جن میں قائدِ اعظم نے خطاب کرنا تھا۔ اگرچہ سٹیج پر قائدِ اعظم کے ہمراہ بیٹھنے کی وجہ سے آپ کو تین مرتبہ قائدِ اعظم سے سرسری گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔ مگر مفصل گفتگو دو مرتبہ کی خصوصی ملاقاتوں میں ہوئی۔

پہلی مرتبہ آپ دستور سازی کے مسئلہ پر قائدِ اعظم سے گفتگو کرنے کے لیے ان کی خدمت میں ان کی ڈھاکہ کی قیامگاہ پر اپنے سیکرٹری مولانا دین محمد کے ہمراہ پہنچے۔ خواجہ ناظم الدین اس وقت برآمدہ میں ٹہل رہے تھے۔ اس ملاقات کی تفصیل خود مولانا عثمانی نے اپنی روئیداد ملاقات میں راقم الحروف کو یوں لکھی ہے:۔

"میں نے کہا کہ مجھے سب سے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ پاکستان اسلئے نہیں لیا تھا کہ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان قتل اور لاکھوں مسلمان خانماں برباد ہو جائیں۔ ہم نے اس خطرہ کو دہلی میں پہلے ہی آپ پر ظاہر کر دیا تھا۔ مگر آپ نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مگر جو خطرہ ہم نے ظاہر کیا تھا۔ وہ پیش آکر رہا۔ پھر یہ سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔ آپ نے اسکا کیا انتظام فرمایا؟ پھر اگر پاکستان میں نظام اسلام جاری ہو گیا ہوتا تو ہماری اشک شوئی ہو جاتی اور ہم سمجھتے کہ ان قربانیوں کی تلافی نظامِ اسلام جاری ہونے سے ہو گئی۔ جو بہت بڑی نعمت ہے۔ افسوس

وہ بھی اب تک نہ ہوا۔ تو ہم قوم کو کیا منہ دکھلائیں کہ جس مقصد کیلئے پاکستان بنا تھا۔ وہ بھی حاصل نہ ہوا اور نقصان حد سے زیادہ ہوگیا۔"

جوابِ قائدِ اعظم

قائدِ اعظم نے میرے دونوں سوالوں کا جواب آدھ گھنٹہ میں دیا۔ پہلے سوال کے جواب میں فرمایا کہ مولانا جو خطرہ آپ کو تھا۔ اسکا احساس مجھے بھی تھا۔ مگر میرا یہ خیال تھا کہ پاکستان بننے پر ہندو کچھ ایسی ہی شورش کریں گے۔ جیسی قربانی یا محرم کے موقعہ پر کبھی کبھی کرتے تھے۔ سو میری قوم نے ایسے موقعہ پر کبھی ہندو سے شکست نہیں کھائی۔ ہمیشہ غالب ہی رہی۔ ایسا اس دفعہ بھی ہوگا۔ اس کا مجھے وہم بھی نہ تھا کہ اس قوم کو باؤلا کتا کاٹ جائے گا اور یہ انسانیت سے نکل کر بربریت پر اتر آئے گی۔ کہ عوام فسادیوں کے ساتھ فوج اور پولیس اور سول حکام بھی مسلمانوں کو کچلنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور یہ نالائق مونٹ بیٹن انگریز ہوکر برطانیہ کی روایات کو ایسا پس پشت ڈال دے گا کہ اس خونیں ڈرامہ کا تماشا دیکھتا رہے گا اور ذرا بھی اس کے دل میں انصاف کا جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ اسوقت میرے پاس دو صورتوں کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ ایک یہ کہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے بھارت پر حملہ کر دیتا۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے حصہ کی فوج ابھی تک پاکستان نہ پہنچی تھی۔ وہ ہندوستان سے باہر دور دراز مقامات پر تھی۔ اور ہمارے حصہ کا اسلحہ بھی ہندوستان کے قبضہ میں تھا۔

میں نے کہا وہ تو اب تک بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ ہم کو یہی تو خطرہ تھا۔ کہ اڑھائی مہینہ میں پاکستان لینے کا یہی نتیجہ ہوگا۔ کہ صرف پروانہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ نہ فوج ہوگی۔ نہ اسلحہ!

قائدِ اعظم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ دوسری صورت یہ تھی کہ میں دُوَل سے احتجاج کرتا۔ یہ البتہ میں نے کیا اور میرے احتجاج پر دول کی طرف سے مبصرین آئے اور انہوں نے ہندوستانی حکومت کو ناقابل اور لارڈ مونٹ بیٹن کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ جس کے بعد یہ طوفان ٹھنڈا ہوا۔ پھر قدرت نے ہندوؤں کے ان مظالم کا انتقام دوسری طرف سے لے لیا (جنگ کشمیر کی طرف اشارہ تھا۔ جو اس وقت ہو رہی تھی) وہاں ان پر ایسی کاری ضرب پڑی کہ مدتوں یاد رکھیں گے۔ ان کا جانی اور مالی نقصان بہت ہو چکا ہے۔ اور دیکھئے کب تک ہو گا۔

قائدِ اعظم نے مزید فرمایا کہ ہندوؤں کی سکیم یہ تھی کہ پاکستان نوزائیدہ حکومت ہے۔ اسکی طرف مسلمانوں کی کثیر تعداد کو دھکیل دیا جائے۔ تاکہ وہ اسکی آبادکاری میں اسقدر الجھ جائے کہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکے۔ مگر خدا کا فضل وکرم ہے۔ پاکستان ان مصائب سے گزرتا ہوا مضبوط و مستحکم ہی بنتا چلا گیا۔ اب وہ سمجھ گئے ہیں کہ پاکستان مضبوط سلطنت ہے۔ اسکو ہضم کرنا آسان نہیں۔

باقی رہا۔ نظام اسلام کا مسئلہ تو آپ مطمئن رہیں۔ ذرا مجھے مہاجرین کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ اور اسمبلی کو بھی اطمینان نصیب ہو جائے تو انشاء اللہ بہت جلد دستورِ پاکستان اصولِ اسلام کے موافق مرتب ہو جائیگا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں ایک لارڈ بشپ ہو گا۔ اسکا ترجمہ آپ کیا کریں گے؟ میں نے کہا شیخ الاسلام! کہنے لگے۔ ہاں ایک شیخ الاسلام ہو گا۔ جو حکومت پاکستان کو کنٹرول کرتا رہیگا کہ کوئی دستور اور کوئی قانون خلاف اسلام پاس نہ ہو سکے۔" (تعمیر پاکستان و علماء ربانی ص ۱۷۱ تا ص ۱۷۲)

شکوہ اور جوابِ شکوہ

قائدِ اعظم کے چاٹگام کے دورہ پر جمیعۃ العلما اسلام کے ایک وفد نے قائدِ اعظم سے ملاقات کی جسکے امیر الوفد مولانا ظفر احمد عثمانی تھے۔ آپ نے قائدِ اعظم سے سوال کیا۔

"آپ نے حصولِ پاکستان سے پہلے وعدہ فرمایا تھا کہ دستورِ پاکستان کتاب وسنت کے موافق ہوگا۔ یہ وعدہ جلد پورا کیا جائے۔ کیونکہ ہم نے قوم سے یہی وعدہ کیا تھا اور اب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ وہ اسلامی نظامِ حیات کہاں ہے؟"

قائدِ اعظم نے وفد کو اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا۔

"یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ مَیں نے قوم سے کبھی دھوکا نہیں کیا۔ آپ کی حکومت اسلامی حکومت ہے۔ اس کا دستور اسلام کے اصول پر نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا۔ انشاء اللہ یہ جلد مکمل ہو کر آپ کے سامنے آجائیگا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اسمبلی کے اندر موجود ہیں۔ ان کی رہنمائی میں کام ہو رہا ہے۔ چند ناگہانی مصائب کی وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ اب زیادہ دیر نہ ہوگی"۔ (بحوالہ صدر)

افسوس کہ آپ کے جانشین نشۂ اقتدار میں یہ وعدہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

(۱۸)

حمید نظامی

اخبارات کی اہمیّت انسان پہلے والدین پھر اساتذہ اور مذہبی رہنماؤں سے درسِ زندگی حاصل کرتا تھا۔ اب وہ ان کے علاوہ لٹریچر ریڈیو اور ٹیلیویژن سے بھی رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ مؤخرالذکر تین چیزوں میں سے لٹریچر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اور لٹریچر میں اخبارات زیادہ فوقیت کے حامل ہیں۔ اخبار اس دَور کی بہت بڑی قوت۔ بہت بڑی طاقت۔ بہت بڑا اسلحہ اور بہت بڑا بارود ہیں۔ اخبار ایٹم برائے امن بھی ہیں اور ایٹم برائے جنگ بھی۔ انسانی ذہن کو سنوارنے یا بگاڑنے۔ فضائے امن وامان پیدا کرنے یا خرمنِ امن میں آگ لگانے۔ بساطِ اقتدار بچھانے یا اسکا تختہ الٹانے کی یہ بہت بڑی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اخبار اسی صورت میں ملک وملّت کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر اس جہاں ساز وجہاں سوز سفینہ اور دو دھاری تلوار کا ناخدا ورہنما ایسا مردِ مجاہد ہو۔ جو نیک نیّت ہو۔ پاک طینت ہو۔ بلند سیرت ہو۔ پیکرِ انسانیت ہو۔ صاحبِ بصیرت ہو۔ خادمِ ملّت ہو اور محبِ وطن ہو۔ رہوارِ قلم دوڑاتے وقت اس کے سامنے کوئی ذاتی غرض یا لالچ یا کوئی ذاتی مفاد نہ ہو۔ ہوسِ مال وجاہ نہ ہو۔ کسی کی پگڑی پر نظر نہ ہو۔ کسی کی جیب پر نگاہ نہ ہو اور وہ چڑھتے سورج کا پرستار نہ ہو۔ خود بین نہ ہو۔ خود نما نہ ہو۔ "بازمانہ ساز" نہ ہو بلکہ "بازمانہ ستیز" ہو۔ بفضلہ تعالےٰ یہ تمام صفاتِ حمیدہ، حمید نظامی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

نیا موڑ آپ نے بدوِ فطرت سے علمی ذوق پایا تھا اور آپ کو شروع سے لکھنے کا شوق تھا۔ مدتوں آپ کے طبع زاد افسانے۔ ہلکے پھلکے مضامین اور قلمی خاکے "شیرازہ"، "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں چھپتے رہے۔ بعدازاں آپ نے ادب

کی دلنواز وادی کو خیر باد کہہ کر سیاست کے میدان خارزار میں قدم رکھا۔ ابھی طالبعلمی کی سرحد پار ہی نہ کرنے پائے تھے۔ کہ ۱۹۳۷ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔ دو سال بعد ۱۹۳۹ء میں صدارت پر لات ماردی۔ مگر قائدِاعظم کی نظر فراست اس نوخیز نوجوان کی صلاحیتوں اور جولانیوں کو تاڑ چکی تھی۔ اس لئے انھوں نے آپ کو میدان سیاست سے فرار نہ ہونے دیا۔ ان کے ایما اور احباب کے تقاضوں پر آپ نے دوبارہ ۱۹۴۰ء میں صدارت سنبھال لی۔ صدارت اور خطابت چونکہ لازم و ملزوم ہیں۔ اسلئے صدارت کے ساتھ ساتھ آپ نے میدانِ خطابت میں بھی زور آزمائی شروع کردی۔ آپ نے مباحثوں میں لاہور سے علی گڑھ تک یلغار کی۔ کئی معرکے جیتے۔ اور پندرہ انعامی کپ حاصل کئے۔ ۱۹۴۰ء میں ہی آپ نے ایم۔ اے کیا۔ فکرِ معاش کے سوال نے آپ کو میدانِ صحافت میں دھکیل دیا۔ اور یہیں سے آپ کی زندگی کا نیا موڑ شروع ہوا۔

نوائے وقت

۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو آپ نے ایک چھوٹا سا پندرہ روزہ اخبار "نوائے وقت" جاری کیا۔ جو ۱۵؍ نومبر ۱۹۴۲ء کو ہفت روزہ اور ۲۲؍ جولائی ۱۹۴۴ء کو روز نامہ بن کر آسمانِ صحافت پر جلوہ گر ہوا۔ جسکی وجہ سے آپ بہت جلد عوام و خواص میں محبوب و مقبول بن گئے۔ "نوائے وقت" اور حمید نظامی، صداقت۔ امانت دیانت۔ کے ایک ہی روپ کے دو نام تھے۔ "نوائے وقت" اس مبارک دن یعنی ۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کی پیداوار ہے۔ جس روز کہ ہم پاکستان کو اپنا ملّی نصب العین بنا کر آزادی کی منزل کی طرف رواں دواں ہوئے۔ "نوائے وقت" نامساعد حالات میں۔ ناموافق فضا میں۔ آلام و مصائب کے دور میں۔ مایوسیوں اور ناامیدیوں کے زمانہ میں۔ جبر و استبداد کی آندھیوں اور طوفانوں میں قدم بہ قدم منزل بہ منزل قوم کے سینہ میں امیدوں۔ حوصلوں اور ولولوں کے چراغ جلاتا رہا۔ اور حمید نظامی حصولِ

پاکستان کے لئے فکروعمل کے زاویے درست کرتے رہے۔ پاکستان حاصل کرنے کے لئے تعمیر پاکستان کے لئے ہمہ قسم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ قوم کو محنت و فرض شناسی کا سبق پڑھاتے رہے۔ امتحان و آزمائش کی گھڑیوں میں پورے اترتے رہے اور اقوام عالم کی برادری میں قوم کی عزت بڑھاتے رہے۔ جسکے لئے آپ مستحق صد تحسین و آفرین ہیں۔

قحط الرّجال

دنیا کی اس اسلامی جمہوریہ میں بفضلہ تعالےٰ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ لوح وقلم کے میدان میں۔ علوم وفنون کی منڈی میں۔ صنعت وحرفت کے بازار میں ہر جنس عام تھی اور ارزاں تھیں۔ پاکستان میں اگرچہ مویشیوں کی افزائش میں کچھ فرق آرہا تھا۔ مگر انسانوں کی پیدائش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ انسان جتنے بڑھتے جاتے تھے۔ انسانیت اتنی گھٹتی جاتی تھی اور صورتِ حال یہانتک پہنچ گئی تھی کہ ؎

خدا مل جائے یہ ممکن ہے فطرت
مگر ملتے نہیں بندے خدا کے

اس قحط الرّجال نے حمید نظامی کو نہ صرف مایوس کر دیا تھا بلکہ پریشان کر دیا تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں آپ کی نظر جوہر شناس، اقبال کے مردِ مومن، سیف الاسلام نواب بہادر یار جنگ پر پڑی اور انہیں آپ نے ۱۴ر فروری اور پھر ۲۲ر فروری ۱۹۴۴ء کو دو خط لکھے۔ جن کے جواب سے آپ کی مایوسیوں کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ اس روشنی کے مینار نے آپ کی جن الفاظ میں تسلی کرائی اور ڈھارس بندھائی۔ وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ پہلے خط کے جواب میں انہوں نے حمید نظامی کو لکھا۔

"قاضی عیسیٰ صاحب اور نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کی تائید کو سن کر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ لیگ کے موجودہ تمام لیڈر اسی ملتِ نامسلمان کے قائل ہیں۔ جس کو دعوائے اسلام ہے۔ ہر جماعت کا قائد، بجز ان

بندگانِ حق کے جو انقلاب ذہن و فکر کے لئے پیدا کئے گئے ہوں۔ اپنی ملّت کی ذہنی۔ فکری کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کو اور مجھے اگر ان کی ذہنیت بدلنا ہے۔ تو ملّت کی ذہنیت بدلنی ہوگی۔ یہ اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ ملّت کے عام رجحان کا مقابلہ کرسکیں۔ مَیں قاضی عیسٰی صاحب کے جملہ کو کہ "پاکستان کا نظامِ حکومت اس علاقے کی اکثریت طے کرے گی" بہت غنیمت تصور کرتا ہوں۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ مسلم لیگ کا ہائی کمانڈ طے کریگا۔ پھر تو میرے اور آپ کے لئے مایوس ہونے کی وجہ بھی تھی۔ اب آپ کا اور میرا کام یوں سہل ہوجاتا ہے کہ پاکستان کی اکثریت اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ اِن مسلمان کہلانے والوں کے سامنے قرانی دعوت یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ پیش کریں۔ اور اس کو مسلمان بناکر مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کو بتادیں کہ پاکستان کی اکثریت، نہ اشتراکیت چاہتی ہے۔ نہ فسطائیت، نہ انگریز کی پارلیمانی جمہوریت چاہتی ہے۔ نہ ہندو کی گاندھیت۔ بلکہ وہ اسلام چاہتی ہے اور صرف اسلام! میرے مخلص بھائی!! مَیں مایوس نہیں ہوں اور خدا تجھے بھی مایوس نہ کرے۔ قرآن نے مایوسی کو کفر کہا ہے۔ ہم مایوس نہیں ہوسکتے۔ انشاء اللہ ہمارا اسلام اپنا اثر دکھائے گا۔ اور ہم صبغۃ اللّٰہِ میں ڈوب کر ان سے پوچھیں گے کہ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً کیا ان کا جواب صبغۃ اللہ یعنی اسلام کے سوا کچھ اور ہوسکتا ہے۔

آپ امام کی فکر نہ کیجیے۔ خدا نے ہمیشہ مسلمانوں کے لئے اس وقت امام پیدا کیا ہے۔ جبکہ انتشار اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہو۔ اگر پنجاب نے اقبال کی صورت میں گفتار کا امام پیدا کرلیا۔ تو انشاء اللہ تھوڑے دنوں میں اس

کی گفتار سے نسبت رکھنے والوں میں سے کوئی کردار کا امام بھی پیدا ہو جائے گا۔"

مایوسیوں کا عالم | عین مایوسیوں کے عالم میں حمید نظامی کا رہنمائی کے لئے حسنِ انتخاب کیسا لاجواب تھا۔ اور ان کا جواب کتنا ہمت افزا اور باصواب تھا؟ یہ جواب کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ آپ کے دوسرے خط کا جواب اس سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس وقت ملک وملت جن حالات سے گزر رہی تھی۔ اس سے اس دور کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ نواب صاحب آپ کو لکھتے ہیں:۔

"میں نے آپ کے خط کو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا۔ کیونکہ اس کی نیلی لکیروں کے پیچھے مجھے ایک مخلص نوجوان کے دل کا ارتعاش صاف محسوس ہو رہا تھا۔ میں آپ کی صاف گوئی کا ممنون ہوں۔ جس سے عہدِ حاضر کے نوجوانوں کی نفسی کیفیات سمجھنے کا مجھے کافی موقع ملا ہے۔ یہ سن کر اقبال سے میری عقیدت بڑھ گئی ہے کہ ان کے مطالعہ نے آپ کی بے یقینی کو یقین کے راستے پر ڈال دیا۔ ایمانِ صحیح کی منزل جس سے آپ اپنے آپ کو محروم سمجھتے ہیں۔ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں آنکھوں کے بہاؤ کو قلب کا غسل کہا کرتا ہوں۔ خدا آپ کی اس رقّت کو اور بڑھائے۔ اس سے سخت دل میں وہ نرمی پیدا ہو گی۔ جو نقوشِ ایمانی کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"اگر آپ بھائی کا مشورہ پسند کریں۔ تو اب جب کہ اقبال اور رومی کا آپ مطالعہ کر چکے ہیں۔ قرآن کے قریب ہونے کی کوشش کیجئے..... خواجگان لیگ کی روشِ بندہ پروری سے بیگانگی اور میرانِ کارواں

کا خوئے دلنوازی سے ناآشنا ہونا مسلّم۔ آپ نے جتنی شکایتیں لکھیں۔ میرا تجربہ اس پر بہت زیادہ اضافہ کرسکتا ہے۔ ان کی سیاست قرآن سے دور۔ ان کا عمل اسلام کے سخت مخالف ہے۔ ان سب کے باوجود میرا اور آپ کا فرض کیا ہے؟ اس پر مزید روشنی ڈالے بغیر یہی کہتا ہوں کہ مایوس نہ ہوجیئے۔ اور بڑوں کو چھوڑ کر اپنی ساری توجہ عوام کے اندر اپنے خیالات کو پھیلانے میں صرف کیجیے۔ قائدین و زعمار ہماری جماعتی ذہنیت کا عکس ہوتے ہیں۔ جس دن جماعت میں روح اسلامی پیدا ہوجائے گی۔ وہ اپنے لیے سچے زعیم خود تلاش کرلے گی۔ مجھ سے لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ ہندو اپنے ناقص کو بھی آسمان پر پہنچاتا ہے۔ اور مسلمان اپنے کامل کی بھی ٹانگ کھینچتا ہے۔ میں اس کو مسلمان کا نقص نہیں۔ حسن سمجھتا ہوں۔ ہندو کا ناقص بہرحال اس کی گائے۔ گنگا۔ پیپل اور سنگ ہائے ناتراشیدہ سے اچھا ہے۔ جو اس کے لیے معیارِ کمال ہے۔ اور مسلمان کا کامل بھی مسلمان کے معیارِ کمال پر یعنی قرنِ اول کی قیادت پر پورا نہیں اترتا۔ انشاء اللہ آپ جیسے نوجوانوں کا دردِ دل اور اخلاص و صداقت اور جذبۂ عمل مستقبل کی تاریکیوں میں شاہد امید کو جلوہ نما کریگا۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ اور آپ کو مایوس دیکھنا نہیں چاہتا۔"

اس کوزہ میں حقائق و معارف اور عبر و بصیرت کے اتنے دریا بند ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ان جوابات سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حمید نظامی کا دل ملت اسلامیہ کے درد سے کتنا معمور تھا۔ اور اس کے کتنے مفید نتائج مرتب ہوئے۔

حمید نظامی کا عنداللہ بڑا مقام تھا۔ اسی لئے آپ کو سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی توفیق عطا فرمائی گئی۔ اور آپ کی زبان و قلم میں وہ اثر و تاثیر رکھدی گئی کہ غلط کار و غلط کوشش ارباب اختیار و اقتدار ان کی ضربِ کلیمی کی تاب نہ لاسکتے تھے۔ ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر وزیر و سفیر۔ رہنما و رہبر۔ ادیب و شاعر۔ صحافی و فنکار۔ موسیقار و صنعتکار۔ عہدیدار اور زمیندار۔ زردار اور نادار مل جاتے ہیں۔ مگر ایسے انسان شاذ ہی ملتے ہیں۔ جو انس و محبت۔ انسانیت و آدمیت۔ شرافت و نجابت کے پیکر ہوں۔ حمید نظامی کا تعلق اسی جنسِ نایاب سے تھا۔

عادات و معمولات

حمید نظامی بڑے صاحبِ ذوق تھے۔ منکسر المزاج تھے۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے۔ خوش طبع۔ خوش اخلاق۔ خوش اطوار اور خوش گفتار تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ پان کھاتے۔ نہ سگریٹ پیتے۔ نہ فضول خرچی کرتے۔ سادہ کھانا۔ سادہ پہننا۔ سادہ رہنا ان کا شعار تھا۔ وقت کے بڑے پابند تھے۔ وقت پر اٹھنا۔ وقت پر سونا۔ وقت پر لکھنا۔ وقت پر پڑھنا اور وقت پر چلنا آپ کا معمول تھا۔ آپ رحما بینھم و اشد علی الکفار کی زندہ تفسیر تھے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن۔ مگر آپؐ کی دشمنی اور دوستی اپنے لئے نہ ہوتی تھی۔ خدا کے لئے، خدا کے رسولؐ کے لئے، رسولؐ کی امت کے لئے، اسلام کی سربلندی کے لئے اور پاکستان کی سالمیت کے لئے ہوتی تھی۔ آپ دوستی لگانے اور دشمنی نبھانے میں اپنے اور بیگانوں میں کوئی امتیاز نہ کرتے تھے۔ نہ منافقت سے کام لیتے تھے۔ اور نہ کسی کے لئے اپنے اصولوں کو قربان کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دل کو قوم کا دل۔ آپ کے دماغ کو قوم کا دماغ اور آپ کی آواز قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ آپ نے پاکستان کی پاسبانی و ترجمانی کا فرض خوبی سے ادا کیا۔ جو خود اسکے پاسبان و ترجمان بھی ادا نہ کرسکے۔

آزادی کا مینار

حمید نظامی حکام پرست نہ تھے۔ نہ حکام رس تھے۔ مگر حکام ترس ضرور تھے۔ اسی لئے آپ ان میں خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کرنے اور انہیں آخرت کے محاسبہ و مواخذہ سے بچانے کے لئے ہمیشہ انہیں نیک اور صحیح مشورہ دیتے۔ غلط بخشیوں پر ٹوکتے۔ غلط کاریوں پر روکتے۔ نیک دل حکام کی عزت کرتے۔ تنگ مزاج افسر آپ سے نفرت کرتے۔ غلط کار اربابِ اقتدار آپ سے خوفزدہ رہتے۔ حق کی اس آواز کو دبانے کے لئے رجعت پسندوں۔ "ترقی پسندوں" ثقافت زدوں۔ اقتدار پرستوں۔ اغراض پرستوں اور مفاد پرستوں نے ایک مشترکہ محاذ بنالیا تھا۔ سب کے سب، اپنی ساری قوتوں۔ ساری کوششوں، ساری کاوشوں اور ساری سازشوں کے ذریعے آپ کے درپے آزار رہے۔ مگر چونکہ حمید نظامی کی نیت نیک تھی۔ مقصد نیک تھا۔ اسلئے کوئی آپ کی آواز کو دبا نہ سکا۔ مگر جنھوں نے آپ کی آواز کو دبانے کی کوشش کی۔ ایبڈو نے انہیں گوشۂ تنہائی میں دبا دیا۔ جو حق کی آواز یعنی نوائے وقت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود ختم ہو گئے۔ جو آپ کو اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتے تھے۔ وہ خود اپنے منصب سے ہٹا دیئے گئے۔

آزادی کے اس مینار کو گرانے کے لئے، صداقت کے اس چراغ کو بجھانے کے لئے۔ بہادروں کی طرح نہیں، بزدلوں کی طرح، شریفوں کی طرح نہیں، کمینوں کی طرح ریشہ دوانیاں جاری رکھی گئیں۔ سب سے پہلے حمید نظامی کو خاموش کرنے کے لئے، آجکل کے رواجِ عام کے مطابق آپ پر اسلحہ ناجائز رکھنے کا ایک جھوٹا مقدمہ بنایا گیا۔ جب اس سے مخالفین کی مطلب براری نہ ہوئی۔ تو "نوائے وقت" سے ضمانت طلب کرلی گئی۔ جب یہ حربہ بھی ناکام رہا تو "نوائے وقت" چھاپنے والوں کو ورغلایا گیا۔ اور انہوں نے اخبار چھاپنے سے انکار کردیا۔ پھر اخبار کے عملہ کو اغوا کرلیا گیا۔ کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ مگر ان ذلیل حربوں کے باوجود حمید نظامی حق کی

بانسری بجاتے رہے۔ اس پر اس کی شاہ رگ کاٹنے کے لئے سرکاری اشتہارات بند کر دیئے گئے۔ مگر پھر بھی حمید نظامی جیتے رہے اور "نوائے وقت" چلتا رہا۔ حمید نظامی کے دوست احباب کو ہراساں و پریشان کر کے آپ سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ تاکہ آپ بے دست وپا ہو جائیں۔ مگر وہ حمید نظامی کے خدا کو اس سے الگ نہ کر سکے۔ اسی لئے آپ تنہائی میں بھی انجمن بنے رہے۔ جب حمید نظامی پر کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو آپ کو صراطِ سرکار پر لانے کے لئے، آپ کا اخبار بند کرنا شروع کر دیا۔ "نوائے وقت" کو ایک دفعہ بند کیا۔ دوسری مرتبہ بند کیا۔ تیسری بار بند کیا۔ ایک دو۔ تین کرنے کے باوجود خبب ڈھاک کے وہی تین پات رہے تو پھر ایک نئی چال چلی گئی۔ اور "نوائے وقت" کا ڈیکلیریشن منسوخ کر کے ایک "یار وفادار" کو الاٹ کر دیا۔ تاکہ وہ ہز ماسٹرز وائس کا فریضہ ادا کر سکے۔ مگر وہ بے چارہ خود "نوائے وقت" بن گیا۔ اس سے یہ لوہے کا چنا نہ چبایا جا سکا۔ اور اس نے عطائے تو بلقائے تو کے مصداق یہ ڈیکلریشن واپس کر دیا۔ آخر بعد از خرابی بسیار ہمارے بڑے وزیر باتدبیر کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور انہوں نے یہ ڈیکلریشن حمید نظامی کو واپس کر دیا۔ یہی حربے اب "زندگی" اور اسکی "ذریات" پر آزمائے گئے۔ غرض کہ اربابِ اقتدار و اختیار نے، اربابِ جاہ وحشم نے حمید نظامی کی ذات پر حمید نظامی کے دل و دماغ پر۔ حمید نظامی کے لوح و قلم پر پہرے بٹھائے اور قبضہ کرنے کے جتنے جتن ممکن تھے۔ وہ سب آزمائے۔ــــ مگر وہ سب کے سب بے اثر ثابت ہوئے اور یہ مردِ مومن ہر امتحان میں پورا اترا۔

حسنِ عمل اس خود غرض دور میں، اس خود فروش دور میں۔ حمید نظامی کو خریدنے کے لئے بڑی سے بڑی بولی دی گئی۔ بڑے سے بڑے اعزاز پیش کئے گئے۔ بڑے سے بڑے ہمرنگ زمین دام بچھائے گئے۔ مگر آپ کے پائے استقلال

کو بڑی سے بڑی پیشکش بھی نہ ہلا سکی۔ آپ چٹان کی طرح نہیں۔ ہمالیہ کی طرح اپنی جگہ پر جمے رہے۔ اس اقتدار پرست دَور میں۔ اس خود غرض زمانہ میں جہاں بڑے بڑے بک گئے۔ بڑے بڑے جھک گئے۔ بڑے بڑے بھٹک گئے۔ وہاں حمید نظامی نہ کسی قیمت پر بکے۔ نہ اپنے مسلک سے ہٹے۔ نہ راہِ راست سے بھٹکے۔ نہ اپنی روش سے بدلے۔ نہ اپنے معیار سے گرے۔ بلکہ اخیر وقت تک وزن میں تولہ۔ ماشہ۔ رتی اور چاول تک پورے اترے۔ کلمۂ حق سناتے رہے۔ اور جبر و استبداد کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ جو آپ کی زندگی کا مقصدِ وحید تھا۔ اور جس کی وجہ سے قائدِ اعظم کو آپ کی ذات پر بڑا فخر تھا۔ اور انکی آپ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

حرکت کی برکت

حمید نظامی کے خلوص و ایمان۔ حریتِ فکر۔ جذبۂ عمل۔ مقصودِ زندگی اور نظریۂ حیات کے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے وہ آمر نہ تھے۔ مگر آمروں سے زیادہ قدر و قیمت رکھتے تھے۔ وہ وزیر نہ تھے۔ مگر اپنی تحریروں میں وزیروں کی تقریروں سے زیادہ قوت و طاقت رکھتے تھے۔ وہ صاحبِ اختیار و اقتدار نہ تھے۔ مگر عوام و خواص میں ان سے زیادہ محبوب و مقبول تھے۔ وہ صاحبِ جاہ و حشم نہ تھے۔ مگر اربابِ جاہ و حشم سے زیادہ عزت و عظمت رکھتے تھے۔ جسطرح مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کے نعرۂ حریت سے بکنگھم پیلس ڈاؤننگ سٹریٹ۔ اور وائسرائیگل لاج میں زلزلہ آجاتا تھا اسی طرح اس حق پرست۔ اس حق گو۔ اس حق طلب اور اس حق جو مجاہد کے نعرۂ حق سے ایوانِ اقتدار کانپ اٹھتا تھا۔ یہ اس نڈر اور بیباک قلمکار کے قلم کی حرکت کی برکت تھی کہ مایوسیوں۔ ناامیدیوں اور تاریکیوں کے بادل چھٹنے لگے۔ فکری ابتری۔ ذہنی انتشار اور قلبی پریشانی دور ہونے لگی۔ زندگی کا جمود و سکوت، عزم و عمل میں بدلنے لگا۔ مردہ دل اور مفلوج دماغ، روح پرور تر و تازگی محسوس کرنے لگے۔ سسکتی ہوئی، دم توڑتی ہوئی جمہوریت آنکھ کھولنے لگی اور اس کی جان

میں جان آنے لگی۔ مگر چونکہ جمہوریت کی حیات، آمریت کی موت تھی۔ اسلئے اس نے ایک دم جمہوریت کے خاکہ اور ڈھانچہ کو بدل دیا۔ جمہوریت کی قدریں بدلنے کے ساتھ ساتھ پریس ایکٹ بھی بدل دیا۔ تاکہ پھر کوئی اس مردہ جمہوریت کو زندگی کا ٹیکہ لگانے کی کوشش نہ کرے۔ صرف اسی پر بس نہ کی گئی۔ "نوائے وقت" کو نیچا دکھانے کیلئے ملک کے بڑے بڑے اخبار بھی خرید لئے گئے۔ تاکہ وہ سب مل کر "جدید جمہوریت" کے گن گائیں تاکہ لوگ قدیم جمہوریت کو بھول جائیں۔ مگر ساری خدائی ایک طرف "نوائے وقت" ایک طرف رہتے ہوئے بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور بالآخر جدید جمہوریت کا بھی قصرِ اقتدار سے لوگوں نے جنازہ نکلتا دیکھ لیا۔

معیار اور اقدار

یہ حمید نظامی کی دیانت و امانت کا کمال تھا کہ انہوں نے اس جاہ طلب دَور میں۔ اس بے ضمیر دَور میں۔ اس صداقت گریز دَور میں اپنے دامن کو ہر قسم کی آلودگیوں سے بچائے رکھا۔ دریا میں رہے۔ مگر آپ نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ اور انہیں آخیر وقت تک خشک ہی رہنے دیا۔ صحافت کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد آپ نے ہمیشہ جوش کی بجائے، ہوش سے کام لیا۔ صحافت کی اس خود شناز و خود نما دنیا میں آپ نے کبھی عوام کے جذبات سے کھیلنے، کسی کو نیچا دکھانے، کسی کو نقصان پہنچانے اور کسی کا آلہ کار بننے کی کوشش نہ کی۔ آپ کی ہر تحریر نہایت سادہ۔ مدلّل۔ مؤثر اور دلنشین ہوتی اور اس میں صحافیانہ ادیبانہ۔ خطیبانہ لفاظی نام کو بھی نہ ہوتی۔ آپ نے قلم کی عصمت کو۔ صحافت کی عظمت کو ماں اور بہن کی عصمت و عظمت کی طرح مقدس جانا۔ اور زندگی بھر اس کی حفاظت کی۔ آپ نے زندگی کے کسی موڑ پر۔ کسی بھی مرحلہ پر۔ کسی بھی حالت میں اور کسی بھی مقدار میں جھوٹ سے کام لینے یا خوشامد سے کام نکلوانے کی کوشش نہ کی۔ ہمیشہ۔ صداقت اور شرافت سے کام لیا۔ جو لکھا سچ لکھا۔ جو کہا سچ کہا۔ صحافت کا جو اعلیٰ اقدار اور

جو اعلیٰ معیار مولانا ابوالکلام آزاد ۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے قائم کیا۔ اسے نہ صرف قائم رکھا بلکہ بہت حد تک اسے آگے بڑھایا۔

بے غرض انسان

حمید نظامی نے جو عزت و عظمت، وقعت و شہرت حاصل کی۔ وہ خاندانی تفوق ۔ آبائی جاگیر۔ سرکاری اعزاز یا اخباری پروپاگنڈا کا نتیجہ نہ تھی ۔ جہاں بڑے بڑے مدیر شہیر اپنے نام کے ساتھ مقالہ افتتاحیہ چھپواتے رہے ۔ وہاں نوائے وقت کی ساری زندگی میں حمید نظامی کا نام کسی ضمن میں بھی منظرِ عام پر نہ آیا۔ یہاں تک کہ آپ نے امریکہ یورپ اور دنیا کے دوسرے خطوں کی سیر کی۔ آپ کے سفر نامے ۔ بیرونی دنیا کے مشاہدات و تاثرات نوائے وقت میں چھپتے رہے۔ مگر ان کے ساتھ آپ کا نام کبھی نہ چھپا ۔ دفتر سے تصدیق پر پتہ چلتا تھا کہ یہ آپ کی تحریر ہے ۔ جہاں قوم میں نمود و نمائش کا تپدق اور شہرت و ریا کا سرطان عام ہو چکا تھا۔ وہاں اس کے اثر سے اگر کوئی ذاتِ شریف بچی ہوئی تھی ۔ تو بلا خوفِ تردید وہ حمید نظامی کی ذاتِ گرامی تھی ۔ جو شہرت ۔ نمائش اور پبلسٹی کے بہترین وسائل رکھنے کے باوجود ان کو اپنی ذات کے لئے استعمال کرنا گناہ سمجھتے تھے ۔ کیونکہ آپ اس بات پر یقین و ایمان رکھتے تھے کہ ریا نیکیوں کو اسی طرح کھا جاتا ہے ۔ جسطرح آگ سوکھی لکڑیوں کو! اسلئے آپ اس سے ہمیشہ بچتے رہے ۔ جو آپ کی سب سے بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سعادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

پاکستان کا پاسبان

حمید نظامی کو صرف پاکستان کی جنگ ہی نہ لڑنی پڑی۔ پاکستان کی پاسبانی بھی کرنی پڑی۔ ایک طرف تو پاکستان پر وہ طبقہ مسلط ہو گیا۔ جو پاکستان کا دل سے مخالف تھا۔ جو انگریز کا ساختہ پرداختہ تھا۔ جو انگریزی فکر و نظر کا مالک تھا۔ جو انگریزی اقدار و

کردار کا دلدادہ تھا۔ جو انگریزی زبان و لباس کا شیدائی تھا۔ جو مفت میں ہاتھ آئے ہوئے اقتدار کی بقا کے لئے ازراہِ منافقت گلے پھاڑ پھاڑ کر اسلام کے نعرے لگاتا تھا۔ مگر دلی طور پر اسلام پر ایمان نہ رکھتا تھا۔ اسی لئے اسلام کے قریب نہ جاتا تھا۔ وہ عوام کو دھوکا دینے کے لئے مذہبی تعلیم کی اہمیت وافادیت پر زور دیتا تھا۔ مگر خود مذہب کی صداقت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسی لئے ملک میں کتاب وسنت کے احیار کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانے میں آئیں بائیں شائیں کرتا رہتا تھا۔ اور اسلام کو پاکستان کے اندر دفن کرنے کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار تھی۔ ان کی تعریف حمید نظامی نے اپنے یکم مارچ ۱۹۵۷ء کے شذرہ میں ان الفاظ میں کی تھی:۔

"مغربی پاکستان کی (ری پبلکن) وزارت میں بعض انتہائی نالائق انتہائی بدنام اور انتہائی بددیانت وزیر شامل ہیں۔ ان میں سے بعض کی جگہ ہماری رائے میں سیکرٹریٹ میں نہیں۔ جیل خانے میں ہے"۔

اتنی جرأت اتنی بیباکی پنجاب کی صحافت کی تاریخ میں آج تک کسی نے نہیں دکھائی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے حمید نظامی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے پاکستان کو اس ناپاک عنصر سے پاک کرنے کے لئے ۷؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا۔ مگر فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو جیل میں بھیجنے کی بجائے گھروں میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اور بعض خود بوریا بستر سمیٹ کر اپنی اپنی دکانیں بند کر کے سیاست کی منڈی سے چلتے بنے۔

مارشل لاء نے جہاں بڑوں بڑوں کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔ وہاں حمید نظامی کے قلم میں رعنائی آگئی تھی۔ وہ برابر کھری کھری سنا کر ملک وملت کی صحیح رہنمائی کرتے رہے۔ چونکہ صدر مملکت آپ کے اخلاص کے معترف تھے۔ اسلئے وہ نہایت

اسلئے وہ اس سے کڑھتے ہیں"۔

اصولِ زندگی اخباری تقاضوں سے ہٹ کر آپ کے ذاتی رکھ رکھاؤ بھی اصولی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ بڑی منضبط زندگی بسر کرتے تھے ہفتہ میں دو بار سینما دیکھتے۔ دن ڈھلے ہوٹل میں پہنچ جاتے۔ پہلے میٹرو ریسٹورنٹ (جہاں اب واپڈا ہاؤس بن چکا ہے) اسکے بند ہونے پر کسینو ریسٹورنٹ (موجودہ لارڈز) میں بیٹھتے۔ اسکے بند ہونے پر گارڈینیا ریسٹورنٹ (موجودہ سلاطین میں بیٹھا کرتے۔ اور اپنے دوستوں سے گپ شپ کر کے گھر چلے جاتے۔ دوستوں سے صرف دوستی کی بات اور بیوی سے صرف گھریلو مسائل تک گفتگو رہتی اور کسی قیمت پر اپنے مصائب و آلام سے دوست تو دوست اپنی اہلیہ محترمہ تک کو شریک نہ کرتے۔ پیش آمدہ مسائل کو مسائل کی حد تک محدود رکھتے اور جو وقت ان کو نپٹانے کا ہوتا۔ اسی وقت ان سے دوچار ہوتے اور کسی پتہ نہ لگنے دیتے کہ آپ پر کیا بیت رہی ہے۔ اسلئے آپ آنکھوں پر ٹھنڈا چشمہ لگائے رکھتے۔ چہرے کے تاثرات کو کتاب کی طرح مجلد رکھتے تاکہ ان سے کوئی کسی قسم کا تاثر نہ لے سکے۔ اور نہ یہ آپ کی اندرونی کیفیات کی غمازی کر آپ کی خوشامد یا بدگوئی نہ کرتے تھے۔ اپنے کسی مضمون کی اپنے بارے میں تعریف سننا پسند نہ کرتے تھے۔ جسے اچھا نہ سمجھتے۔ اس سے ملنا بھی گوارا نہ کرتے۔

جب تک نوائے وقت ہفتہ وار چھپتا رہا۔ حمید نظامی اس کے اندر کے صفحات میں ایک مستقل عنوان "جاتی کیا سوچتی ہے" کے تحت ہندو اخبارات کی تحریروں اور ہندو لیڈروں کی تقریروں کے ایسے اقتباسات درج کرتے رہتے تھے۔ جن سے ان کے اسلام دشمن عزائم کا پتہ چلتا تھا۔ پنجاب کے اخبارات، شہباز۔ انقلاب۔ زمیندار احسان اور نوائے وقت میں سے صرف نوائے وقت اتحاد پارٹی کا مخالف اور آل انڈیا مسلم لیگ کا ترجمان اور عکاس رہا۔ اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے خلاف مسلم لیگ نے جو

خندہ پیشانی کے ساتھ آپ کی تلخ نوائی کو برداشت کرتے رہے۔ البتہ خانیوال اسٹیشن سے گزرتے ہوئے ایک مرتبہ نوائے وقت کے رپورٹر شیخ ریاض پرویز سے نہایت شگفتہ انداز میں اسکا شکوہ ضرور کیا۔ غرض کہ اس مردِ مجاہد نے پاکستان کی پاسبانی کے فرائض عین اس زمانہ میں ادا کیے۔ جس زمانہ میں پاکستان کے نام نہاد پاسبان، اپنے مفاد۔ اپنی اغراض اور اپنے اقتدار کی پاسبانی کر رہے تھے۔

آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ:۔

"انگریزی کی برتری نے انگریزی خوانوں کو اردو اخبارات سے بے تعلق کر رکھا تھا اور مشرقی مزاج کے معدودے چند انگریزی خواں بھی اردو اخبار محض اداریوں کی خاطر پڑھتے تھے۔ "نوائے وقت" پہلا روز نامہ ہے۔ جو پاکستانی انگریزوں میں بھی خوف یا شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست میں اسکا وجود ناگزیر ہوگیا ہے۔ اس کے حامی یا مخالف گالی دینے یا تعریف کرنے کے لئے اس کو ضرور پڑھتے ہیں۔ اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ سیاسیات میں مسائل تخلیق کر سکتا ہے اور بسا اوقات ایسے موضوع پیدا کر لیتا ہے۔ جن پر نقد و نظر اور تنقید و تنقیص کی عام بحث شروع ہو جاتی ہے۔ جس سے ایک خاص ذہن مترشح ہوتا ہے۔ اور پاکستان میں اس ذہن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

جہاں تک اسکے سیاسی خیالات کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے افق سے طلوع ہوا ہے۔ اس میں اور اس سے خائف امرا میں خیالات کا کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں۔ جو ٹکراؤ ہے۔ وہ طبائع اور طبقات میں ہے۔ اسی لئے اربابِ اختیار کی انا اس سے بدکتی ہے

سول نافرمانی شروع کی۔ اس میں حمید نظامی کا "نوائے وقت" پیش پیش تھا۔ ۹ مارچ ۱۹۴۷ء کو جب ملک خضر حیات ٹوانہ کے غیر مسلموں کے ساتھ ملکر وزارت بنانے کے خلاف، ہندوستان کی تاریخ میں پہلا یوم غدارانِ اسلام منایا گیا۔ اس کے پرامن جلوس میں ہندوؤں کی خشت باری سے ایک مسلمان نوجوان عبدالمالک شہید ہوا۔ جس کی خبر شائع کرنے کی آڑ میں آپ کے اخبار سے ضمانت طلب کر لی گئی۔ جو خلاف توقع فی الفور داخل کر کے نوائے وقت دشمنانِ اسلام کے سینوں پر برابر مونگ دلتا رہا اور اب تک ان کی خبر لے رہا ہے جو پاکستان کو، پاکستان بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

یادگار کارنامہ حمید نظامی کا غیر فانی کارنامہ ۱۹۳۷ء میں پنجاب کے مسلم طلبار کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اس سے قبل پنجاب سٹوڈنٹس یونین پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ یہ یونین طلبار کے اندر ہندو مہاسبھا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کالجوں کے اندر کام کرتی تھی۔ اس کے نزدیک سچا قوم پرست وہی تھا۔ جو ہندو اکثریت کے اشارۂ چشم و ابرو پر رقص کرنا جانتا ہو۔ اور ہندو لیڈروں کے ہر قول پر آمنّا و صدقنا کہنے کا عادی ہو۔ اور اسے بمنزلہ الہام یا آکاش بانی سمجھے۔ اپنی تہذیب۔ اپنے تمدّن۔ اپنی ثقافت اور اپنی زبان کو وطنیت کی بھینٹ چڑھا دے اور ہندو رہنماؤں کو منزہ عن الخطا اور دیوتا تصور کرے۔

حمید نظامی نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بنا کر وطنیت کے اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ جس کی مسلمانوں سے پرستش کرائی جاتی تھی۔ اور اس فیڈریشن کے منشور میں شمال مغربی ہند میں ایک آزاد اور خود مختار مسلم نیشنل سٹیٹ کے قیام کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اسطرح ۱۹۳۷ء میں آپ کی سرکردگی میں سب سے پہلے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے من حیث الجماعت ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ جبکہ مسلم لیگ

کی طرف سے ۱۹۴۰ء میں یہ مطالبہ کیا گیا۔ اس کی نمائندہ حیثیت کے بارہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان کے دل و دماغ میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اسلئے انہوں نے فیڈریشن کے معاملہ میں کچھ غیر سنجیدہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔

۱۹۴۳ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے انتخابات درپیش تھے۔ تو پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب افتخار حسین ممدوٹ نے مسلم طلبار کی گرانقدر خدمات کی بنار پران کو بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں حق نمائندگی بخشا۔ جس کی بنار پر حمید نظامی کی زیرِ سرکردگی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمائندے بھی شریکِ اجلاس ہوئے۔ جن میں مسٹر یحییٰ بختیار (موجودہ اٹارنی جنرل پاکستان) شیخ حامد محمود۔ سید قاسم محمود رضوی۔ راجہ افتخار اللہ۔ ڈاکٹر ضیاء الاسلام انصاری و الیاس مسعود ہومیوپیتھ۔ غلام احمد اور امین ترین وغیرہ شامل تھے۔ کونسل کے اجلاس کی صدارت خود قائدِ اعظم کر رہے تھے۔ پہلے وہ صدر چنے گئے۔ سیکرٹری جنرل کے لئے نوابزادہ لیاقت علی خان کا نام پیش ہوا تو پنجاب کے طلبار کے قائد حمید نظامی نے اٹھ کر اس کی سخت مخالفت کی اور آدھ گھنٹہ کی تقریر میں اپنے اس مؤقف کو وزنی دلائل سے ثابت کیا کہ نوابزادہ موصوف کو جنرل سیکرٹری نہ بنایا جائے۔ قائدِ اعظم نے اپنے اس "شعلہ نوا مقرر" کی تقریر بڑی حیرت سے سنی۔ جس پر لیگ کونسل کے دیگر ارکان بھی انگشت بدنداں رہے۔ مگر حمید نظامی اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ قائدِ اعظم نے بڑی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ کر حمید نظامی کو ٹھنڈا کیا کہ :-

I ask you, my dear youngman, to give him one more year, so that he can improve himself. I appeal to you to give him one more chance for my sake.

If during this period he fails to come up to your expectation, then I promise you, I shall kick him out." (Pakistan Digest, August, 1975)

قائدِ اعظم کی اس پر زور اپیل پر نوابزادہ لیاقت علی خان آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بنے۔ اور جب برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دوران حمید نظامی سے مذکورہ بالا مخالفت کا پورا پورا بدلہ لیا۔ جسے اس مردِ مومن نے بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

اس کے علاوہ خود مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اندر ایسا تخریبی عنصر داخل اور پیدا کر دیا گیا۔ جسکی ناقابلِ برداشت حرکات کی وجہ سے حمید نظامی نے فیڈریشن کی صدارت سے استعفیٰ دیدیا۔ اور اسکی نسبت قائدِ اعظم کو مطلع کر دیا۔ قائدِ اعظم اپنے محبوب حمید نظامی کی خوددار طبیعت اور آپکی اعلیٰ صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اسلئے آپنے حمید نظامی کو لکھا۔

"صدارت کے عہدہ سے مستعفی ہونا ابھی ٹھیک نہیں۔ تمہارے مخالفین تو چاہتے ہیں کہ تم کوئی ایسا قدم اٹھاؤ۔ جس سے وہ تم سے چھٹکارا حاصل کرکے فیڈریشن کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر سکیں۔ اگر تم نے صدارت سے استعفیٰ دیدیا۔ تو ان کا مقصد حل ہو جائے گا۔ ان حالات میں حکمت۔ صبر اور تدبر کا تقاضا ہے کہ اپنے عہدہ پر قائم رہو۔ اپنا مورچہ دوسروں کے حوالے نہ کرو۔ اور مشکلات کے باوجود پامردی سے حالات کا مقابلہ کرو۔" (نشان منزل صہ ۹)

چنانچہ آپ نے اپنے قائد کے فرمان کو سرآنکھوں پر رکھا۔ اور صدارت سے مستعفی نہ ہوتے۔ اس طرح آپ نے وفاداری اور اطاعت گزاری کا ریکارڈ قائم کیا۔

ماخذات

۱۔ تاریخ فرشتہ	غلام حسین طباطبائی
۲۔ شاہ ولی اللہؒ	مولانا مناظر احسن گیلانی
۳۔ حیات نواب بہادر یار جنگ	غلام محمد عثمانیہ
۴۔ تاریخ اقوام عالم	آغا مرتضیٰ احمد خان
۵۔ صحافت پاک و ہند میں	ڈاکٹر خورشید عبدالسلام
۶۔ قائدِ اعظم میری نظر میں	ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی
۷۔ نقوش و تاثرات	مولانا عبدالماجد دریا بادی
۸۔ علی گڑھ کے تین نامور فرزند	ڈاکٹر نسیم سوہدری علیگ
۹۔ عظمتِ رفتہ	ضیاء الدین احمد برنی
۱۰۔ سوانح احمدی	مولانا محمد جعفر تھانیسری
۱۱۔ جدوجہد آزادی اور مولانا اشرف علی تھانوی	پروفیسر احمد سعید
۱۲۔ الافاضات الیومیہ	مولانا اشرف علی تھانوی
۱۳۔ جماعتِ مجاہدین	مولانا غلام رسول مہر
۱۴۔ تجدید احیاء دین	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
۱۵۔ تحریک شیخ الہند	مولانا سیّد محمد میاںؒ
۱۶۔ حرفِ اقبال	ایم حمید اللہ خان
۱۷۔ تقویۃ الایمان	شاہ اسماعیل شہیدؒ
۱۸۔ اندرونِ ہند	خالدہ ادیب خانم

۱۹ -	پاکستان	چوہدری رحمت علی
۲۰ -	اب ور نہ کبھی نہیں ۔	
۲۱ -	اندازِ سخن	منشی عبدالرحمٰن خاں
۲۲ -	ضمیمہ تنظیم المسلمین	مولانا اشرف علی تھانوی
۲۳ -	حیات محمد علی جناح	رئیس احمد جعفری
۲۴ -	تعمیرِ پاکستان وعلماء ربانی	منشی عبدالرحمٰن خان
۲۵ -	تجلیات عثمانی	پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی
۲۶ -	حیات شیخ الاسلام مولانا شبیر علی	فیض انبالوی و شفیق صدیقی
۲۷ -	سوانح قاسمی	مولانا قاری محمد طیب
۲۸ -	سیرتِ اشرف	منشی عبدالرحمٰن خان
۲۹ -	بے تیغ سپاہی	نواب صدیق علی خان
۳۰ -	عہد لارڈ مونٹ بیٹن	مسٹر ایلن کیمبل جانسن
۳۱ -	میموریز	دیوان چمن لال بار ایٹ لاء
۳۲ -	آزادیٔ ہند	مولانا ابوالکلام آزاد
۳۳ -	جناح	مسٹر بولیتھو
۳۴ -	مشاہدات وواردات	منشی عبدالرحمٰن خان
۳۵ -	نقوشِ قائدِاعظم	پروفیسر رحیم بخش شاہین
۳۶ -	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	مسعود عالم ندوی
۳۷ -	تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد
۳۸ -	ہمارے ہندوستانی مسلمان	سر ولیم ہنٹر
۳۹ -	تاریخ پاکستان	احسان الحق ۔ محمد سعید

۴۰۔ سیّد احمد شہید — مولانا غلام رسول مہر
۴۱۔ ہندوستان میں پانچ سال — جنرل فین
۴۲۔ عمدۃ التواریخ — سوہن لعل
۴۳۔ تفہیماتِ الٰہیہ — شاہ ولی اللہ رح
۴۴۔ سرگزشت مجاہدین — مولانا غلام رسول مہر
۴۵۔ تحریکِ پاکستان — شمیم احمد
۴۶۔ حیات قائدِ اعظم — چوہدری سردار محمد خان
۴۷۔ یادگارِ حالیؔ — صالحہ عابد حسین
۴۸۔ جامع المجددین — مولانا عبدالباری ندوی
۴۹۔ ملفوظات اشرفیہ — مولانا اشرف علی تھانوی
۵۰۔ الافاضات الیومیہ — ‏
۵۱۔ اسعد الابرار — مولانا ابرار الحق
۵۲۔ مسلمانوں کے سیاسی افکار — پروفیسر رشید احمد
۵۳۔ احمد شاہ ابدالی — ابدالی کمیٹی ملتان
۵۴۔ اشرف السوانح — خواجہ عزیز الحسن
۵۵۔ یادِ رفتگان — سید سلیمان ندوی
۵۶۔ میرے چند ہم عصر — ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۵۷۔ مسدسِ حالیؔ — مولانا الطاف حسین حالیؔ
۵۸۔ مقالاتِ حالیؔ۔ جلد دوم — ‏
۵۹۔ موجِ کوثر — ڈاکٹر شیخ محمد اکرام
۶۰۔ افادات و ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی — پروفیسر محمد سرور

خطبات و مکتوبات

اخبارات و رسائل

۱۔	عصرِ جدید کلکتہ	۲۱ ر نومبر ۱۹۴۵ء
۲۔	پیامِ دہلی	۱۹ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء
۳۔	انصاری دہلی	۲۵ ر جون ۱۹۴۷ء
۴۔	الجمیعتہ دہلی	۱۸ ر دسمبر ۱۹۴۹ء
۵۔	القاسم دیوبند	فروری ۱۹۱۷ء۔ / جمادی الاول ۱۳۳۵ھ
۶۔	امروز لاہور	۱۷ ر دسمبر ۱۹۵۱ء
۷۔	احسان ″	۱۴ ر ″ ۱۹۴۹ء
۸۔	تسنیم ″	۲۰ ر ″ ۱۹۴۹ء
۹۔	نقوش ″	شخصیات نمبر۔ آپ بیتی نمبر / ادب عالیہ نمبر
۱۰۔	صدق جدید لکھنؤ	۲۲ ر جنوری ۱۹۴۶ء
۱۱۔	منشور دہلی	۱۱ ر نومبر ۱۹۴۵ء
۱۲۔	نوائے وقت لاہور	۲۴ ر جنوری ۱۹۴۷ء / ۷ ر نومبر ۱۹۴۶ء / ۱۲ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء / ۲۵ ر نومبر ۱۹۶۴ء
۱۳۔	وکیل امرتسر	۹ ر دسمبر ۱۹۲۵ء
۱۴۔	ہندوستان ٹائمز	ستمبر ۱۹۴۹ء
۱۵۔	پرتاب لاہور	ستمبر ۱۹۴۹ء
۱۶۔	ملاپ ″	″
۱۷۔	پربھا ″	″
۱۸۔	زندگی ″	۱۷ ر جون ۱۹۷۳ء
۱۹۔	ماہِ نو کراچی	دسمبر ۱۹۵۴ء
۲۰۔	پیام دہلی	۱۹ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء
۲۱۔	معارف اعظم گڑھ۔	
۲۲۔	برہان۔ دہلی	
۲۳۔	مدینہ بجنور۔	
۲۴۔	ٹائمز۔ لندن	

بہارِ رفتہ —— از: منشی عبدالرحمان خان

تقریبات ہماری سماجی زندگی کی عکاس ہوتی ہیں مگر ان کے نقوش محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے وُہ رات گئی بات گئی کا مصداق بن جاتی ہیں۔ اس مرقع میں پہلی بار گزشتہ ربع صدی کی اہم صدارتی ثقافتی، اشاعتی، صحافتی، وکالتی، تجارتی، بلدیاتی، صنعتی، علاقائی تعاون، ملّی، علمی، ادبی نشری، سرائیکی، رفاہی، طبّی، تفریحی، سماجی، عروسی استقبالیہ، الوداعی تقریبات اور جشنِ موسیقی، جشنِ ملتان، جشنِ فرید، جشنِ ترقیات اور جشنِ ایران کی وُہ جھلکیاں (جو مُلتان میں منعقد ہوئیں) طلسمِ تحریر و تصویر کے ذریعہ پیش کی گئی ہیں۔

چار سو تصاویر پر مشتمل اس مرقع میں مارشلائی اثرات، انتظامیہ کی پریشانی، راہنماؤں کی خوفزدگی پولیس کے تشدّد، طلباء کی غنڈہ گردی، قانون کی بے بسی، انصاف کی کس مپرسی، جنس کی کشش آمریّت کا آغاز، موسیقی کی سرپرستی، فلمی ستاروں کی سرفرازی، اسلامی نظام سے فرار، یہودی اور رُوسی منصُوبوں کی پذیرائی، آغاخانی پیشواؤں کے قابلِ تقلید کارنامے، مشاہیر کے سوانحی خاکے، سیاسی زاویئے معاشرتی جائزے، تاریخی تبصرے، اہم انکشافات و معلومات اس خوبی سے پیش کیے گئے ہیں کہ یہ یادگار مرقع ہماری ربع صدی کی تہذیب و ثقافت کی ایک نادر اور دلچسپ تاریخ بن گیا ہے۔

یہ مرقع حاملِ نقش و نگارِ رفتہ ہے
اس گلستان میں مقید پر بہارِ رفتہ ہے

منشی عبدالرحمان خان کا آئینہ ملتان کے بعد دُوسرا تاریخی شاہکار، جو عُمدہ کتابت، ولایتی دبیز کاغذ، آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت سنہری ڈائیڈار، سیاہ پارچہ کی مضبُوط جلد بڑے سائز میں آراستہ و پیراستہ۔

سیرت اشرف —— از: منشی عبدالرحمان خان

حکیم الامّت، رئیس الخطبات، مجدد دین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں یوں تو ان کی سیرۃ پر ان کی موجودگی میں بھی ایک کتاب ضبطِ تحریر میں آچکی تھی، لیکن وُہ کتاب صرف طالبینِ خاص کے لیے اہمیّت رکھتی تھی اور عام مُسلمانوں کیلئے عرصہ دراز

سے حضرت تھانویؒ کے حالات، واقعات، کردار، قول، عمل اور فعل اندھیرے میں پوشیدہ تھے، اور جن کی زمانہ حال میں آج کے مُسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی کے لیے اشد ضرورت تھی۔

صاحبِ نظر، روشناس قلم منشی عبدالرحمان خان کی عرق ریزی کا ایک حسین نچوڑ جو طالبین اشرف علی تھانویؒ اور عام مُسلمانوں کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے دلچسپ، جامع اور ہر طرح قابلِ مطالعہ ہے۔

صاحبِ سیرت کے حالاتِ زندگی، پیش گوئیاں قبل از ولادت، بچپن، جوانی، تعلیم، کردار اور اقوال تعلیمات وغیرہ کا نادر مجموعہ جس میں صاحبِ سیرت کے کسی بھی پہلو کو تشنہ طلب نہیں چھوڑا گیا۔ عصری تقاضوں کے عین مطابق ایک اِنتہائی مستند سیرۃ۔

دو حصّوں میں دیدہ زیب کتابت و طباعت، سنہری ڈائیدار سیاہ پارچہ کی جلد بندی اور عُمدہ کاغذ سے مزیّن۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو، کسی مردِ خُدا نے تمام

نقُوشِ قائدِ اعظم

از: پروفیسر رحیم بخش شاہین

بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمّد علی جناح سے کون مُسلمان واقف نہیں۔ آپ نے اپنی انتھک کوششوں سے مُسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ نشاۃ ثانی بخشی، بلکہ انھیں الگ وطن بھی عطا کیا۔ آپ نے جس محنت، لگن اور قابلیت سے تباہ حال ملّت کی پاسبانی کے فرائض انجام دیئے، اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس کا اعتراف نہ صرف اپنوں نے بلکہ کئی دشمنانِ اسلام تک نے کیا ہے۔

آپ کی سیاسی بصیرت اور کردار و عمل نے جس طرح انگریزوں اور ہندوؤں کو بوکھلا دیا اور وُہ تقسیم ہند پر راضی ہُوئے وُہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

"نقوش قائدِ اعظم" ان حضرات کے رشحاتِ قلم پر منحصر ہے جنھوں نے حضرت قائدِ اعظمؒ کو نہ صرف دیکھا بلکہ اُن کے ساتھ کام بھی کیا ہے اور ان کی رہنمائی میں تحریکِ آزادی کی جنگ لڑی۔

حضرت قائدِ اعظم کی ذاتی، علمی، سیاسی اور قائدانہ جدّ وجُہد کی نہایت دلکش داستان۔

دیدہ زیب کتابت، بہترین طباعت، اعلیٰ کاغذ اور سنہری ڈائیدار مضبُوط جلد۔

کردارِ قائدِ اعظم (منشی عبدالرحمان خان)

معمارِ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ آپ نے جس لگن، محنت، دیانتداری اور اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دن رات پاکستان کی تعمیر میں اپنی جان قربان کر دی۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اسی "بانیِ پاکستان" کے "قول و کردار" کے متعلق حسنِ ترتیب سے جمع کردہ بے شمار بصیرت افروز ایسی معلومات جو آپکو کسی اور کتاب میں بھی نہیں ملیں گی، بلکہ اتنے حالات اس کتاب میں بھی موجود نہیں ہیں جو سرکاری طور پر دو لاکھ تینتالیس ہزار روپیہ کی لاگت کے عوض "مسٹر بولیتھو" سے لکھوائی گئی۔

بے شمار چونکا دینے والے ایسے واقعات پر مشتمل ایک حسین و لاجواب مجموعہ جو پہلی دفعہ منظرِ عام پر آرہا ہے۔ دلکش کتابت و طباعت۔ خوبصورت سنہری ڈائیڈار مضبوط جلد سے مزین ایک یادگار کتاب

جہاد کی طرف ایک قدم (سارجنٹ اقبال محمد دیوانہ)

درسِ قرآن اگر ہم نے نہ بھلایا ہوتا
یہ زمانہ نہ زمانے نے دکھلایا ہوتا

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی لاجواب کتاب ہے جس میں مسئلہ جہاد فی الکفر دوستی و دشمنی بالکفر، جہاد فی النفس و جسم، جہاد فی التمدن، کردار مجاہد، مومن کیلئے اللہ کی خوش خبری، شہدائے کرام کے درجات اور جہاد کے بارے میں مختلف دعاؤں کا ذکر و اہمیت جیسے موضوعات کو قرآن مجید اور احادیث رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بالصراحت پیش کیا گیا ہے۔

اقبال محمد دیوانہ سارجنٹ (ریٹائرڈ) پاکستان ایئر فورس کی ذہنی فکر اور علمی کاوش کا نادر نمونہ۔ اعلیٰ کتابت و طباعت سے مزین۔

احکامِ قرآنی (منشی عبدالرحمان خان)

۱۔ اخلاقِ حسنہ کسے کہتے ہیں؟
۲۔ معاشرہ کیا ہے؟ اور آج کے زمانہ میں انسان کی معاشرت کیا ہونا چاہیئے؟
۳۔ عباداتِ کسے کہتے ہیں اور ان کی ادائیگی کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

۴۔ تمدّن کسے کہتے ہیں اور باہمی لین دین کیسے ہونا چاہیئے ؟

۵۔ سیاست کِسے کہتے ہیں اور کسی ملک کا دستورِحیات کیا ہونا چاہیئے ؟

ان تمام باتوں کے جواب کے لیے منشی عبدالرحمان خانصاحب روشناسِ قلم کے بہترین علمی شہ پارے "احکامِ قرآنی" کا مطالعہ کیجیے۔

جس میں قرآن پاک کے ایسے احکام کو اختصار و خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو ہر انسان کے لیے دستورِحیات کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن پر اخلاق و آداب، معاملات، عبادات، معاشرت، سیاست، تمدّن اور انتظامِ سلطنت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اپنی نوعیت کی منفرد اور لاجواب کتاب، جو حسین گرد پوش، اعلیٰ کتابت و طباعت اور مضبوط جلد بندی سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

معمارانِ پاکستان (منشی عبدالرحمان خان)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شروع سے متحدہ ہندوستان میں مناقشات و محاربات چلے آ رہے تھے۔ کیونکہ ہندو بت پرست تھے اور مسلمان بُت شکن تھے۔ ہندو گائے کو معبود سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے اور مسلمان اُسے کاٹ کر کھا جاتے تھے۔ ہندو اچھوتوں کو انسانیت سے خارج سمجھتے تھے اور مسلمان انھیں دائرہ اسلام میں آنے کے بعد سینہ سے لگا لیتے تھے۔ آئے دن کے ان فسادات کو ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے ۱۱۹۲ء میں سلطان محمد غوری نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی جسے ہندوؤں نے تسلیم نہ کرنے کی سزا بھگتی۔ اس کے بعد ۱۷۵۷ء سے ۱۹۳۰ء تک مختلف اکابرین، علمائے ہند اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اس گاڑی کو چلاتے رہے۔ ان کے بعد مسلم لیگ نے حضرت قائدِ اعظمؒ کی زیرِ قیادت اس گاڑی کو منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ اس طرح تقریباً دو سو سال کی جدوجہد کے بعد "پاکستان" کا "تاج محل" تیار ہوا۔ اس کی تعمیر میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر حضرت قائدِاعظمؒ تک جن اکابرین نے بنیادی کام کیا اور اپنے فکر و عمل سے اس کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ ان کے نظریات اور ان کی پاکیزہ سیرت و کردار کو ایسے دل نشیں انداز میں "منشی عبدالرحمان خان صاحب" نے پیش کیا ہے کہ یہ کتاب ہمارے لیے چراغِ راہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔

خوبصورت کتابت و طباعت، مضبوط سنہری ڈایئڈار جلد سے آراستہ و پیراستہ۔

یہ تیرے مومن بندے (محمد اقبال قادری)

۱۔ حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے بقول مردِ حق کون ہے ؟
۲۔ ہادیٔ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز برحق پر کن اصحابؓ نے لبیک کہا ؟
۳۔ اسلام کی راہ کا پہلا شہید کون ہے نیز کیا شہید زندہ ہیں ؟
۴۔ خانہ کعبہ میں پہلی آذان کس نے دی ؟
۵۔ پُراسرار بندے کون ہیں۔ نشانِ مردِ مومن کیا ہے نیز شہادت کی خوشخبری کن لوگوں کو دی گئی ؟
۶۔ حُبِ رسولؐ کی حقیقت کیا ہے نیز شمعِ رسالت کے پروانے کون تھے ؟

۷۔ وہ کون بدبخت تھا، جس کے لیے قرآن پاک کی ایک سورۃ نازل ہوئی ؟
۸۔ بحرِ ظلمات میں کن لوگوں نے گھوڑے دوڑائے۔ نیز کس کے ہاتھوں اللہ کی راہ میں نو تلواریں ٹوٹیں ؟
۹۔ مجاہدین کا ضابطۂ اخلاق و حکومت کا دستورُ العمل کیا ہے ؟

اِن تمام سوالوں اور دیگر ہزارہا باتوں کی حقیقت جاننے کے لیے کتاب "یہ تیرے مومن بندے" کا مطالعہ کیجیے۔ یہ کتاب غلامانِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کا حسین مرقع ہے جنھوں نے ہادیٔ برحق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آوازِ برحق پر لبیک کہا اور ہمیشہ اپنے پیشِ نظر یہی مقصد رکھا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن کسی بھی حالت میں نہ چھوڑیں نیز اللہ اور اُس کے رسُول صلعم کے احکام کی بجاآوری میں نہ صرف اپنی تمام خواہشاتِ نفسانی کو رد کر دیا، بلکہ تلواروں کی دھار پر رقصِ بسمل کرتے ہوئے اپنی جانیں بھی قربان کر دیں اور ہر مصیبت، نقصان اور آزمائش کو دل و جان سے ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوئے خداوند حقیقی کے انعام ہمیشگی کے حقدار قرار پائے۔

چونتیس ضخیم کتب کے بے مثال نچوڑ سے بھرپور اپنی نوعیت کی ایک حسین و دل کش کتاب جو بہترین کتابت و طباعت۔ جلد بندی اور حسین ٹائیٹل سے مزین ہے۔

مسئلۂ خلقِ قرآن — مولانا ابوالکلام آزاد

- کیا قرآن ایک مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے ؟
- کیا مسئلہ تخلیقِ کائنات قرآن پر منطبق ہوتا ہے ؟
- کیا تمام مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ ایک ایمانی خطرہ کی حیثیت رکھتا تھا نیز کیا یہ مسئلہ عقل و فہم اور حق پر مبنی تھا ؟
- حقیقت جاننے کے لیے کتاب مسئلہ خلق قرآن کا مطالعہ کیجیے۔ ایک ایسے زبردست مسئلہ پر "مولانا ابوالکلام آزاد" مرحوم کا تحقیقی مقالہ، جس مسئلہ نے مامون الرشید کے عہد میں مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرہ پیدا کر دیا۔ پھر اس مسئلہ پر مامون الرشید کے دربار میں ایک حق گو انسان کا بے خوفی کے ساتھ اس مسئلہ کے حامی لوگوں کے ساتھ زبردست مناظرہ۔ ایک لاجواب کتاب

برِصغیر پاک و ہند اور بلادِ عرب کے سولہ عظیم صوفیائے کرام کے پاکیزہ حالاتِ زندگی

اولیائے اُمت

از عابد نظامی

اس کتاب میں شامل تمام مضامین نہایت تحقیق اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ ہر مضمون بے شمار کتب کے وسیع مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے۔ اندازِ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ آپ ایک بار کتاب پڑھنا شروع کریں تو اُسے ختم کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ بچے، بُوڑھے اور جوان سب یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔